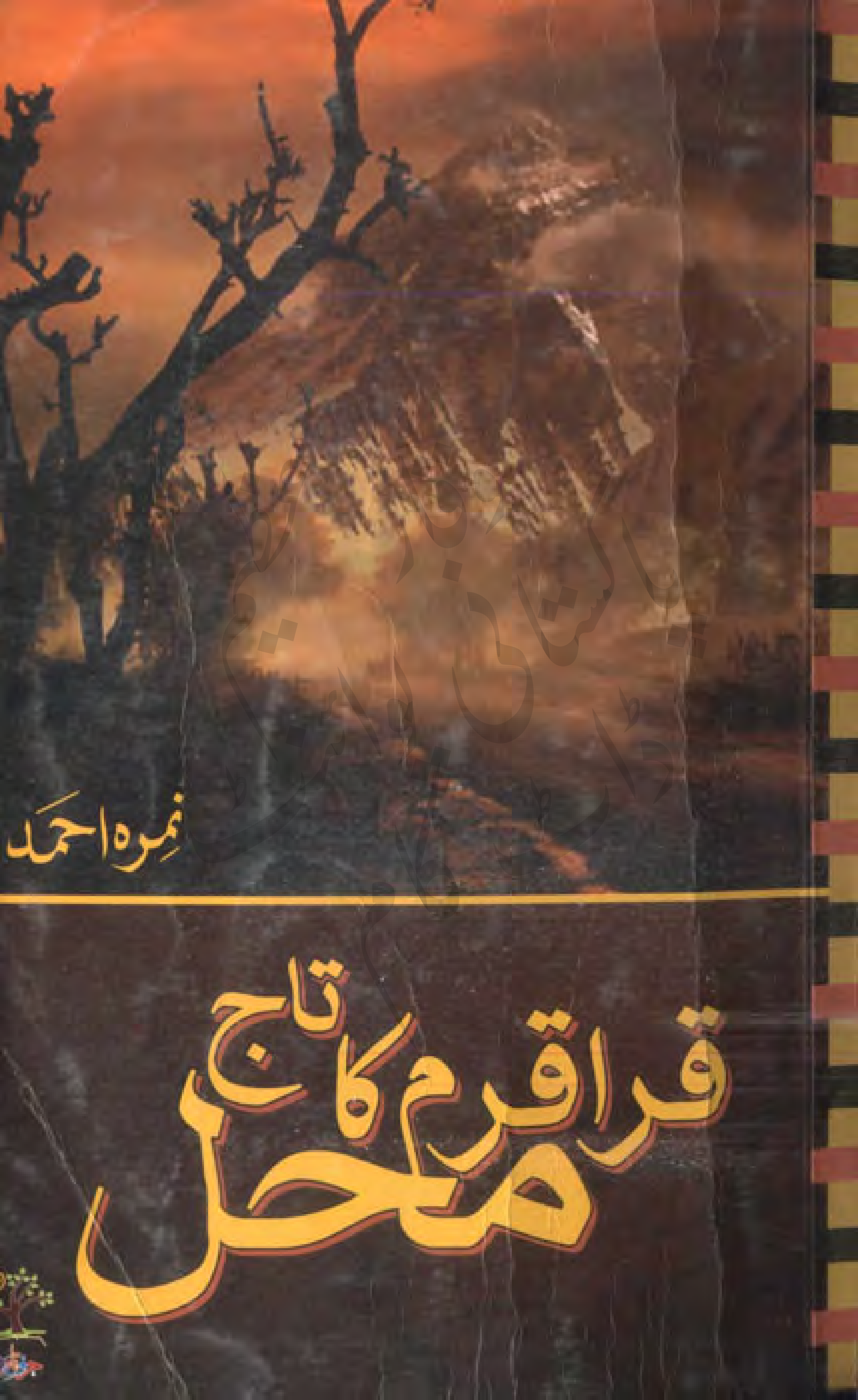
نمرہ احمد
قراقرم کا تاج محل

فہرست

پہلی چوٹی	۱۴
دوسری چوٹی	۲۷
تیسری چوٹی	۳۶
چوتھی چوٹی	۴۷
پانچویں چوٹی	۶۹
چھٹی چوٹی	۱۰۵
ساتویں چوٹی	۱۲۲
آٹھویں چوٹی	۱۴۹
نویں چوٹی	۱۶۵
دسویں چوٹی	۱۷۸
گیارھویں چوٹی	۲۲۵
بارھویں چوٹی	۲۴۰
تیرھویں چوٹی	۲۵۵
چودھویں چوٹی	۲۶۸

پیش لفظ

راکاپوشی کی چوٹی ہنزہ جانے والے سیاحوں کو ہمیشہ آگرہ کے تاج محل کی سی سفید اور حسین لگتی ہے۔ اسے بہت سے لوگ ''قراقرم کا تاج محل'' کہتے ہیں، مگر میرے نزدیک پربتوں کی یہ دیوی جس کی صدیوں پرانی باسی برف میں بہت سی داستانیں دفن ہیں، شاہ جہاں کے تاج محل سے زیادہ خوب صورت اور پرفسوں ہے.........

''قراقرم کا تاج محل'' بھی ایسی ہی ایک داستان ہے۔ رشتوں، محبتوں، خوابوں اور پہاڑوں کی داستان...... اِس میں ذکر ہے بہت سے کرداروں، بہت سی محبتوں اور بہت سی وادیوں کا...... اشو کے دریا کنارے گیت گاتی اُداس چڑیا اور سوات کی بارشوں کا...... وائٹ پیلس کی سیڑھیوں کے ساتھ نصب پنجرے میں مقید موروں کے اُس جوڑے کا جو ایک ترک سیاح کی راہ تکتا تھا...... مارگلہ کی پہاڑیوں پہ اُترے بادلوں اور راکاپوشی کے قدموں میں جمتے پگھلتے برفانی نالے کا...... یہ ہمالیہ کے عظیم پربتوں اور برف کے سمندروں کی کہانی ہے۔ یہ اُس کوہ پیما کی کہانی ہے جو دُنیا کا سب سے حسین پہاڑ سر کرنے آیا تھا۔ یہ اُس پری کی کہانی ہے جس نے عشق میں برف کا صحرا پار کیا تھا...... اور یہ اُن دوستوں کی کہانی ہے جو چوٹیوں سے لوٹ کر نہیں آتے۔

میں ادارہ ''خواتین ڈائجسٹ'' اور اپنی ایڈیٹر امت الصبور کی شکر گزار ہوں جنہوں نے مسلسل چار ماہ اسے ''شعاع'' میں جگہ دی اور اپنے قیمتی مشوروں سے میری رہنمائی کی۔ اسے لکھتے ہوئے مجھے گمان بھی نہ تھا کہ ایک روز یہ میرے ناول کی صورت میں آپ کے ہاتھوں میں ہوگا، جس کے لیے میں اپنے پبلشر کی مشکور و ممنون ہوں۔

''قراقرم کا تاج محل'' میرے تحریری سفر کی سب سے یادگار تخلیق ہے۔ اسے میں نے توماز ہومر کے ریسکیو آپریشن سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ میں اپنی اس تحریر کو ان تمام کوہ پیماؤں کے نام کرتی ہوں جو پہاڑوں میں کھو جاتے ہیں۔

دُعاؤں میں یاد رکھیے گا، جزاک اللہ خیر، السّلام علیکم۔

نمرہ احمد

ابتدا سے پہلے

ایک پبلشر کی سب سے بڑی خوبی اِس کی Intution ہے، جس کی بدولت اُسے اپنی کوشش پر مکمل اِعتماد ہونا چاہیے کہ جو کچھ وہ چھاپنے جا رہا ہے اُسے عوام میں مقبولیت کی سَند ملے گی۔ بحیثیت ایک عام قاری "قراقرم کا تاج محل" پڑھتے ہوئے یہ احساس ہمیشہ قوی رہا کہ بہت جلد یہ ناول بڑے ناولوں کی صف میں شامل ہوگا، یہاں مجھے ایک عام امریکی نوجوان ڈیوٹ ویلس یاد آ رہا ہے، جس نے اِرادہ کیا کہ ایک ماہانہ ڈائجسٹ نکالا جائے۔ اُس نے اِبتدائی تخمینے کے طور پر باپ سے تین سو ڈالر مانگے، مگر باپ نے اِنکار کر دیا تو بھائی نے کچھ رقم اُدھار دی اور جنوری 1920ء میں اُس نے نمونے کی کچھ کاپیاں چھاپیں۔ ڈائجسٹ تو چھپ گیا، لیکن مرحلہ اُس کی فروخت کا تھا کہ کس تدبیر سے اِسے عوام النّاس تک پہنچایا جائے۔ اُس نے بہت سے طباعتی اداروں کو ڈائجسٹ کی ڈمی بھیجی، لیکن بیشتر نے تعاون سے اِنکار کر دیا۔ اُن کے مطابق ڈائجسٹ اِنتہائی سنجیدہ نوعیت کا ہے، جو کہ مارکیٹ میں اپنی جگہ بنانے میں ناکام رہے گا۔ ڈیوٹ نے بالکل ہمت نہ ہاری اور اپنے قارئین تک براہِ راست پہنچنے کے لیے جتن تیز کر دیئے۔

بہت سوچنے کے بعد اُسے ایک ترکیب سُوجھی، اُس نے تمام اخبارات میں ایک اِشتہار شائع کیا، جو کہ اُس کے ڈائجسٹ کی منی بیک گارنٹی تھا:

The subscription could be cancelled and all money refunded if the reader was not satisfied.

اِس پیش کش کے نتیجے میں ڈیوٹ کے پاس خریداری کی فرمائش اور آرڈر آنا شروع ہو گئے۔ پہلے ہی مرحلے میں اُس نے اتنی رقم حاصل کر لی، جس سے دو ماہ کا شمارہ بآسانی چھاپا جا سکے۔ اُس کا منصوبہ کامیاب رہا، کسی ایک شخص نے بھی اپنی خریداری ختم نہیں کی اور نہ ہی کسی نے رقم کی واپسی کا مطالبہ کیا۔ اُس نے عام خریداروں تک پہنچنے کی کوشش تیز کر دی۔ فروری 1922ء میں اُس کا ڈائجسٹ پانچ ہزار کی تعداد میں شائع ہوا، اِس کے بعد برابر بڑھتا رہا، آج "ریڈرز ڈائجسٹ" دُنیا کا سب سے زیادہ پڑھا جانے والا ڈائجسٹ ہے۔ اُس نے اپنی ایک ترکیب سے اِس ڈائجسٹ کو کامیابی کی بُلندیوں سے آشنا کیا، مگر ایسا دوسری ترکیب کی کامیابی سے مشروط تھا، یعنی اگر ڈائجسٹ معیاری نہ ہوتا تو کیا عام قارئین اِسے پذیرائی دیتے، یہی ڈیوٹ جیسے عام آدمی کی کامیابی تھی کہ اُس نے معیار کو ملحوظِ خاطر رکھا۔ کہانی کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک بڑی کامیابی پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہر آدمی بڑی کامیابی تک پہنچ سکتا ہے۔

وہ شخص جو ماؤنٹ ایورسٹ کو فتح کرنا چاہتا ہو وہ کبھی جوتوں کی قیمت کی گنتی نہیں کرتا، ڈیوٹ ویلس کی طرح میری بھی طباعتی میدان میں یہ پہلی کوشش لیکن اِس کوشش میں معیار کو ملحوظِ خاطر رکھنے کی کوشش کے ساتھ ساتھ نئے تجربات بھی کیے ہیں، جو کہ اُمید ہے قارئین کو پسند آئیں گے۔ سیاق وسباق میں حتیٰ الامکان کوشش کی گئی ہے کہ انگریزی الفاظ کے ساتھ اُن کا ترجمہ دیا جائے، تا کہ اُردو کا قاری انگریزی الفاظ کی بھرمار سے بور نہ ہو جائے اور اُکتا کر ناول ایک طرف نہ رکھ دے۔

نمرہ کی اگلی کاوشیں بہت جلد "حرفِ تازہ پبلشرز" کے ذریعے آپ کے ہاتھوں میں ہوں گی۔

اِس ناول کی تکمیل میں، میں بہت سے لوگوں کا شکر گزار ہوں، جن کا ذکر نہ کرنا ناانصافی ہوگی، جن میں نجمان کا ذکر کروں گا، جس نے ناول کی پروف ریڈنگ پر بہت محنت کی۔ ناول کے خوب صورت ٹائٹل کے لیے میں ڈیزائنر کا شکر گزار ہوں۔ اِنر ٹائٹل کی تصویر، جس کے ذریعے اِس ناول کی تھیم "سفر" کی بہت خوب صورت عکاسی ہوتی ہے، کے لیے میں شکر گزار ہوں، محترم عبدالرزاق ونسی اور مزمل حسین کا، جن کی اِس خوب صورت مشترکہ محنت کی داد دینا بہت ضروری ہے۔ میں اپنی اِس پہلی کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوں، آپ سب کی آراء کا شدّت سے اِنتظار رہے گا اور خاص طور پر ایک نام میرے کمپوزر ذوالفقار کا ہے، جس کی محنت کا میں تہِ دِل سے شکر گزار ہوں۔

دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔

پبلشر

نوائے وقت، منگل، 16 اگست 2005ء

''راکاپوشی پر گلیشیئر پھٹنے سے کوہ پیما لڑکی گر کر ہلاک۔''

ہنزہ (اے ایف پی)، راکاپوشی سر کرنے والی ٹیم کی ایک لڑکی گلیشیئر پھٹنے سے کئی فٹ گہرے شگاف میں گر کر ہلاک ہوگئی۔ غیر ملکی خبر رساں ایجنسی کے مطابق گزشتہ روز صبح تین سے چار بجے کے درمیان پاک ترک برٹش ایکسپیڈیشن کی ایک کوہ پیما، چڑھائی کے دوران برف پھٹنے سے ظاہر ہونے والی پہاڑوں کی درز (crevasse) میں گر گئی۔ ایکسپیڈیشن ٹیم نے لڑکی کی فوری ہلاکت کی تصدیق کر دی ہے۔ مزید تفصیلات معلوم نہیں ہوسکیں۔

☆......☆......☆

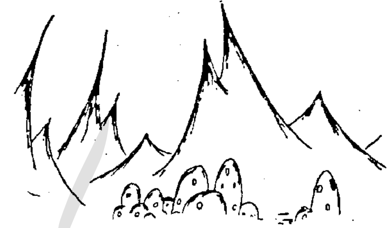

پہلی چوٹی

بدھ، 20 جولائی 2005ء ......ایک ماہ قبل......

سفید گیٹ عبور کر کے اس نے چند لمحے رک کر ارد گرد کا جائزہ لیا۔ گیٹ سے آگے سفید پتھروں سے بنا خوب صورت اور طویل ڈرائیو وے تھا اور دائیں طرف کھلا سا لان، جس کے دہانے پر بنے جدید طرز کے برآمدے میں بچھی چار کرسیوں میں سے ایک پر نشاء بیٹھی تھی۔ اس کے ہاتھ میں صبح کا اخبار تھا، جو وہ عادتاً شام کے وقت ہی پڑھا کرتی تھی۔

نشاء کو سامنے پا کر وہ تیز تیز قدموں سے چلتی ڈرائیو وے عبور کر کے برآمدے تک آئی۔ اس سے پہلے کہ نشاء اس کے استقبال کے لیے اٹھتی، وہ ایک ہاتھ کمر پر رکھے، ناک اور ابرو چڑھا کر پوچھنے لگی، ''یہ لڑکا کون تھا؟''

''کون سا لڑکا؟'' اس نے اخبار تہ کر کے میز پر رکھ دیا، اس کے لہجے میں حیرت تھی۔

''وہی جو باہر کھڑا تھا۔''

''باہر کھڑا تھا؟'' نشاء حیران سی کھڑی ہو گئی۔ ایک نظر اس نے پریشے کے چہرے کے بگڑے زاویے اور کھڑے ہونے کا تھانے دارانہ انداز دیکھا۔ ''کس کی بات کر رہی ہو؟''

''وہی جو باہر حسیب کے ساتھ کھڑا تھا۔''

''اوہ! وہ؟ وہ حسیب کا دوست ہے، ملنے آیا تھا اور اب تو واپس جا رہا تھا۔ کیوں، خیریت؟''

''خیریت؟ مجھے دیکھ کر اس بدتمیز لڑکے نے سیٹی بجائی، شرم تو آتی نہیں ہے آج کل کے لڑکوں کو۔ آنے دو حسیب کو، ابھی پوچھتی ہوں کہ کس قسم کے واہیات لوگوں سے دوستی ہے اس کی۔''

''کم آن، پری!'' نشاء نے واپس کرسی پر بیٹھتے ہوئے اپنی مسکراہٹ دبائی اور ایک نظر اُسے دیکھا۔

سادہ گلابی شلوار قمیص میں ملبوس، اپنے سیدھے اور بے حد سیاہ بالوں کو اونچی پونی ٹیل میں مقید کیے، پاؤں میں سفید اور ہلکے گلابی رنگ کے جوگرز پہنے وہ بہت خفگی سے نشاء کو دیکھ رہی تھی۔

''بھئی سیٹی بجا دی تو کیا ہوا، بچہ ہے۔''

''ہاں، چھ فٹ کا بچہ ہے؟''

''بھئی حسیب کا کلاس فیلو ہے، یعنی ہو گا کوئی سترہ اٹھارہ سال کا، مطلب عمر میں ہم سے کم از کم بھی آٹھ سال چھوٹا، تو بچہ ہی ہوا نا!'' وہ اپنی کزن کی بہ نسبت ہمیشہ زیادہ لاپرواہ رہی تھی۔ ''اور یہ تمہارے ہاتھ میں کیا ہے؟''

''لو، مری کیوں جا رہی ہو؟ تمہارے لیے ہی ہے، بیف چلی بنایا تھا، سوچا کچھ تمہیں بھی دے آؤں۔'' اس نے ڈونگا نشاء کو تھمایا تھا، اس کا موڈ سخت خراب تھا۔

''واؤ، ممی کو بیف چلی بہت پسند ہے۔'' نشاء کا اس کے موڈ کو خاطر میں لانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔

''ہاں تو ممانی کے لیے ہی لائی ہوں، کون سا تمہارے لیے بنایا ہے؟''

''نشاء آپی! دراصل پری آپا ہمیں بیمار کر کے اپنی ڈاکٹری چمکانا چاہتی ہیں۔'' اپنے دوست کو رخصت کر کے حسیب بھی ادھر آ گیا تھا۔

''تمہارے لیے نہیں ہے، منہ دھو رکھو۔''

''شیروں کے منہ دھلے ہوئے ہوتے ہیں آپا!''

''ہاں، یاد آیا۔ تمہیں تو ماموں اور ممانی چڑیا گھر سے لائے تھے نا؟''

''کم آن!'' وہ ہنسنے لگا۔ ''ویسے ابھی کس لوفر لفنگے کی بات ہو رہی تھی؟''

''وہی جس کے ساتھ تم باہر گیٹ پر کھڑے قہقہے لگا رہے تھے۔ وہ بدتمیز لڑکا مجھے دیکھ کر سیٹی رہا تھا۔ کیسے لڑکوں سے دوستی ہے تمہاری؟''

''ارے وہ، وہ میرا دوست ہے، بڑے باپ کا بیٹا ہے اور وہ آپ کو دیکھ کر سیٹی نہیں بجا رہا وہ تو بس اس کی عادت ہے۔ نیور مائنڈ، وہ تھوڑا سا سپائلڈ چائلڈ ہے۔'' اپنے دوست کا دفا کرنے کے ساتھ ساتھ حسیب جھک کر میز پر پڑے ڈونگے میں سے بیف کے چٹ پٹے فنگر لئر اُٹھا اُٹھا کر کھا رہا تھا۔ ''اور سنبھل کر آپا، اس کا باپ صدرِ پاکستان کا دوست ہے۔''

جواب میں پریشے بڑبڑا کر رہ گئی۔ پھر جانے کے لیے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''کدھر جا رہی ہو؟ ممی کو سلام تو کر لو!''

''پچاس گز کے فاصلے پر میرا گھر ہے۔ پھر آ جاؤں گی، ابھی تو مجھے جانا ہے۔''

''بھئی بریکنگ نیوز تو سنتی جاؤ، حسیب اور اس کے چار دوست راکاپوشی بیس کیمپ کا ٹریک کر رہے ہیں۔''

''تو کرتے رہیں۔'' اپنے تئیں نشاء نے پریشے کو چونکا دینے والی خبر سنائی تھی مگر اس نے لاپروائی سے کندھے اچکا دیے۔

''پری آپا! یہ ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی ہیں کہ یہ جیلس نہیں ہو رہیں۔'' حسیب اس کا انداز دیکھ کر شرارت سے مسکرایا۔

''میں ہو بھی نہیں رہی۔'' وہ کھٹ سے کہہ کر گیٹ کی طرف تیز قدموں سے بڑھ گئی۔

''سنو تو! تمہارے کپڑے آئے پڑے ہیں ٹیلر سے، وہ تو لیتی جاؤ'' نشاء بھاگتی ہوئی اس کے پیچھے آئی تھی۔

''تم رات کو دے جانا۔ ابھی میں جلدی میں ہوں۔'' وہ گیٹ کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے ایک لمحے کو مڑی تھی۔

''کیوں؟ کیا جلدی ہے؟''

''وہ.....'' گیٹ پر رکھا اس کا ہاتھ یک دم ڈھیلا پڑ گیا، قدرے ہچکچائی۔ ''وہ......ابھی پھپھو اور ندا آپا آئی ہوئی ہیں نا!''

اب کی بار نشاء کا موڈ خراب ہوا تھا۔ ''کیا مطلب؟ ان کو اپنے گھر چین نہیں ہے؟ ہر دوسری شام تو وہ تمہاری طرف ہوتی ہیں اور وہ ندا آپا کے شیطان بچے، اتنا شیطان بھی کوئی ہوگا؟ جاؤ، جلدی گھر جاؤ، وہ درجن بھر چیزیں تو توڑ چکے ہوں گے۔''

تھوڑی دیر پہلے کے تاثرات پریشے کے چہرے سے غائب ہو چکے تھے، وہ بے بسی سے لب چبا کر رہ گئی۔

''ویسے رات کا کھانا بھی یقیناً وہ تمہاری طرف ہی کھائیں گی نا؟ سیف بھائی بھی رات کو ہی آئیں گے اور یقیناً کھانا کھا کر ہی جائیں گے۔ حد ہوتی ہے روز روز کسی کے گھر کھانے کی، لیکن پھپھو......اور معذرت کے ساتھ، سیف بھائی کی وہی مثال ہے کہ نیت سیر نہ ہو تو......''

''چلو کچھ نہیں ہوتا۔ پاپا کی اکلوتی بہن ہیں، ان کے آنے سے پاپا ہی خوش ہو جاتے ہیں۔''

''مجھے تمہاری سمجھ نہیں آتی ڈاکٹر پریشے جہانزیب! تم اتنی کمزور اور جذباتی قسم کی دلیلیں کیوں دیتی ہو؟ اتنی اچھی طرح جانتی ہو سیف بھائی کو، پھر بھی تم نے ان سے منگنی سے انکار نہیں کیا؟''

سیف سے منگنی کے ان تین برسوں میں نشاء نے کوئی تین ہزار دفعہ یہ بات کہی تھی۔

''یہ پاپا کی خواہش تھی نشاء! اب اس بات کو بار بار دہرانے سے کیا حاصل؟ اور پھر میں انکار کس کے لیے کرتی؟''

جواباً نشاء چپ رہی تو وہ گیٹ کھول کر باہر نکل آئی۔

''اُس کے لیے کر دیتی انکار!'' پیچھے سے بہت آہستہ سے نشاء نے کہا تھا۔ اس کے قدم ایک لمحے کو زنجیر ہوئے تھے۔

''تمہیں وہ احمقانہ بات ابھی تک یاد ہے نشاء؟'' وہ اداسی سے مسکرائی اور سر جھٹکتے ہوئے اپنے بنگلے کے گیٹ کی جانب بڑھ گئی۔

وہ لاؤنج میں داخل ہوئی تو پھپھو اور ندا آپا ایک ہی صوفے پر بیٹھی، سر جوڑے سرگوشی کے انداز میں کوئی بات کر رہی تھیں۔ اسے دیکھ کر فوراً سیدھی ہوگئیں۔

''تم کدھر گئی تھیں؟'' ندا آپا اور پھپھو نے اسے جاتے نہیں دیکھا تھا، کیوں کہ وہ کچن کے پچھلے دروازے سے باہر گئی تھی۔

''وہ نشاء کی طرف گئی تھی۔ اس کے کچھ برتن رہتے تھے۔'' اس نے یہ بتانے سے گریز کیا، برتنوں میں بیف چلی بھی تھا۔

''سنو پری! یہ زیادہ میل جول نہ رکھا کرو ان لوگوں سے۔ برا مت ماننا مگر تمہارے ماموں کی لڑکی بڑی چلتر ہے، ماں بھی ایسی ہی ہے اس کی۔ دیکھنے میں ان سے معصوم کوئی نہیں لگتا اور اندر سے پوری ہیں یہ۔''

''اور وہ نشاء تو جب بھی ملاقات ہو، سیدھے منہ بات ہی نہیں کرتی۔''

نشاء اور ممانی جان کے بارے میں وہ اس قسم کی گفتگو کبھی نہ سنتی، اگر وہ اس کے سسرال والے نہ ہوتے۔

''جی، میں ذرا چائے لے آؤں۔'' وہ آہستگی سے کہہ کر کچن میں چلی آئی۔ وحید ٹرالی سیٹ کر رہا تھا، وہ ٹرالی کو دیکھتی رہی۔ اس کے ذہن میں خیالات کا ہجوم تھا۔

وہ جانتی تھی، پھپھو نشاء اور اس کے ماموں، ممانی کے متعلق ایسی باتیں کیوں کرتی تھیں، انہیں ڈر تھا کہ کہیں ماموں اور ممانی، جہاں زیب صاحب پر دباؤ ڈال کر سیف اور پریشے کی منگنی ختم نہ کر دیں۔ پریشے کے خیال میں یہ ناممکن تھا، کیوں کہ اوّل تو ماموں اور ممانی اس کے کسی معاملے میں داخل نہیں دیتے تھے اور اگر دیتے بھی تو صرف اور صرف پریشے کے کہنے پر، اس کی مرضی کے خلاف وہ کبھی بھی جہاں زیب صاحب سے کوئی بات نہ کرتے اور اس معاملے میں بولنے کا حق اگر اس نے ماموں ممانی کو دینا ہوتا تو تین برس پہلے ہی دے چکی ہوتی۔

پھپھو کو نشاء لوگوں سے دوسرا خوف یہ تھا کہ کہیں نشاء پریشے کو ان کے خلاف بھڑکا نہ دے کیوں کہ نشاء اور ممانی خاصی صاف گو واقع ہوئی تھیں۔ بقول پھپھو کے منہ بھٹ، بدلحاظ اور بدتمیز حالاں کہ پریشے کا خیال تھا کہ جتنی سویٹ اور کیئرنگ ممانی تھیں اور جس طرح اس کی مما کی وفات کے بعد انہوں نے اس کا خیال رکھا تھا، کوئی سگی خالہ بھی نہ رکھ سکتی۔

''باجی! یہ لے جائیں۔'' وحید کی شرمیلی سی آواز اس کو خیالات کے بھنور سے باہر نکال لائی، اس نے قدرے چونک کر اسے دیکھا اور پھر سر جھٹک کر ٹرالی تھام لی۔

''اے ہے پری بیٹا! یہ کیا لڑکوں کی طرح جوگرز پہنے پھرتی ہو؟ کوئی سینڈل، یا ہیل والی جوتی پہنا کرو۔'' چائے کے ساتھ موجود دیگر لوازمات اپنی پلیٹ میں بھرتے ہوئے پھپھو نے ہر بار کی طرح اس کے جوگرز پر اعتراض کیا۔

''اور کیا۔ وہ پرپل والی سینڈل ہی پہن لیتیں، جو تمہیں سیف بھائی نے لے کر دی تھی۔'' ندا آپا اپنے بچوں کو کیک کھلاتے ہوئے بولیں۔ وہ انہیں کیا بتاتی کہ سیف کی پسند اس سے بہت مختلف تھی۔ وہ شوخ رنگ اور ظاہری چمک دمک کو دیکھتا تھا۔ جب کہ وہ سوفٹ کلرز اور کوالٹی کو ترجیح دیتی تھی۔

''جی بہتر۔'' وہ سر جھکاتے ہوئے ان کے سامنے بیٹھ گئی۔ اسے علم تھا کہ وہ دونوں جب تک بیٹھی رہیں گی، ان کے اعتراضات ختم نہیں ہوں گے۔

آٹھ بجے تک جہاں زیب صاحب بھی آ گئے۔ وہ ہمیشہ کی طرح ان لوگوں کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے، روشان اور سنی کو خوب پیار کیا کہ ان کی زندگی میں ساری رونق ان ہی لوگوں سے تھی۔ ان کے سامنے ان کی ٹون بدل جایا کرتی تھی۔

''پری! وحید کو کہہ کر اچھا سا کھانا بنوانا۔ کڑاہی، بریانی کچھ اور بھی ایڈ کر لینا۔'' انہوں نے آہستہ سے پریشے کو ہدایت دی۔ اس کا دل چاہا کہ کہہ دے، ''پاپا! یہ لوگ روز تو یہاں کھانا کھاتے ہیں، پھر ہر روز کا اہتمام کیوں؟''

مگر وہ جانتی تھی، پاپا ان لوگوں کو کتنا عزیز رکھتے ہیں سو وہ انہیں باتیں کرتا چھوڑ کر خود کچن میں آ گئی۔

پھپھو کی فیملی ہر دوسری شام یہیں ہوتی تھی اور اسے کبھی بھی اتنی کوفت نہیں ہوئی تھی جتنی آج ہو رہی تھی۔ شاید اس لیے کہ آج نشاء نے اسے برسوں پرانی ایک بھولی بسری بات یاد دلا دی تھی۔

پرانی یادیں...... ٹوٹے خواب، بکھرے سپنے ہر انسان کو تھکا دیتے ہیں، اس پر بھی عجیب سی تھکن اور بیزاری طاری ہو رہی تھی۔

''ماما! میں یہ کھا لوں؟'' نو سالہ روشان نے فریج کا دروازہ کھول کر پی نٹ بٹر کا جار نکال کر دور سے ماں کو آواز دی۔

''ہاں کھا لو بیٹا! تمہارے نانا کا گھر ہے۔'' ندا آپا نے لاپروائی سے کہا اور وہ جس نے ملائیشین چکن بنانے کے لیے اتنا بڑا جار منگوایا تھا، بے بسی سے مٹھیاں بھینچ کر رہ گئی۔ وہ روشان اور

سنی کو ٹوک بھی نہیں سکتی تھی۔

سنی پورے گھر میں دوڑتا پھر رہا تھا۔ اسے کوفت ہو رہی تھی مگر وہ خاموش رہی۔ پھر چند منٹ بعد جب وہ چاولوں کو دم دے رہی تھی، اسے بلی کی وحشیانہ میاؤں میاؤں کی آواز آئی۔

''یا اللہ!'' اس نے گھبرا کر کفگیر میز پر رکھا اور بھاگتی ہوئی کچن سے باہر نکلی، باہر زمین پر اس کی پالتو بلی کو روشان نے پکڑ رکھا تھا جب کہ سنی اس کی دم کو ماچس کی تیلی سے آگ لگا رہا تھا۔ بلی تڑپتی ہوئی چیخ رہی تھی۔

''ہٹو تم دونوں۔'' اس نے زور سے سنی کے ماچس والے ہاتھ پر تھپڑ مارا، بلی کو روشان سے کھینچا اور ماچس کی ڈبی اٹھا کر اپنے قبضے میں کر لی۔ ''یہ کیا کر رہے تھے تم لوگ؟''

''آپ کو کیا مسئلہ ہے، جو بھی کر رہے تھے، ہماری مرضی۔ ہمارے نانا کا گھر ہے۔ آپ کون ہوتی ہیں پوچھنے والی؟'' سنی کو تھپڑ لگا تھا، جس کا جواب اس نے بے حد بدتمیزی سے دیا تھا۔

پورے دن کی کوفت، بے زاری، نشاء کی آخری بات، پھپھو اور ندا آپا کے طنز اور طعنے، ان دونوں کی بدتمیزیاں اس نے سب کچھ برداشت کر لیا تھا مگر سنی کی بدتمیزی پر اس کی برداشت جواب دے گئی تھی۔ اس نے رکھ کر دو تھپڑ سنی اور دو روشان کو لگائے۔

''دفع ہو جاؤ اِدھر سے تم دونوں۔'' درد سے چلاّتی روتی بلی کو اپنی آغوش میں سہلاتے ہوئے اس نے غصّے سے کہا اور واپس کچن میں آ گئی۔

وہ دونوں حلق پھاڑ کر روتے ہوئے ندا آپا کے پاس چلے گئے۔ عین اسی وقت سیف بھی آ گیا۔ وہ آفس سے سیدھا اِدھر ہی آیا تھا اور اس کا کوٹ اس کے ہاتھ میں تھا۔ گھر اس لیے نہیں گیا تھا کہ اسے علم تھا، گھر میں کھانا نہیں بنا ہوگا۔

''کیا ہوا ہے؟ کس نے مارا ہے؟'' ندا آپا نے ان دونوں کو روتے دیکھ کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ وہ تمام ڈرامے کی آوازیں کچن میں بہ خوبی سن سکتی تھی۔ اس کی کوفت میں اضافہ ہو رہا تھا۔

''پری آپا نے مارا ہے۔ بال بھی کھینچے ہیں اور منہ پر تھپڑ بھی مارا ہے۔'' روشان چلاتے ہوئے بتا رہا تھا۔ وہ تیزی سے کچن سے نکلی، بلی اس کی آغوش سے چھلانگ لگا کر کودی اور بھاگتی ہوئی کچن سے باہر چلی گئی۔ وہ انسانوں سے بہت ڈر گئی تھی۔

''ہائے اللہ، پری! تم نے میرے معصوم بچوں کو کیوں پیٹ ڈالا؟ ماموں! میں نے تو کبھی ان

کو زور سے جھڑکا تک نہیں ہے۔'' ندا آپا اس کو دیکھتے ہی اونچی آواز میں رونے لگیں۔ ''ہائے میرے معصوم بچے!''

''یہ دونوں اس بلی کو آگ لگا کر مار رہے تھے۔ میں نے روکا تو سنی نے مجھ سے بدتمیزی کی، میں نے صرف تھپڑ مارا تھا، بال نہیں نوچے تھے۔'' کسی مجرم کی طرح کھڑی وہ صفائیاں دے رہی تھی۔

''لو، اتنے چھوٹے بچے بلی کو آگ لگا سکتے ہیں؟ انہیں تو ماچس بھی جلانا نہیں آتی۔'' پھپھو چمک کر بولی تھیں۔

''میں جھوٹ نہیں بول رہی پھپھو! یہ دونوں اس بلی کو اذیت دے رہے تھے۔''

''تمہیں اپنے بھانجوں سے زیادہ کسی جانور سے پیار ہے؟ یہ بچے ہیں، کچھ کر بھی دیا تو آرام سے بھی ٹوکا جا سکتا ہے پری!'' اب کے سیف بولا تھا۔ سیف اس کی حمایت تو کیا کرتا اس نے تو اس کا یقین تک نہیں کیا تھا کہ اس نے روشان اور سنی کے بال نہیں نوچے تھے۔

''اچھا پری! اب سوری کر لو ان دونوں سے۔''

یہ پاپا تھے، اس نے بے حد شاکی نظروں سے انہیں دیکھا۔ کسی کو بھی اس کی بات کا یقین نہ تھا۔

''پاپا! میں بڑی ہوں، میں نے کچھ کہہ بھی دیا تو آپ سب لوگ اس طرح کیوں ری ایکٹ کر رہے ہیں؟''

''پری! تم بچوں اور ندا آپا سے سوری کرو۔ دیکھو، آپا ابھی تک رو رہی ہیں۔'' سیف نے بہت سنجیدگی اور خفگی سے اسے مخاطب کیا۔

اس کا دل چاہا وہ وہیں زمین پر بیٹھ کر رونا شروع کر دے مگر اسے ضبط کرنا تھا، خود کو کمزور ثابت نہیں کرنا تھا۔ ''میری کوئی غلطی نہیں، پھر بھی ندا آپا سوری!''

ندا آپا نے منہ پھیر لیا، یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ ابھی تک خفا تھیں۔

''میں کھانا لگواتی ہوں۔'' وہ کہہ کر وہاں سے چلی آئی، وحید کو کھانا لگانے کا کہا اور خود کچن میں بیٹھی رہی۔ جب تک وہ لوگ چلے نہ گئے، وہ باہر نہیں نکلی۔ اسے اپنے بے عزتی پر شکوہ ان لوگوں سے نہیں، پاپا سے تھا۔ پتا نہیں پھپھو نے پاپا کو کیا گھول کر پلا دیا تھا کہ وہ کبھی ان کے خلاف کچھ سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔

''کیا میں اپنی پوری زندگی ان لوگوں کے درمیان گزار سکتی ہوں؟ اف...... یہ کتنا کٹھن ہو

گا!'' یہ تکلیف دہ خیال اس کے ذہن میں چکرا رہا تھا۔

''کدھر گم ہو؟'' نشاء نے کچن کے دروازے میں سے سر نکال کر جھانکا تو وہ چونکی، پھر زبردستی مسکرادی۔ ''میں تو یہیں ہوں۔ تم کہو، میرے کپڑے لے آئی ہو؟''

''ہاں، تمہارے کمرے میں رکھ دیئے ہیں۔ مہمان چلے گئے تمہارے؟'' اس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ پریشے کھڑی ہوگئی۔

''ہاں چلے گئے، آؤ باہر بیٹھتے ہیں۔'' نشاء کو دیکھ کر اس کا ڈپریشن قدرے کم ہوا تھا۔ وہ دونوں ان کپڑوں کے متعلق باتیں کرتی لاؤنج میں آئیں تو جہاں زیب صاحب کو وہیں بیٹھے پایا۔

''انکل! امی کہہ رہی تھیں کہ سیف بھائی کی امی شادی کی ڈیٹ فکس کرنے آنے والی ہیں، وہ کب تک آئیں گی؟'' نشاء کی ان سے بہت بے تکلفی تھی اور وہ تھی بھی بہت بولڈ...... ہر بات بلاجھجک پوچھ لیا کرتی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ آج پھپھو اسی لیے آئی تھیں، پھر بھی اس نے پوچھا۔ پریشے کے لبوں پر مسکراہٹ بکھر گئی۔

''بیٹا! ڈیٹ تو تقریباً فکس ہوگئی ہے۔ عید نومبر کے پہلے ہفتے میں آرہی ہے تو ہم یہ سوچ رہے تھے کہ عید کے تیسرے دن مہندی رکھ لیں گے۔'' وہ خوش دلی سے بتا رہے تھے۔ اس کو اپنی گردن کے گرد پھندا تنگ ہوتا محسوس ہو رہا تھا، ایک دم کمرے میں گھٹن اتنی بڑھ گئی کہ اس کا سانس رُکنے لگا۔

''نشاء!'' اچانک اسے کچھ یاد آیا۔ ''حسیب اور اس کے دوست ہنزہ جا رہے ہیں نا؟ تم نے آج کچھ بتایا تھا؟''

''ہاں وہ راکاپوشی بیس کیمپ کا ٹریک کر رہے ہیں۔''

''کون کہاں جا رہا ہے؟'' ان کی سرگوشیاں وہ ٹھیک سے سن نہیں سکے تھے۔

''پاپا! وہ...... نشاء کے ایک کزن کی اپنی ٹور کمپنی ہے مری میں، نشاء نے ان سے نادرن ایریا کے ٹورز کا پتا کیا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ جلد ہی ان کا کوئی ٹور جائے گا نادرن ایریاز تو پاپا! میں نشاء کے ساتھ چلی جاؤں؟ بس تین چار دن کے لیے؟''

''مگر ندا تو ہفتہ بھر کے لیے میکے تمہاری وجہ سے آئی ہے۔ اس کی نند کا کوئی مسئلہ تھا تو اس کی ساس اور شوہر چند دنوں کے لیے سیالکوٹ گئے ہیں۔ وہ اگلا پورا ہفتہ ادھر آگئی کہ تمہارے ساتھ مل کر شادی کی شاپنگ کر لے گی۔''

وہ سوچ رہی تھی کہ چند دنوں تک کسی دُور دراز پرفضا مقام پر چلی جائے، مگر جیسے ہی پاپا نے ندا آپا کی ایک ہفتے کی چھٹی کا بتایا، اس نے پکا ارادہ کر لیا کہ وہ جلد ہی اسلام آباد سے پورے ہفتے کے لیے غائب ہو جائے گی۔ وہ کسی کے ساتھ بھی شاپنگ کر سکتی تھی، مگر ندا آپا کے ساتھ نہیں۔

''پاپا!...... ندا آپا کی چوائس بہت اچھی ہے، وہ خود ہی شاپنگ کر لیں گی۔ میں بس پانچ چھے روز میں واپس آجاؤں گی۔'' اس نے بہت منت اور لجاجت سے کہا۔

''آ...... اچھا مگر کس جگہ جانا چاہتی ہو تم؟'' وہ نیم رضامند تھے۔ وہ جواباً کہنا چاہتی تھی کہ ہنزہ، گلگت، اسکردو، مگر اسے معلوم تھا کہ ان علاقوں کا نام سن کر پاپا سختی سے انکار کریں گے۔

''پشاور، سوات، کالام...... اسی سائیڈ پر جائیں گے۔'' اس نے سوات کا ذکر اس لیے کیا کہ وہاں کوئی ڈھائی ہزار فٹ بلند پہاڑ نہ تھا اور یہ سب سے بڑی وجہ تھی کہ پاپا نے اگلے ہی لمحے اسے اجازت دے دی۔

اس نے بے اختیار ایک چور نگاہ اپنے بائیں کندھے پر ڈالی۔ صرف اس کندھے کی وجہ سے وہ سکردو سائیڈ پر ہمالیہ اور قراقرم کے پہاڑوں پر نہیں جا سکتی تھی۔

جہاں زیب صاحب اٹھ کر اندر چلے گئے تو نشاء تیزی سے اس کی طرف مڑی، ''میں نے کب پتہ کیا تھا زوار بھائی کی ٹور کمپنی سے؟''

''نہیں کیا تو اب کر لینا۔'' اس نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔ ندا آپا کی مع فیملی آمد کے باعث چند لمحے پہلے تک اس کے سر میں جو درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں، وہ اب غائب ہو چکی تھیں۔

''تم اسلام آباد کی کسی ٹور کمپنی کا نام نہیں لے سکتی تھیں؟ اب خوامخواہ جھوٹ کو سچ ثابت کرنے مری جانا پڑے گا اور اگر تمہیں اتنا ہی شوق ہو رہا ہے سیر سپاٹے کا، تو حسیب اور اس کے فرینڈز کے ساتھ راکاپوشی چلے جاتے ہیں۔''

''جس کی اجازت پاپا مجھے کبھی نہیں دیں گے اور حسیب کے دوست؟'' اس کی نگاہوں کے سامنے شام والا وہ لڑکا آ گیا جس نے اسے دیکھ کر بے اختیار سیٹی بجائی تھی۔ اس نے تنفر سے سر جھٹکا۔ ''میں حسیب کے دوستوں کا سر پھاڑ سکتی ہوں، ان کے ساتھ چار دن پیدل راکاپوشی کا ٹریک نہیں کر سکتی۔'' اس کو وہ لڑکا بہت ہی برا لگا تھا، نشاء خاموش ہوگئی۔

نشاء کے جانے کے بعد وہ اپنے کمرے میں آگئی۔ اس کے کمرے کی ترتیب ایسی تھی کہ

دروازہ کھلتے ہی سامنے پلنگ نظر آتا تھا، جس کے سرہانے دیوار پر "ٹوماز ہیومر" کا بہت بڑا چسپاں تھا۔ کمرے کی باقی تین دیواروں میں سے دو پر "میسز" اور چند جاپانی کوہ پیماؤں کے آویزاں تھے۔ ان تصویروں کو دیکھتے ہی ایک اداس مسکان نے اس کے لبوں کا احاطہ کرلیا۔

☆......☆......☆

"پریشے جہاں زیب، جس کے نام کا آخری حصہ "شے" ہٹا کر سب اسے "پری" کہا کر تے تھے، بچپن سے ہی ایک آئیڈیلسٹ تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی، جن کے لیے کچھ بھی ناممکن ہوتا، جنہیں چیلنجز کا سامنا کرنے میں مزا آتا ہے۔ سیف سے منگنی سے پہلے تک وہ واقعی پرجوش تھی، مگر ان گزرے چار برسوں میں بہت کچھ بدلا تھا۔

اس کو بچپن سے پہاڑ سر کرنے کا بہت شوق تھا۔ وہ اپنے پاپا اور مما کی اکلوتی اولاد ہونے باعث خاصی لاڈلی تھی۔ ان کے لاڈ پیار نے اس کو بگاڑا نہیں بلکہ بہت بہادر، مضبوط اور پراع دیا تھا۔ اس کو مما کو اس کا کوہ پیمائی کا شوق بہت عزیز تھا اور یہ سب سے بڑی وجہ تھی، جس باعث مما اس کو 1995ء میں اپنے ساتھ انگلینڈ لے گئی تھیں۔ پاپا نے اس کی وجہ سے اپنے بھی اُدھر ہی منتقل کردیا تھا مگر وہ لندن میں ہوتے تھے اور مما اور پریشے لیک ڈسٹرکٹ میں۔

وہ چار برس لیک ڈسٹرکٹ میں رہی، وہاں اس نے بہت کچھ سیکھا۔ اِس دوران وہ صرف دفعہ پاکستان آئی تھی، وہ بھی سردیوں کی چھٹیوں میں گرمیوں کی چھٹیاں وہ کہاں گزارتی تھی، یہ کا ایک ٹین ایج سیکرٹ تھا، جس کی بھنک اگر پاپا کو پڑ جاتی تو وہ بہت خفا ہوتے (البتہ مما وا تھیں)۔ دونوں بار اسے اپنے سے آٹھ نو سال بڑا سیف الملوک بہت برا لگا تھا۔ وہ اس کے سے بہت لاڈ اٹھواتا تھا اور اس کو بڑی عجیب نگاہوں سے تکتا تھا، اسے اس کی نگاہیں اچھی لگتی تھ نہ باتیں۔ اس نے دو ایک دفعہ پریشے سے جب یہ کہا، "تم بہت خوب صورت ہو۔" تو اس سیف کو بری طرح جھڑک دیا تھا۔

چھے سال پہلے زندگی کسی حد تک بدل گئی۔ جب مما کی وفات ہوگئی اور پھپھو کے بے حدا پر پاپا اسے اسلام آباد لے آئے، تب پہلی دفعہ اسے احساس ہوا تھا کہ...... ماں اس کی کیسی بڑی مضبوط ڈھال تھی، جس کے نہ ہونے سے پاپا پر اور لوگوں نے قبضہ کرلیا تھا۔

وہ بزنس پڑھنا چاہتی تھی مگر پھپھو نے پاپا کو مجبور کیا کہ وہ پریشے کو ڈاکٹر بنائیں۔ یوں ا

ایک سال ضائع ہوگیا مگر وہ میڈیکل میں پہنچ ہی گئی۔

پھر 2001ء کے جولائی میں کچھ ایسا ہوا کہ اس کا کوہ پیمائی کا کیریئر ختم ہوگیا۔ سیاچن کے ناقابلِ فراموش حادثے کے بعد پاپا نے اس کی کوہ پیمائی پر پابندی لگادی، تو اس نے خاموشی سے ان کا فیصلہ مان لیا۔ اگلے سال پاپا نے اسے بتایا کہ انہوں نے اس کا رشتہ سیف سے طے کردیا ہے۔ "اسے کوئی اعتراض تو نہیں۔" تب بھی اس نے خاموشی سے سر جھکا دیا، ہاں تب اس نے ایک دفعہ اس کے متعلق ضرور سوچا تھا، جس کا اسے برسوں سے انتظار تھا۔

لیک ڈسٹرکٹ جانے سے پہلے وہ ایک خوابوں میں رہنے والی کم عمر، لاپروا سی لڑکی تھی، جس کے "آئیڈیلزم" نے اسے ایک زندگی بھر پھانس کی طرح چبھنے والا خواب دیا تھا۔ اس اجنبی کا خواب، جس کا انتظار ہر لڑکی کرتی ہے۔

اس نے برسوں پہلے نشاء کو بتایا تھا۔ "تمہیں یاد ہے، ہم فیری ٹیلز میں پرستان کی ایک پری کا قصہ پڑھا کرتے تھے جس کو ظالم دیو نے قید کر رکھا تھا اور پھر اس کی رہائی کے لیے ایک شہزادہ آیا تھا۔ سفید گھوڑے پر سوار، بھورے بالوں اور شہد رنگ آنکھوں والا گھڑسوار، وہ دیس دیس کی خاک چھانتا، پرستان کی خوب صورت وادیوں کے قصے سن کر اس طرف آنکلا تھا۔ پری کی قید کا سنا تو وہ بہادر شہزادہ اسے ظالم دیو کی قید سے چھڑا کر خوب صورت وادیوں، چشموں اور پہاڑوں میں اپنے ہمراہ لے گیا اور پھر دونوں ہنسی خوشی رہنے لگے۔" اس نے ایک گہری سانس بھر کر نشاء کو دیکھا تھا۔ "کاش میرے لیے بھی ایک ایسا ہی شخص آئے، شہزادوں کی سی آن بان رکھنے والا، بہادر اور مضبوط، جو ظاہریت کے پجاریوں جیسا نہ ہو......"

یہ کوئی کچی عمر کا سپنا نہیں تھا، ایک امید تھی، ایک وجدان تھا کہ کوئی ہے، جسے اس کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ وہی جو دیس دیس کی خاک چھانتا کسی روز اس کے پرستان میں آنکلے گا، جس کو دیکھ کر اس کا دل کہے گا کہ ہاں، ظالم دیو کی قید میں موجود اس پری نے صدیوں اسی کا تو انتظار کیا تھا...... ہاں یہی تو ہے جس سے اس نے روح سے وجود میں آنے سے قبل عشق کیا تھا، جو اس کی ذات کا ٹوٹ کر بکھرنے والا ایک گم شدہ حصہ تھا۔

اور ہاں، وہ یہ بھی تو کہتی تھی کہ "اگر میں پریوں کی ہی طرح حسین ہوں، تو یونہی کسی سے شادی نہیں کروں گی بلکہ وہ جیسے پریاں اور شہزادیاں شرائط رکھا کرتی تھیں ناں، سات سوالوں کی شرط،

سامری جادوگر کے منکے کی شرط، ویسی ہی شرط رکھوں گی۔'' تو نشاء نے بے حد تجسس سے پوچھا تھا کہ ''کیسی شرط؟''

تب وہ کھلکھلا کر بولی تھی، ''میں صرف اس کا ہاتھ تھاموں گی، جو میرے لیے دنیا کا سب سے خوب صورت پہاڑ، راکاپوشی سر کرے گا۔''

کتنے ہی برس گزرتے گئے، وہ خوابوں کا شہزادہ نہ آیا، یہاں تک کہ وہ تمام خواب پریشے کو بچگانہ اور احمقانہ لگنے لگے اور وہ اب نشاء کے ساتھ ان پر خوب ہنستی تھی پھر سیف سے منگنی کے بعد اس نے ہنسنا بھی چھوڑ دیا۔

آج، اتنے عرصے بعد نشاء نے اسے وہ بات یاد دلا دی تھی، وہ احمقانہ اور بچگانہ بات۔

ہاں، وہ بچگانہ خواب ہی تو تھے! اب پریشے جہانزیب کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ وہ کوئی پری نہیں۔ وہ خوب صورت سہی، مگر ایک عام سی لڑکی ہے اور عام سی لڑکیوں کے لیے شہزادے نہیں آیا کرتے۔

☆......☆......☆

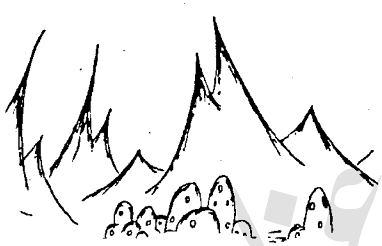

دوسری چوٹی

ہفتہ، 23 جولائی 2005ء

''چودہ ہزار فی کس کا پیکیج ہے۔ آٹھ دن کا ٹور، تمام انتظامات کمیٹی کے ذمے...... واؤ یار زبردست۔'' زوار بھائی کے آفس سے نکلتے ہوئے نشاء بہت خوش تھی۔

''لگتا ہے بارش ہونے والی ہے۔'' سڑک کنارے بہت آہستہ چلتے ہوئے پریشے نے سر اٹھا کر آسمان کو دیکھا۔ وہ دن کے تین بجے کا عمل تھا مگر سیاہ بادلوں سے ڈھکے آسمان نے جولائی کی دوپہر کو ٹھنڈی شام میں تبدیل کر دیا تھا۔

وہ ورکنگ ڈے تھا، شاید اسی لیے سڑک پر رش نہ ہونے کے برابر تھا، ورنہ مری جیسے گنجان آباد علاقے میں سڑک پر ادھر ادھر بس اکا دکا لوگوں کا پھرنا خاصی غیر معمولی بات تھی۔

پریشے اور نشاء باتیں کرتے ہوئے، آہستہ آہستہ بلند ہوتی سڑک پر چل رہی تھیں وہ جس جگہ

پر تھیں، وہاں نشیب تھا، سڑک ان کے سامنے اوپر بلند ہوتی ہوئی اس حد تک چلی جاتی تھی کہ مخا
سمت سے آنے والی کا پہلے سر اور آہستہ آہستہ دھڑ نمایاں ہوتا تھا۔ وہ دراصل کسی پہاڑی کی چوٹی
جس کو کاٹ کر سڑک بنادی گئی تھی۔

سڑک کے دائیں جانب کھائی تھی جس سے بچنے کے لیے پتھروں کے چھوٹے چھوٹے بلا
کی ایک باڑسی بنی تھی، وہ دونوں ان سفید بلاکس کے ساتھ چل رہی تھیں۔

''تھک گئی ہو؟'' نشاء نے اسے چونے سے ڈھکے پتھر کے اس سفید بلاک پر کھائی کی جا
پشت کر کے بیٹھتے دیکھا تو پوچھ لیا۔

''نہیں......بس یونہی۔''

وہ گھٹنوں پر کہنیاں ٹکائے، ٹھوڑی کے نیچے ہتھیلی جمائے بلند ہوتی سڑک کو گردن او
کر کے بہت اداسی سے دیکھنے لگی۔ بارش سے چند لمحے پہلے کا موسم اسے ہمیشہ افسردہ اور بو
کر دیا کرتا تھا۔

''کہیں اور بیٹھ جاؤ پری! یہاں سے ذرا پیچھے ہوئی تو گر پڑو گی۔'' نشاء نے بہت فکرمندی
اسے یوں اتنی خطرناک جگہ پر بیٹھے دیکھ کر کہا تھا۔ اس کا ہلکا گلابی اور سفید امتزاج والا لان کا سو
سفید پتھر کے بلاک کا حصہ لگ رہا تھا۔

''نہیں گرتی۔'' وہ لاپروائی سے گردن موڑ کر پیچھے دکھائی دینے والی سرسبز پہاڑیاں دی
لگی۔ مارگلہ کی پہاڑیوں پر اس روز بادل اترے ہوئے تھے، پانی سے لدے بھاری، سرمئی بادل
پھر یکایک انہوں نے اپنا بوجھ بارش کے قطروں کی صورت نیچے گرانا شروع کر دیا۔

پریشے نے بے اختیار اپنی دونوں بانہیں سامنے پھیلا دیں، بارش کے ننھے ننھے قطرے اس
ہتھیلیاں بھگونے لگے تھے، اسی لمحے اس کی سماعتوں میں کسی گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز گونجی۔

اس نے ہتھیلیاں نیچے گرا دیں اور کسی خواب کی سی کیفیت میں سر اٹھا کر بلند ہوتی سڑ
دیکھا۔ اس بلندی سے پیچھے کا منظر اس کی نگاہوں سے اوجھل تھا، ٹاپوں کی آواز وہیں سے آ
تھی۔ وہ یک ٹک بلندی کی جانب جاتی سڑک کو دیکھے گئی، پہاڑی کی دوسری جانب سے کوئی گھ
دوڑاتا ہوا اس طرف آ رہا تھا۔ ہر گزرتے لمحے گھوڑے کے ٹاپوں کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھ
اسے لگا وہ سڑک کے بلند حصے سے نگاہیں ہٹا نہیں سکے گی، وقت جیسے وہیں ٹھہر سا گیا تھا، لمحے
گئے تھے، بارش کے قطرے فضا میں رک گئے تھے، ہر طرف خاموشی تھی۔

آنے والے کا سر پہلے نمایاں ہوا تھا، وہ گھوڑے کی باگ تھامے اسے بہت مہارت سے سڑک پر دوڑاتا نشیب کی سمت آ رہا تھا۔ اس کا گھوڑا سفید تھا، چونے کے پتھر کے بلاکس سے بھی زیادہ سفید اور چمک دار...... وہ اسی طرف آ رہا تھا۔ اس کی نظریں اپنے گھوڑے پر تھیں۔ وہ پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھے گئی۔

اتنی دور سے بھی وہ دیکھ سکتی تھی کہ گھڑسوار کی آنکھوں کا رنگ ہلکا تھا، ہلکا اور بہت چمکدار۔ اس کی رنگت سنہری مائل سرخ و سفید تھی، ناک کھڑی اور یونانی طرز کی تھی۔ مغرور بے حد مغرور ناک۔ اس نے آدھی آستینوں والی نیلی شرٹ کے اوپر بغیر بازوؤں والی سفید لیدر جیکٹ، جس کی بہت ساری جیبیں تھیں، پہن رکھی تھی۔ گردن کے گرد خوب صورت سرخ رنگ کا مفلر بندھا تھا۔ جیکٹ اور مفلر ہلکے میٹریل کے تھے، جن کا مقصد سردی سے بچاؤ نہیں بلکہ یونہی فیشن اور سٹائل تھا۔ برستی بارش میں اس کے بھورے بال ماتھے پر چپکے ہوئے تھے مگر وہ جیسے ہر چیز سے بے نیاز اپنے سفید گھوڑے کی جانب متوجہ تھا۔

اس نے اپنا گھوڑا ان دونوں کے قریب سفید بلاکس کے ساتھ روک دیا اور گردن ترچھی کر کے عقب میں موجود پہاڑیوں کو دیکھنے لگا۔ وہ پیچھے والے منظر سے جیسے غیر مطمئن سا تھا، اسے شاید گھوڑا کھڑا کرنے کی کوئی صحیح جگہ نہیں مل رہی تھی۔

بارش رک چکی تھی اور ٹھنڈی ہوا پھر سے چلنے لگی تھی۔ پری کے گیلے بال اس کے چہرے کو چھو رہے تھے، مگر وہ تو اس شخص سے نگاہیں ہٹا ہی نہ پا رہی تھی۔

وہ اب ایک جگہ گھوڑا کھڑا کر کے مطمئن سا ہو گیا تھا، تب ہی گردن میں لٹکتے کور سے کیمرہ باہر نکالا اور چہرے کا رُخ ان دونوں کی جانب کیا۔

''بات سنو!'' اس نے پریشے کو براہِ راست مخاطب کیا تھا۔ اس پل جیسے کوئی طلسم سا ٹوٹا۔ سحر، خواب، خیال سب کچھ ختم ہو گیا تھا۔ وہ جیسے اب ہوش میں آئی اور چونک کر اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''جی؟'' اس نے اپنے ازلی پُراعتماد انداز میں سنجیدگی سے جواب دیا۔ اسے خود پر حیرت ہوئی تھی کہ وہ اتنی بے خود اور مسحور کیوں ہو گئی تھی؟

گھڑسوار نے اپنا کیمرہ اس کی جانب بڑھایا۔ ''کیا تم میری ایک تصویر اتار سکتی ہو؟'' وہ شستہ انگریزی میں اس سے مخاطب تھا۔ اس کا سر خود بخود اثبات میں ہل گیا، اس نے کیمرہ تھام لیا۔

''سنو، پکچر یوں کھینچنا کہ یہ گھوڑا اور پیچھے والے پہاڑ اچھی طرح آئیں۔'' وہ جو اتنی دیر سے

غالباً اس تصویر کے لیے ہی گھوڑا مناسب جگہ پر کھڑا کر رہا تھا، اب بہت مہذب انداز میں ہدایت دیتے ہوئے بولا۔

اس نے کیمرے کو دیکھا، بالکل ویسا ہی اولمپس کا ڈیجیٹل کیمرہ وہ بھی استعمال کرتی تھی… نے کیمرہ چہرے کے سامنے لا کر اس کی ایل ای ڈی اسکرین کو دیکھا اور پھر ریڈی کہے بغیر… کھینچ لی۔

''تمہارا شکریہ۔ مگر کیا یہ پہاڑ آئے تھے؟'' بغیر ریڈی کہے تصویر کھینچنے پر اسی اجنبی گھڑ… قدرے بے چینی ہوئی تھی۔'' اس نے ایک نظر اس کی شہد رنگ آنکھوں میں دیکھا اور پھر سر ہلا…

''ہاں، بہت خوب صورت تصویر آئی ہے۔'' نشاء نے پریشے کے ہاتھ میں پکڑے کیمرے… اسکرین پر موجود تصویر کو دیکھ کر کہا تو اسے خیال آیا کہ نشاء بھی وہاں موجود تھی۔

''ویسے یہ تمہارا گھوڑا ہے؟'' نشاء نے ہی اگلی بات کی۔

''نہیں، یہ میں نے کرائے پر ایک آدمی سے لیا ہے۔ اصولاً اسے گھوڑے کی باگ تھ… میرے ہمراہ چلنا چاہیے تھا، مگر میں اس کو بھگا کر یہاں لے آیا۔'' وہ شکل سے بہت مغرور لگتا تھ… اس وقت بہت بے تکلفی کے ساتھ انگریزی میں بات کر رہا تھا۔

انگریزی؟ پری نے غور سے اسے دیکھا۔ وہ انگریزی کیوں بول رہا تھا؟ اسے غور سے د… پر احساس ہوا کہ گھوڑے پر سوار وہ بھورے بالوں اور گوری رنگت والا خوب صورت مرد پا… نہیں، کوئی غیر ملکی تھا۔ وہ اس کی شناخت کے متعلق صحیح اندازہ نہیں کر سکی تھی۔

''تم دونوں ایک منٹ ٹھہرو، میں اس آدمی کو اس کا گھوڑا واپس کر آؤں۔'' اس نے پھر… مہارت سے گھوڑا موڑا اور اسے بلند ہوتی سڑک کی طرف بھگا کر لے گیا۔

''کتنا گڈ لکنگ تھا یار!'' نشاء اس کے جاتے ہی بے حد ستائشی انداز میں بولی۔

''پتا نہیں۔'' وہ سر جھٹک کر دائیں جانب کھڑے اونچے پہاڑوں کو دیکھنے لگی۔ باد… غائب ہو رہے تھے۔

''اوہ نشاء! وہ اپنا کیمرہ مجھے دے گیا ہے۔'' ایک دم اسے ہاتھ میں پکڑے کیمرے کا… آیا، وہ پریشان سی ہو گئی۔

''واپس آئے تو دے دینا۔''

حالاں کہ وہ اس کے واپس آنے سے پہلے پہلے نکلنا چاہتی تھی، مگر ہاتھ میں پکڑا کیمرہ…

اس کا انتظار کرنے پر مجبور کر رہا تھا۔

چند منٹ بعد ہی وہ انہیں بل کھاتی سڑک پر سے نیچے اترتے ہوئے اپنی جانب آتا دکھائی دیا۔ گھوڑے پر سوار ہونے کی وجہ سے اس کا قد کاٹھ انہیں ٹھیک سے نظر نہیں آیا تھا مگر جیسے ہی وہ ان کے قریب آیا، اسے احساس ہوا کہ وہ اس سے خاصا لمبا تھا۔

''وہ سمجھ رہا تھا، میں اس کا گھوڑا لے کر بھاگ گیا ہوں۔''

ان کے قریب آ کر وہ ہنستے ہوئے بتا رہا تھا۔ ہنستے ہوئے اس کی شہد رنگ آنکھیں چھوٹی ہو جاتی تھیں۔ وہ اندازہ نہ کر سکی کہ وہ ہنستے ہوئے زیادہ پرکشش لگتا ہے کہ لب بھینچے۔

''تم اتنے خطرناک طریقے سے رائیڈنگ کیوں کر رہے تھے؟'' نشاء کو بزرگی جھاڑنے کا شوق تھا سو اس لاپروائی پر اس کو ڈانٹنا اس نے اپنا فرض سمجھا۔

''میڈم! میں پانچ سال کی عمر سے رائیڈنگ کر رہا ہوں اور گھوڑوں کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں۔'' اس نے مسکراتے ہوئے سر جھٹکا۔ وہ اور نشاء سڑک کے کنارے آہستہ آہستہ چہل قدمی کرنے لگے، پریشے وہیں کھڑی رہی۔ دفعتاً اسے کیمرے کا خیال آیا۔

''سنو!'' ان دونوں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

''تمہارا کیمرہ!'' اس نے قدرے زور سے کیمرہ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ وہ مسکرا کر رہ گیا۔

''شکریہ!''

''سنو، تمہیں یوں اپنا اتنا قیمتی کیمرہ دے کر نہیں جانا چاہیے تھا۔ میں اگر لے کر بھاگ جاتی تو؟''

وہ پھر مسکرایا۔ ''مجھے پتا تھا تم ایسا نہ کرتیں۔'' سینے پر ہاتھ باندھے وہ اس کے عین سامنے آ کھڑا ہوا۔

''اگر تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو تمہارا کیمرہ لے کر بھاگ چکا ہوتا۔''

''تمہاری جگہ کوئی اور ہوتا تو میں کیمرہ ہرگز نہ دیتا۔'' وہ مسکراہٹ دبائے بہت سنجیدگی سے بولا۔

''ہونہہ!'' وہ اس کے اس انداز پر سر جھٹک کر سڑک کے دوسری جانب پھیلی دکانوں کی قطار کو دیکھنے لگی۔ وہاں رش اب بڑھتا جا رہا تھا۔

نشاء نے اس ''بدتمیزی'' پر اسے گھورا بھی، مگر وہ اسے دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔

گھڑ سوار نے گردن جھکا کر کیمرے کی اسکرین پر نگاہ ڈالی اور زیر لب مسکرایا۔

"اچھی تصویر کھینچنے کا شکریہ۔" تصویر دیکھ کر اس نے سر اٹھاتے ہوئے کہا اور کیمرہ کور میں ڈال دیا۔ وہ پھر مغرور نظر آنے کی اداکاری کرتی جواب دیئے بنا دکانوں کو دیکھتی رہی۔

"تم اس تصویر کا کیا کرو گے؟" اس کی بے رخی کے اثر کو کم کرنے کے لیے نشاء نے بہ دوستانہ انداز میں اسے مخاطب کیا۔

"میں بیس برس بعد ایک سفر نامہ لکھوں گا، اس کے فرنٹ پر یہ تصویر لگاؤں گا۔"

"اور اس تصویر کا کیپشن کیا ہوگا؟" نشاء نے دلچسپی سے پوچھا۔

"میں اس کے نیچے لکھوں گا "اس کوہ پیا کی تصویر، جو راکاپوشی سر کرنے جا رہا تھا۔" وہ فخریہ بتا رہا تھا۔

پریشے نے تیزی سے گردن گھما کر اسے دیکھا۔ اسے جھٹکا سا لگا تھا۔ "تم، تم راکاپوشی سر کرنے جا رہے ہو؟" بے اختیار پوچھ لینے کے بعد اسے یاد آیا کہ...... اس کو تو خود کو لاتعلق ظاہر کرنا تھا، اسے پچھتاوا سا ہوا۔

"ہاں......!" پریشے کی بے ساختگی پر اس نے بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ چھپائی تھی۔

"خیر راکاپوشی سر کرنا کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے۔ ایورسٹ یا کے ٹو سر کرنا اصل کام ہے۔" کہہ کر وہ پھر سے دکانوں کو دیکھنے لگی۔

"ویسے کل ہم لوگ ایک ٹور کمپنی کے ساتھ کالام جا رہے ہیں۔"

نشاء کے بتانے پر گھڑ سوار نے آنکھیں سکوڑ کر مال روڈ کی طرف دیکھا۔ سن شائن ٹریولز کا دفتر سامنے ہی تھا۔ اس نے جیسے ایک لمحے کو سوچا، پھر بولا۔

"میں بھی کل کالام جا رہا ہوں، سن شائن ٹریولز کے ساتھ تم کس کے ساتھ جا رہی ہو؟"

"واقعی؟ تم تو ہمارے ساتھ جا رہے ہو!" نشاء کو اس "اتفاق" سے ازحد خوشی ہوئی تھی۔ پریشے کو کچھ شک سا ہوا تھا۔

"یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ ویسے تمہاری دوست بھی جا رہی ہے کیا؟" مسکراہٹ لبوں تلے دبائے، اس نے بہت معصومیت سے پوچھا۔ پریشے نے رخ قدرے مزید موڑ لیا۔

"ہاں، مگر تمہیں کیسے پتا یہ میری دوست ہے؟"

"بہت آسان...... وہ خوب صورت ہے۔" اس کے سنجیدہ انداز پر نشاء ہنس پڑی جب

پریشے کے ماتھے پر ناگواری کی شکن ابھری تھی۔

"میں نشاء ہوں۔ نشاء سعید اور یہ میری کزن کم دوست ہے، ڈاکٹر پریشے جہانزیب۔"

"پاری شے؟" اس نے اپنے یورپی لب و لہجے میں اس کا نام دہرایا۔

"پاری شے نہیں، پری...... شے۔"

"میرے نام کے پیچھے کیوں پڑ گئی ہو، نشاء؟" خود کو یوں موضوع گفتگو بنتے دیکھ کر وہ تنک کر اردو میں بولی۔

"یہ مینرز کے خلاف ہے۔ تم دونوں کو میری موجودگی میں اپنی زبان میں بات نہیں کرنی چاہیے۔" وہ مسلسل پریشے کو دیکھ رہا تھا۔ ایک تو کمبخت بلا کا ہینڈسم تھا، اوپر سے اتنے خوب صورت انداز میں آنکھیں سکیڑ کر دیکھتا تھا، وہ خواہ مخواہ کنفیوژ ہونے لگی۔

"مطلب کیا ہوا تمہاری کزن کے نام کا؟"

"پری چہرہ لڑکی۔ یہ ایران کی ایک شہزادی کا نام تھا۔ اسی لیے تو میں اس کو پری کہتی ہوں۔"

"تمہاری کزن پر سوٹ بھی کرتا ہے۔ پری مطلب فیری؟ ہماری زبان میں بھی فیری کو پری کہا جاتا ہے۔"

"تم نے اپنا تعارف نہیں کرایا۔"

"اوہ سوری! میں افق ارسلان ہوں۔ ترکی سے آیا ہوں۔ ویسے پیشے کے لحاظ سے انجینئر ہوں مگر ساتھ ساتھ ایک تجربہ کار کلائمبر بھی ہوں۔ تمہارے پاکستان میں دنیا کے سب سے خوب صورت پہاڑ، راکاپوشی کے لیے آیا ہوں۔"

اس نے جھک کر اپنا تعارف کروایا۔ "اور تم لوگ کیا کرتی ہو؟"

"نشاء! ہمیں دیر ہو رہی ہے۔ میں گاڑی کی طرف جا رہی ہوں، تم نے چلنا ہے تو چلو۔" قدرے غصے سے کہہ کر وہ کھٹ کھٹ کرتی گاڑی کی طرف آ گئی۔ عجلت میں افق ارسلان کو خدا حافظ کہہ کر نشاء دوڑتے قدموں کے ساتھ اس تک پہنچی تھی۔

"تمہارا مسئلہ کیا ہے نشی؟ نہ جان نہ پہچان، خواہ مخواہ کسی اجنبی وہ بھی گورے کے ساتھ یوں سر راہ گپیں لگانے کا مقصد؟" ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھولتے ہوئے وہ نشاء پر برس پڑی تھی۔

چند گز کے فاصلے پر وہ ترک سیاح ان سفید چوکور بلاکس کے ساتھ ابھی تک کھڑا تھا۔ دفعتاً اس نے پری کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا، جسے اس نے نظر انداز کر دیا۔

نشاء ایک لمحے کو چپ سی ہوگئی۔ ’’پری!‘‘ وہ کچھ دیر بعد بولی۔ ’’وہ ایک اچھا انسان ہے، تم اس کے ساتھ ان کمفرٹیبل فیل نہیں کرو گی۔ بلیومی پری!‘‘

’’نہیں نشاء! سیف نے منع کیا ہے۔‘‘

’’واٹ دی ہیل؟‘‘ اس کا پارہ ہائی ہوگیا تھا۔ ’’وہ ہوتا کون ہے تمہیں منع کرنے والا؟ میں تو ابھی تک تمہاری منگنی کو ہی قبول نہیں کر سکی۔ تم دونوں ایک دوسرے کے لیے ہو ہی نہیں، لیکن تم نے شاید شادی سے پہلے ہی اس کی غلامی قبول کر لی ہے۔ ٹھیک ہے، فائن! میں یونہی تمہارے لیے ہلکان ہوتی ہوں۔ جہنم میں جاؤ تم، جہنم میں جائے سیف اور جہنم میں جائے افق ارسلان۔‘‘

ایک پژمردہ مسکراہٹ پریشے کے لبوں پر بکھر گئی۔ ’’میں نے اس کی غلامی قبول نہیں کی اور سنو، میں نے پروگرام بھی کینسل نہیں کیا، لیکن اگر تم نے میرے نام کے ساتھ افق کا نام پھر لیا تو میں پروگرام کینسل کر ہی دوں گی۔‘‘ مزید کچھ کہے بغیر اس نے فون رکھ دیا۔

اسے سیف کے غصے کی پروانہ تھی۔ کالام سے واپسی کے بعد اس کی اس سے شادی ہو ہی جانی تھی، دل نے تب مر ہی جانا تھا اور شاید سیف جیسے انسان کے ساتھ زندگی کی شروعات کرنے کے بعد اسے کسی کی بھی پروانہ رہے۔ نہ دکھ کی، نہ خوشی کی شاید تب وہ بے حس ہو جائے، مگر اس بے حسی کے دور کے آغاز سے قبل صرف آٹھ دن، وہ زندگی کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔

☆......☆......☆

’’بھئی میرا مسلمان بھائی ہے، ایک برادر اسلامی ملک سے آیا ہے۔ ہمارا مہمان ہے، اسلامی فریضہ ہے کہ میں میزبانی نبھاؤں۔‘‘

’’اچھی طرح جانتی ہوں میں تمہیں۔ مسلمان لڑکی!‘‘ گاڑی واپس اسلام آباد کے رستے ڈالتے ہوئے اس نے دانت پیسے تھے۔ ’’کیا ہم اب کسی اور ٹور کمپنی کے ساتھ نہ چلے جائیں؟‘‘

’’اس بات کا تو ذکر ہی مت کرنا۔ اگر ہم اس ٹور کمپنی کے ساتھ نہیں جائیں گے، تو پھر بالکل نہیں جائیں گے!‘‘ نشاء نے بڑے اطمینان سے فیصلہ سنا دیا۔

وہ خاموشی سے ڈرائیونگ کرتی رہی۔ آٹھ دن ندا آپا کے ساتھ یا آٹھ دن اس ترک سیاح کے ساتھ؟ اس کے پاس صرف ایک ہی راستہ بچا تھا کیوں کہ ندا آپا کے ساتھ آٹھ دن گزارنے کا وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

وہ نشاء کو ڈراپ کر کے گھر آئی تو فون بج رہا تھا۔ اس نے کریڈل پر دھرا ریسیور اُٹھایا۔ ’’ہیلو؟‘‘

’’تم اپنی کزن کے ساتھ کہاں جا رہی ہو؟‘‘ ناگوار سا باز پرس کرنے والا لہجہ تھا سیف کا۔

’’کالام اور بھی لوگ جا رہے ہیں۔‘‘

’’ماموں نے مجھ سے پوچھے بغیر تمہیں کیسے اکیلے جانے کی اجازت دے دی؟ کیا اب ہمارے خاندان کی لڑکیاں دور افتادہ علاقوں میں باپ بھائی کے بغیر سڑکیں ناپتی پھریں گی؟‘‘

وہ اس سے واضح طور پر ناراض تھا۔

’’پاپا نے مجھے اجازت دے دی ہے سیف!‘‘ کہیں ایک نیا مسئلہ نہ کھڑا ہو جائے، اس خیال نے اسے تھکا دیا تھا۔

’’مگر میں کہہ رہا ہوں کہ تم یوں نہیں جاؤ گی۔ تم اپنی کزن کو منع کر دو۔‘‘ تحکم بھرا انداز۔ وہ بے بسی سے لب کاٹ کر رہ گئی۔

’’ہم اسکول میں بھی تو ٹورز کے ساتھ چلے جاتے تھے، ایک قابل اعتماد ٹریول ایجنسی کے ساتھ......‘‘

’’یہ یو کے نہیں ہے پریشے!‘‘ اس کا انداز دوٹوک تھا۔ ’’بس تم اپنی کزن کو منع کر دو۔‘‘

’’اچھا۔‘‘ پریشے نے فون رکھ دیا۔ چند لمحے آزردگی سے فون کو دیکھتی رہی پھر نشاء کا نمبر ملایا۔

’’میری آواز سنے بغیر چین نہیں آ رہا، جو گھر پہنچتے ہی فون کھڑکا رہی ہو؟‘‘

’’نشاء! میں کالام نہ جاؤں تو؟‘‘

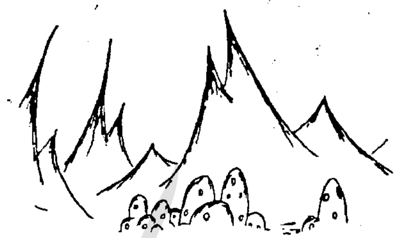

تیسری چوٹی

اتوار، 24 جولائی 2005ء

پاپا کی ڈھیر ساری دعائیں لے کر وہ گھر کے گیٹ سے باہر کھڑی ٹور کمپنی کی بس میں آ
گئی۔ ان کا گائیڈ کم ڈرائیور، ظفر اس کا سامان لوڈ کر کے ڈرائیونگ سیٹ پر آ گیا۔

بس میں اسے چار انجان چہرے دکھائی دیئے تھے۔ وہ ایک نسبتاً پچھلی سیٹ پر کھڑکی کی ط
بیٹھ گئی۔ نشاء یا وہ ترک سیاح ابھی تک نہیں آئے تھے۔

کھلے شیشے سے آتی ٹھنڈی ہوا اس کی آنکھوں کو بند کر رہی تھی۔ اس نے شیشہ بند کر دیا
لیئرز میں کٹے سیاہ بالوں کو اونچی پونی ٹیل میں باندھا۔

دفعتاً اسے دوسرے مسافروں کا خیال آیا۔ اس نے ایک سرسری نگاہ ان پر ڈالی۔ اس
بائیں طرف والی نشستوں کی قطار میں اس کے برابر ایک کم عمر لڑکی بیٹھی تھی۔ عمر بمشکل بیس اک

سال کندھوں سے اوپر آتے کھلے بال، جو ماتھے پر بینڈز کی صورت میں کٹے تھے اور گوری رنگت۔
ہ محویت سے سڑک کے کنارے بھاگتے درختوں کو دیکھ رہی تھی۔ اس نے سفید ٹراؤزر اور گھٹنوں
تک کرتا پہن رکھا تھا اور پاؤں میں سینڈل تھے۔

دوسرے مسافروں میں پچاس پچپن سالہ ایک انکل تھے، غالباً کوئی ریٹائرڈ افسر، یا کوئی امیر
بزنس مین۔ وہ خاصے وجیہہ تھے اور سب سے اگلی سیٹ پر براجمان تھے۔

ان کے علاوہ ایک جوڑا تھا۔ بیوی قدرے کرخت اور نک چڑھی سی لگی البتہ میاں ''بیبا'' سا
تھا۔ پریشے کو قیافہ شناسی سے گہری دلچسپی تھی۔

''صبح چھ بجے کوئی وقت ہے جانے کا؟ مجھے سونے بھی نہیں دیا۔'' نشاء اس کے مقابل آ کر
بیٹھی تو بس جو نشاء کو پک کرنے رکی تھی، پھر چل پڑی۔

''سو جاؤ، لمبا سفر ہے۔'' اس نے نشاء کی خوابیدہ آنکھیں دیکھ کر کہا۔

ظفر نے اپنا آخری مسافر ایک اعلیٰ درجے کے ہوٹل سے اٹھایا تھا۔ وہ بس میں داخل ہوا اور
پریشے کی توقعات کے برعکس ان دونوں کی جانب آنے کے بجائے ''ریٹائرڈ'' صاحب کے ساتھ
والی خالی نشست پر بیٹھ گیا۔ اس نے تو گردن کو جنبش دے کر ان دونوں کی طرف دیکھا تک نہ تھا۔

چوں کہ وہ ان سے کافی آگے بیٹھا ہوا تھا اور وہ بھی بائیں قطار میں، سو وہ اس کا محض دایاں
کندھا، بازو اور سر ہی پیچھے سے دیکھ سکتی تھی۔ لائٹ براؤن شرٹ، سفید پینٹ، وہی کل والی
سلیولیس ہلکی سی ٹورسٹ جیکٹ، گردن میں لٹکتا مفلر، پاؤں میں جوگرز، وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔
ہاں، آج اس کے سر پر ایک پی کیپ بھی تھی۔ وہ کچھ دیر اسے دیکھتی رہی پھر نشاء کی طرح سو گئی۔

کوئی دو گھنٹے بعد اس کی آنکھ کھلی۔ وہ لوگ ابھی تک حالتِ سفر میں تھے۔ نشاء جاگ چکی تھی۔
اس نے چور نظروں سے افق کو دیکھا، وہ اپنے سیل فون کے بٹنز سے کھیل رہا تھا۔

''سنو پری! تمہیں یہ شخص اچھا نہیں لگا؟''

''نہیں اور میں اس کا ذکر نہیں کرنا چاہتی۔'' وہ کھڑکی کے باہر دیکھنے لگی۔

''مگر میں کرنا چاہتی ہوں۔'' نشاء بضد تھی۔

''ٹھیک ہے، پھر جا کر اسی کے پاس بیٹھ جاؤ۔''

بقیہ سارا راستہ خاموشی سے کٹا۔ دن چڑھے بس پشاور کی حدود میں داخل ہوئی سڑکوں پر خاصا
رش تھا۔ اپنے جوبن پر چمکتا سورج شہر کو جھلسا رہا تھا۔

"کتنی گرمی ہے یہاں حالاں کہ پشاور پہاڑوں پر واقع ہے۔ یار اس سے ٹھنڈا تو اسلام آباد تھا۔" نشاء کو اپنا شہر یاد آیا۔

ٹور کمپنی نے پہلے سے ایک متوسط درجے کے ہوٹل میں ان کی بکنگ کروا رکھی تھی۔ ہوٹل کے باہر تنگ سی سڑک پر بے تحاشا رش تھا۔ سڑک کے اچھے خاصے حصے پر ریڑھی والوں کا قبضہ تھا۔ گاڑی ایک ڈھلوان پر چڑھ کر ہوٹل کے پارکنگ ایریا تک آئی۔ وہاں گاڑیوں کی لمبی قطار تھی۔

"ناٹ بیڈ!" بس سے نکل کر نشاء نے تبصرہ کیا۔ پری ہوٹل کی بلند عمارت کو دیکھنے کے بجائے اس سکون کو محسوس کر رہی تھی، جو اتنی دیر ایک ہی جگہ بیٹھے رہنے کے بعد کھڑے ہو کر اس کی ٹانگوں کو ملا تھا۔

ترک سیاح ان دونوں سے فاصلے پر کھڑا سفید جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، آ... سکیٹرے اطراف کا جائزہ لے رہا تھا۔ وہ اسے اپنی طرف متوجہ پا کر مسکرایا، پریشے نے نگاہوں کا رخ بدل لیا۔

"ہیلو گرلز، کیسی ہو تم دونوں؟" وہ ان کے قریب چلا آیا۔

"اوہ تو آپ ہمیں پہچانتے ہیں؟" نشاء کو اس کا پورا راستہ انہیں لفٹ نہ دینا بہت کھلا تھا، کہے بغیر نہ رہ سکی۔ وہ جواباً ہنس پڑا۔

"میں نے سوچا صبح صبح نیند سے بے حال ہوتے لوگوں کو نہ جگایا جائے، ذرا کہیں پہنچ جا... آرام سے گپ شپ کرتے رہیں گے۔" وہ مسکراہٹ دبائے سنجیدگی سے بولا۔

پریشے ان دونوں کو چھوڑ کر اس ٹین ایج لڑکی کے پیچھے چلتے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

246 نمبر کمرے میں پہنچ کر ظفر نے چابی اس کے حوالے کی۔ وہ ٹرپل بیڈ روم اس کو نشاء اور اس لڑکی کے ساتھ شیئر کرنا تھا۔

"او کے، شام کو ملاقات ہو گی۔" افق ان دونوں سے یہ کہہ کر ساتھ والے کمرے میں چلا... میاں بیوی سامنے والے کمرے میں چلے گئے۔

"میں ڈاکٹر پریشے جہاں زیب ہوں۔" کمرے میں آ کر اپنے لبوں پہ مسکراہٹ سجا کر ... نے اس لڑکی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"میں ارسہ بخاری ہوں۔ ویسے آپ کا نام بہت پیارا ہے پریشے!" وہ رکی اور تصحیح کر...

والے انداز میں بولی۔ "پریشے آپی!"

"آپی؟" ان دونوں نے بیڈ پر بیٹھتے ہوئے قدرے حیرت سے اسے دیکھا۔

"دراصل میں پاکستانی کزنز کو اگر بغیر آپی باجی کہے بلاؤں تو دادو "انگریز" کہہ کر ٹوکتی ہیں، سو میں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ کسی پاکستانی لڑکی کو آپی باجی کہے بغیر نہیں بلانا۔"

وہ دونوں ہنس پڑیں۔

کھانا انہوں نے ساتھ ہی کھایا تب تک تعارف کا سلسلہ مکمل ہو چکا تھا۔

ارسہ کا تعلق لاہور سے تھا، مگر وہ پلی بڑھی انگلینڈ میں تھی۔ اردو لکھ اور پڑھ لیتی تھی مگر بولتی بہت مشکل سے تھی۔ اس کے پاس اس کم عمری میں بھی ایک اچھا الپائن ریکارڈ تھا۔ وہ زیادہ تر یورپی الپس سر کر چکی تھی، اس کے علاوہ تبت میں اس نے shishapangma اور chooyu کو سر کیا تھا۔

"تو تم افق کے ساتھ راکاپوشی جا رہی ہو؟" نشاء کو وہ معصوم اور ذہین سی لڑکی بہت اچھی لگی تھی۔

"ہاں!" اس نے سر ہلا دیا۔ "راکاپوشی میرے ناول کی سیٹنگ ہے۔ اوہ میں بتانا بھول گئی، میں رائٹر بھی ہوں۔ دو ناول لکھ چکی ہوں، یہ میرا تیسرا ناول ہے۔"

"اتنی سی عمر میں دو ناول؟" پریشے کو خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔

ارسہ ہنس پڑی۔ "محمد بن قاسم نے سترہ سال کی عمر میں سندھ فتح کیا تھا، میں نے تو اس عمر میں صرف پہلا ناول لکھا تھا۔ یہ کوئی بڑی بات نہیں ہے۔"

"اچھا تو تمہارے ناول کی اسٹوری کیا ہے؟" اسے دلچسپی ہوئی۔

"ایک کوہ پیما ہیرو اور ایک کوہ پیما ہیروئن کی راکاپوشی سر کرنے کی رومانوی داستان۔" وہ مزے سے بولی۔ نشاء سونے کے لیے لیٹ چکی تھی۔

"اینڈ ہیپی کرو گی یا ٹریجک؟"

"ٹریجک کیوں کہ ٹریجک اینڈ یادگار ہوتا ہے۔ ویسے آپ نہیں آئیں گی راکاپوشی؟ آپ بتا رہی تھیں کہ آپ بھی کلائمبر ہیں۔"

"ہاں، میں نے کمبریا کے ٹو اسکول، لیک ڈسٹرکٹ سے سات ہفتے کے کورسز کیے تھے، مگر میں راکاپوشی نہیں آؤں گی کہ مجھے اپنے فادر کی پرمیشن نہیں ہے۔"

''کبریا کےٹو سے؟ واؤ، آئی ایم امپریسڈ!''

''اورسوئس الپس کے علاوہ، میں نے سپانتک (spantik) کو بھی سر کر رکھا ہے۔'' مسکراتے ہوئے بتانے لگی۔

''اوہ ویسے آپ آتیں تو مزا آتا۔ افق بھائی بہت اچھے ہیں۔ میری ان سے ملاقات فلا... کے دوران ہوئی تھی۔ وہ مصر سے آرہے تھے اور میں انگلینڈ سے۔''

''اب سوتے ہیں۔'' اس سے پہلے کہ وہ ''افق نامہ'' شروع کرتی، پریشے نے اس کی با... کاٹ دی۔ ارسہ تابعداری سے بستر پر لیٹ گئی۔

جلد ہی اسے نیند نے آن گھیرا۔ پھر وہ شام تک سوتی رہی۔ ارسہ اور نشاء صبح تڑکے ہی اٹھ... تھیں اور باآواز بلند گپیں ہانکتے ہوئے انہوں نے اسے بھی جگا ڈالا تھا۔ مگر وہ آنکھوں پر با... رکھے سوتی بنی رہی۔

دفعتاً دروازے پر دستک ہوئی پریشے کا دل زور سے دھڑکا تھا۔ اس نے آنکھوں پر سے با... نہیں ہٹایا مگر وہ جانتی تھی کہ باہر کون تھا۔ وہ دستک نہیں، افق ارسلان کی خوشبو پہچانتی تھی۔

''اندر آسکتا ہوں اچھی لڑکیو؟'' اس کا شرارت سے کھنکتا لہجہ پریشے کی سماعت سے ٹکرایا۔ ا... کی آنکھوں پر بازو نہ ہوتا تو وہ شاید اس کی پلکوں کا ارتعاش دیکھ لیتا۔

''لگتا ہے اچھی لڑکیوں کے بغیر دل نہیں لگ رہا۔ آؤ بیٹھو۔'' وہ اتنا مہذب، شائستہ ا... ہنس مکھ تھا کہ نشاء اور ارسہ فوراً اس کے لیے اٹھ کھڑی ہوئیں اور اسے کرسی پیش کی۔

''یونہی سمجھ لو۔'' وہ پریشے کے بیڈ کے سامنے رکھی کرسی پر بیٹھ گیا۔ کرسی اور بیڈ کی پائنتی۔... درمیان فاصلہ خاصا کم تھا۔ جگہ تنگ تھی، وہ بیٹھ تو گیا مگر اس کے جوگرز بیڈ کا سرا کو چھو رہے تھے۔

''میں اس سفر کو یادگار بنانا چاہتا ہوں اور بطور ایک اچھے سیاح، میں کوئی لمحہ فارغ نہیں بیٹھ... چاہتا۔ سو پھر تم لوگ بتاؤ شام کیا پروگرام ہے؟'' اسے محسوس ہو رہا تھا کہ بولتے ہوئے بھی بھ... بھٹک کر افق کی نگاہیں اسی کے چہرے پر پڑ رہی تھیں جو اس نے اپنے سفید بازو کی اوٹ میں آ... چھپا رکھا تھا۔ کمبل بھی گردن تک لے رکھا تھا، صرف چہرے کا نچلا حصہ کھلا تھا۔

''پری اٹھ جائے تو کوئی پروگرام بناتے ہیں۔''

''تمہاری دوست بہت زیادہ سوتی ہے کیا؟'' اس کے انداز سے پریشے کو لگا، وہ جان گیا... کہ وہ سو نہیں رہی۔

''نہیں آج بس ذرا تھک گئی ہے۔ تم اپنا پروگرام بتاؤ۔''

''میں آج تمہارے پشاور کے بازار، یہی کینٹ اور صدر وغیرہ کھنگالنے کا سوچ رہا ہوں۔ باقی ورسٹ اٹریکشنز کل دیکھوں گا۔''

''تو پھر ہم تینوں بھی آپ کے ساتھ چلتے ہیں افق بھائی! احمر صاحب اور افتخار فیملی کی مرضی وہ جہاں بھی جائیں یا پھر ان سے پوچھ لیں؟'' ارسہ متذبذب تھی۔

''وہ کپل بہت ریزرو ہے، وہ یقیناً ہم سے گھلنا ملنا پسند نہیں کریں گے۔ احمر صاحب تو آدھا گھنٹہ ہوا کہیں چلے بھی گئے ہیں پھر ہم چاروں ساتھ چلتے ہیں، مگر......'' وہ ایک لمحے کو رکا، پری کے ...ہی اٹھ کان کھڑے ہو گئے۔

''مگر کیا؟''

''مگر ہو سکتا ہے تمہاری دوست کو کوئی اعتراض ہو۔''

''ارے نہیں۔ وہ بہت نائس اور سوئٹ ہے۔ اسے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔''

''ویسے نشاء! مجھے بہت خوشی ہوئی تھی۔ جب تم نے مجھے بتایا تھا کہ تمہاری دوست میری بہت تعریف کر رہی تھی۔''

پریشے نے ایک جھٹکے سے کمبل اتارا اور تیزی سے سیدھی ہوئی۔

''میں نے ایسا کب کہا تھا؟''

افق کا قہقہہ بے اختیار بلند ہوا، اسے اپنی حماقت پر شرمندگی ہوئی۔ نشا اور ارسہ قدرے حیران تھیں، انہیں ابھی ''لطیفہ'' سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

''تم اُٹھ گئیں؟ میں سمجھی سو رہی ہو۔''

''میرے سر پر جو تم لوگ گول میز کانفرنس کر رہے ہو، میں بھلا کیسے سکون سے سو سکتی تھی۔''

اپنی شرمندگی چھپانے کو اس نے غصے کا سہارا لیا اور بستر سے نیچے اتر گئی۔ ڈریسنگ روم جانے کے راستے میں افق کی لمبی ٹانگیں حائل تھیں۔ اسے قریب آتا دیکھ کر اس نے پیر سمیٹ لیے۔ وہ پیر پٹختے ہوئے اس تنگ جگہ سے گزری۔

''سوری پری! میں مذاق کر رہا تھا۔'' وہ بمشکل ہنسی کنٹرول کرتے معذرت کرنے لگا مگر وہ جھنجھلاتی ہوئی زور زور سے الماری کے پٹ کھول بند کرتی رہی۔

''اچھی لڑکیو! تیار ہو کر لابی میں آجاؤ۔ تمہارے پاس صرف پندرہ منٹ ہیں۔'' وہ جانے کے

لیے اٹھ کھڑا ہوا تو پری نے کن اکھیوں سے اسے دیکھا، اس نے لباس تبدیل کرلیا تھا۔
طرح شرٹ کی آستینیں آدھی، مگر رنگ سیاہ تھا اور اوپر سفید ٹورسٹ جیکٹ، گردن کے گرد
بالکل سرخ مفلر۔

"رائٹ باس!" ارسہ نے تابعداری دکھائی۔ وہ مسکراتے ہوئے ایک نگاہ پریشے پر
باہر نکل گیا۔ وہ "اُف" کہتے ہوئے کلس کررہ گئی۔

ان پندرہ منٹ میں پریشے نے کوئی دو سو دفعہ ان دونوں کو "ضرور پروگرام بنانا تھا تم
کے ساتھ؟" سنایا تھا۔ نشاء ڈھیٹ بنی سنتی رہی، ارسہ کو البتہ حیرت ہوئی تھی۔

"یہ پریشے آپی کی کوئی لڑائی ہوئی ہے افق بھائی سے؟ وہ تو اتنے کیئرنگ اور سوئٹ ہیں۔"

"یہ صدیوں کی داستان ہے، تمہیں ایک شام میں سمجھ نہیں آسکتی۔" نشاء نے آہ بھر کر
ہیئر برش کرتے پریشے کے ہاتھ ایک لمحے کو تھمے تھے۔ وہ اندر سے کانپ کررہ گئی تھی۔ پلٹ کر
شا کی نظر نشاء پر ڈالی اور دوسری اپنی انگلی میں موجود انگوٹھی پر۔ نشاء نے لاپروائی سے کندھے
دیئے۔ ارسہ کے سر کے اوپر سے سب کچھ گزر گیا تھا۔

وہ پیر پٹخ کر باتھ روم میں چلی گئی۔ نشاء کی بات وہ عموماً مانا نہیں کرتی تھی، مگر اب اس
پاس کوئی دوسرا راستہ نہ تھا۔ نشاء اور ارسہ چلی جاتیں تو اس نے بھلا کیا قصور کیا تھا، جو وہ اکیلی
چھوٹے سے کمرے میں بیٹھی رہتی؟ یوں بھی افق کے ساتھ مارکیٹ جانا اسے برا نہیں لگ رہا
البتہ یوں ظاہر کرنا وہ اپنا فرض سمجھتی تھی۔

پارکنگ ایریا میں کھڑی ٹور کمپنی کی بس کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا افق ان کا انتظار کررہا
انہیں دیکھ کر سیدھا ہوگیا۔ ایک استقبالیہ مسکراہٹ نے اس کے لبوں کا احاطہ کرلیا تھا۔ پی کیپ
بھی اس کے سر پر تھی۔

"کینٹ چلتے ہیں، یہاں سے بہت قریب ہے۔" ان کی رہنمائی کرتے ہوئے وہ ہوٹل
پارکنگ ایریا سے نیچے سڑک تک جاتی ڈھلان سے اتر رہا تھا۔

"تم ترکی سے آئے ہو یا صوبہء سرحد سے؟" نشاء کو اس کی پشاور اور اردگرد کے
معلومات حیران کرتی تھیں۔

وہ بے اختیار ہنس پڑا۔ "بس پچھلی دفعہ ادھر آیا تھا تو خاصے دن یہاں گزارے تھے۔ اس
آئیڈیا ہوگیا ہے۔"

"پچھلی دفعہ کب آئے تھے؟"

"دو سال پہلے۔" وہ لوگ ڈھلان اتر کر نیچے سڑک پر آچکے تھے۔ سڑک اچھی خاصی کھلی تھی مگر پھلوں کی ریڑھیوں اور خوانچہ فروشوں کے باہمی تعاون سے اب بہت تنگ ہوچکی تھی۔ اس جگہ ہوٹلز تھے یا پی سی او۔

"دو سال پہلے کیا سیر و سیاحت کے لیے آئے تھے؟" ریڑھیوں سے دونوں اطراف میں گھری سڑک پر راستہ بنا کر چلنا بہت مشکل تھا، پھر بھی وہ بہت دھیان سے ان دونوں کی گفتگو سن رہی تھی۔

"ہاں سیر و سیاحت کے لیے اور......" بولتے بولتے وہ یک دم خاموش ہوگیا۔

"اور......بس کچھ کام تھا۔" وہ صاف ٹال گیا تھا۔ نشاء اخلاقیات سے اتنی تو آگاہ تھی ہی کہ اگر وہ ٹال رہا تھا تو وہ اس کام کی تفصیل نہ پوچھتی۔

افق نے ٹیکسی روکی۔ ٹیکسی والا انگریزی سے نابلد تھا، سو کرایہ کا معاملہ نشاء نے ہی طے کیا۔

کینٹ کی خوب صورت دکانوں کے باہر آہستگی سے چلتے ہوئے وہ چاروں خاصی دیر تک ونڈو شاپنگ کرتے رہے، پھر ارسہ ان کو چھوڑ کر سعید بک بینک کی طرف چلی گئی۔ وہ تینوں ایک جیولری شاپ میں داخل ہوگئے۔

یہ اتفاق ہی تھا کہ جب نشاء مختلف ائیر رنگز دیکھ رہی تھی تو اپنی ڈھیلی پونی کو کستے ہوئے پریشے کے بالوں کو جکڑا ربر بینڈ ٹوٹ گیا۔ اس کے بال کسی آبشار کی طرح کمر پر گر گئے۔

"نشی! تمہارے پاس کوئی کیچر ہے؟" اپنے لمبے لیئرز میں کٹے بالوں کو سنبھالتی وہ پریشانی سے نشاء سے بولی۔

"اپنا خریدتے ہوئے تمہیں موت پڑتی ہے؟" وہ بہت مصروف تھی، سو کھٹ سے بولی۔

"دفع ہوجاؤ۔" وہ بڑبڑاتے ہوئے سامنے شوکیس پر پڑی باسکٹ میں رکھے کیچرز اور پونیاں دیکھنے لگی۔

"یہ کیسا ہے؟"

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ افق ہاتھ میں ایک کیچر لیے اسے دکھا رہا تھا۔ اس نے نظریں جھکا کر کیچر کو دیکھا۔ وہ سلور کلر کا تھا، اس کے ایک طرف گول بڑا سا فیروزی رنگ کا پتھر جب کہ دوسری طرف سبز اور نیلا دو رنگا پتھر جڑا تھا۔

"اچھا ہے۔" اس نے خوب صورت کچر لینے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ افق نے وہ اس کی پر رکھنا چاہا، پکڑتے پکڑتے وہ زمین پر گر پڑا۔ وہ گھبرا کر جھکی اور کچر اٹھالیا۔ اس کے دو رنگ کے درمیان ضرب لگنے سے ایک ہلکی سی سیدھی لکیر پڑ گئی تھی۔

"ٹوٹ تو نہیں گیا؟" وہ پوچھ رہا تھا، اس نے نفی میں گردن کو جنبش دی پھر اسے نظر کر کے سیلز مین سے قیمت پوچھی۔

"دو سو پچاس روپے۔"

افق نے پیسے دکان دار کی طرف بڑھائے۔

"سوری، یہ میں خود خریدوں گی۔" اس نے دبی آواز میں اسے ٹوکا۔

"میں اس لالچ میں تمہیں یہ گفٹ کر رہا ہوں کہ کل تم بھی مجھے کوئی چیز گفٹ کرو گی۔"

"میں گفٹس نہ لیتی ہوں نہ دیتی ہوں۔" اس نے پرس سے پیسے نکالے۔

"مگر میں دیتا بھی ہوں اور لینا بھی پسند کرتا ہوں۔" وہ بضد تھا۔ اسے نظر انداز کر ہوئے اُس نے پیسے سیلز مین کو تھمائے۔ خاکی لفافے میں پیک کیا گیا کچر نکال کر بالوں میں اور نشاء کی طرف آگئی۔

ارسہ کے آنے اور نشاء کی شاپنگ مکمل ہو جانے کے بعد وہ لوگ باہر نکل آئے۔ باہر اند پھیل رہا تھا۔ شاپس کے اندر اور باہر روشنیاں جگمگانے لگی تھیں۔ سٹریٹ لائٹس اور سائن بورڈ روشن ہو گئے تھے۔

"رات کے کھانے کے لیے میں تم لوگوں کو پشاور کے بہترین ریسٹورنٹ لے چلوں؟" کے دائیں طرف، جیبوں میں ہاتھ ڈالے سامنے دیکھتے ہوئے چل رہا تھا۔ وہ اس کی جانب سے گریز کر رہی تھی۔

"پی سی؟" ارسہ نے جھٹ پوچھا۔

"نہیں، میں بدمزہ، باسی اور پھیکے کھانوں سے لطف اندوز نہیں ہوتا۔ میں تمہیں ایک بہتر لے کر جا رہا ہوں۔"

شہر کی تنگ و تاریک گلیوں سے ٹیکسی میں گزرتے ہوئے انہیں وہ ایک ایسی تنگ گلی میں آیا، جہاں بے تحاشا تیسرے درجے کے ریسٹورنٹ بنے ہوئے تھے۔ فضا میں ہر طرف مز خوشبو پھیلی تھی۔

وہ انہیں نمک منڈی لے آیا تھا۔ پریشے کو حیرت ہوئی، وہ اس کے ملک کو اس سے زیادہ جانتا تھا۔

نمک منڈی کی نمک والی کڑاہی کھا کر جب وہ لوگ وہاں سے نکلے، تو نشاء نے بے اختیار پوچھ لیا۔ "تم اگر ان جگہوں پر اتنی دفعہ گھوم چکے ہو تو اب پھر کیوں ادھر آئے ہو؟"

"یہی تو میں کہہ رہی تھی۔ اچھے بھلے ہم جولائی میں ہی راکاپوشی کلائمب شروع کر دیتے، خوامخواہ ادھر آنے کی کیا ضرورت تھی۔ پتا نہیں افق بھائی کو اچانک ان علاقوں کا وزٹ کرنے کا خیال کیوں آگیا اور مجھے بھی ساتھ گھسیٹ لائے۔" ارسہ بے اختیار بول اٹھی۔ افق نے کوئی جواب نہیں دیا۔

اپنے ہوٹل کے کمرے میں واپس آ کر نشاء پھر رطب اللسان تھی۔

"میں نے اتنا سوفٹ، نائس اور اچھا انسان زندگی میں پہلی دفعہ دیکھا ہے۔"

"اور نہیں تو کیا۔ جتنی معلومات ان علاقوں کے متعلق انہیں ہیں، میرا خیال ہے وہ ایک بہت کامیاب سفرنامہ نگار بن سکتے ہیں۔"

"رہنے دو ارسہ!" وہ جو ٹی وی ٹرالی کے قریب کھڑی بوتل منہ سے لگائے پانی پی رہی تھی، قدرے چڑ کر بوتل منہ سے ہٹا کر بولی۔ "یہ مغربی دنیا کے لوگ ہمارے ملک میں آ کر معلومات اس لیے اکٹھی نہیں کرتے کہ عالمی دنیا کو ہمارا سوفٹ امیج دکھائیں، بلکہ اگر تم ان گوروں کے سفرنامے اٹھا کر پڑھو تو تمہیں علم ہو کہ یہ لوگ ہمارے بارے میں کیا کیا زہر اگلتے ہیں۔ ہمیں جاہل، پسماندہ اور غیر ترقی یافتہ کہتے ہیں۔ تمہارے یہ افق ارسلان بھی ترکی جا کر یہی کام کریں گے۔ سفرنامہ لکھ کر عالمی برادری کو یہ بتائیں گے کہ ہمارا ملک کتنا قدامت پسند، غریب اور سہولیات سے نابلد ہے، یہاں کتنی گندگی اور بدنظمی ہے۔ یہ سارے ایک جیسے ہوتے ہیں، پروپیگنڈا کرنے والے۔"

بوتل رکھ کر وہ پلٹی تو ساکت رہ گئی۔ افق لب بھینچے دروازے کے بیچ کھڑا تھا۔ وہ یقیناً ٹیکسی کا کرایہ ادا کر کے انہیں شب بخیر کہنے آیا تھا اور چوں کہ وہ ارسہ کے لیے انگلش میں بات کر رہی تھی تو نہ سن لینے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

وہ یک دم تیز تیز قدم اٹھاتا راہداری سے واپس پلٹ گیا۔

نشاء اور ارسہ نے بے بسی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس کی ناراضی وہ محسوس کر چکی تھیں۔ احساس تو اسے بھی تھا۔ اندر سے وہ بہت پشیمان اور بے چین بھی تھی مگر خاموشی سے لیٹ

گئی اور تکیہ منہ پر رکھ لیا۔

''تمہارے پیسے!'' نشاء نے اس کی بیڈ سائیڈ ٹیبل پر 250 روپے رکھے تو اس نے
سے تکیہ چہرے سے ہٹایا۔

''کون سے پیسے؟'' ''وہ اس جیولری شاپ والے نے واپس کیے تھے۔ کہہ رہا تھا تم نے
دے دیئے ہیں۔ تم اس وقت ارسہ سے بات کر رہی تھیں، میں دینا بھول گئی۔''

اس کے انداز میں ہلکی سی خفگی تھی۔

وہ کچھ دیر تو کچھ بول ہی نہ سکی۔ کیچر جو اس نے بہت استحقاق سے لگا رکھا تھا، اس کی ا
اس شخص نے کی تھی جس کی وہ چند منٹ پہلے بے عزتی کر چکی تھی۔ اس کا دل چاہا کہ وہ ڈھ
روپے اسی وقت اس کے منہ پر مار آئے اور وہ مار بھی آتی مگر اس نے احمر صاحب کے ساتھ کم
کیا تھا اور پھر جو کچھ وہ کر چکی تھی سو اب مجبوری تھی۔ وہ خاموشی سے سونے کے لیے لیٹ گئی۔
اس نے پرس میں رکھ لیے، جتنا وہ اس سے دور بھاگنے کی کوشش کرتی، وہ اتنا اس کے راستے
جاتا تھا۔

☆......☆......☆

چوتھی چوٹی

پیر، 25 جولائی 2005ء

پوری رات بے چین و مضطرب رہنے کے باعث وہ ٹھیک سے سو نہیں سکی تھی، صبح خاصی دیر
ے آنکھ کھلی۔ دن چڑھ چکا تھا، اے سی کی ٹھنڈک کے باوجود سورج کی شعاعیں جو کھڑکیوں کے
ے کے پیچھے سے جھانک رہی تھیں، تپش پیدا کر رہی تھیں۔ اس نے کسل مندی سے کروٹ
ا۔ نشاء اور ارسہ کہیں جانے کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔

''مجھے چھوڑ کر جا رہے ہو تم لوگ؟'' بغیر کسی ''صبح بخیر'' کے اس نے لیٹے لیٹے ہی دونوں کو
طب کیا۔

''صبح سے ایک سو دس آوازیں دے چکی ہوں کہ اٹھ جاؤ، مگر تم پتا نہیں کون سے اصطبل سو رہی تھیں۔ ابھی ارسہ تم پر پانی چھینکنے لگی تھی۔'' وہاں سے بھی تڑ سے جواب آیا تھا۔ و ہوئے بغیر اٹھ کھڑی ہوئی۔

شہلا افتخار کو شاپنگ کے لیے جانا تھا، ان کی بہن کی شادی عید کے بعد تھی تو وہ اس کے کے لیے کوئی کراکری یا الیکٹرانک کا سامان خریدنا چاہتی تھی۔ نشاء کو بتایا تو اس نے فوراً ساتھ ہامی بھر لی۔

جب وہ سب باہر نکلے تو پریشے کی متلاشی نگاہیں افق کی تلاش میں ادھر ادھر بھٹکیں بے اختیار اسے اپنی رات والی حرکت یاد آئی تھی۔

''شرمندگی ورمندگی نہیں ہے مجھے، بلکہ ابھی تو مجھے وہ کچھ بھی اس کے منہ پر مارنا ملے تو نا!'' وہ شاید خود کو تسلی دے رہی تھی۔

''سنو ارسہ! کون کون جا رہا ہے حیات آباد؟'' بہت لاپروائی سے ٹیکسی کی طرف ہوئے اس نے ارسہ کو مخاطب کیا۔

''ہم سب!''

اب اس ''ہم سب'' میں وہ شامل تھا یا نہیں۔ وہ پوچھ نہیں سکتی تھی۔ ارسہ اور نشاء بتانے والے نہیں تھے۔ سو وہ خاموشی سے ان کے ساتھ چلتی رہی۔

پھر حیات آباد پہنچ کر بھی وہ خاموش ہی رہی۔ گرمی زوروں کی تھی، اوپر سے شہلا اور نشاء دکان داروں سے بحث سن کر ہی وہ اکتا گئی۔ شہلا کو ایک ڈنر سیٹ پسند آیا مگر وہ آٹھ ہزار کا تھا۔

''کچھ رعایت کرو بھائی! میں کوئی پہلی دفعہ آ رہی ہوں تمہاری دکان پر؟''

ابھی راستے میں ہی تو افتخار صاحب نے بتایا تھا کہ وہ اور شہلا حیات آباد چھوڑ پشا دفعہ آئے تھے۔

''باجی! ام سے قسم لے لو، یہ ڈنر سیٹ آپ کو پوری مارکیٹ میں اس سے کم کوئی نہیں خالص جاپان کا مال ہے اور باقی لوگ مارکیٹ میں چے نا (چائنا) کا مال رکھتا ہے۔ وا اٹھارہ انیس سالہ گورا چٹا لڑکا تھا، چہرے پر چھوٹی ڈاڑھی اور شلوار ٹخنوں سے اوپر تھی۔

شہلا نے ڈنر سیٹ چھ ہزار میں خریدا۔ دوسری دکان پر وہی ڈنر سیٹ تین ہزار

مگر پریشے کو یقین تھا کہ وہ ڈنر سیٹ چار پانچ سو سے زیادہ کا نہیں ہوگا۔ آخر چائنا اور افغانستان سے آنے والا اسمگل شدہ مال تھا۔

وہ حیات آباد کے پٹھان اور سکھ دکانداروں سے خاصی بور ہوئی تھی۔ شام کو جب وہ واپس آئی تب تک افق کا کوئی اتا پتا نہ تھا۔ وہ انتظار کرتی رہی کہ ارسہ اور نشاء اس کے بارے میں منہ سے کچھ پھوٹیں گی مگر وہ تو شاید اسے بھول بھی چکی تھیں۔

بے حد تھکاوٹ کے باوجود بھی پری سو نہ سکی۔ اگر وہ ناراض تھا تو وہ اسے منانے کا کوئی ارادہ نہیں رکھتی تھی، مگر وہ ایک دفعہ نظر تو آئے۔ کدھر چلا گیا تھا؟ شاید واپس؟ یہ خیال ہی بہت تکلیف دہ تھا۔ اگر وہ واپس چلا گیا تھا تو وہ ادھر کیا کر رہی تھی؟ اس کو بھی واپس چلے جانا چاہیے۔

''تو کیا وہ صرف افق کے لیے یہاں تک آئی تھی؟'' اس خیال نے اسے بے چین کر دیا تھا۔

''نہیں، میں تو ندا آپا سے......'' اس کی دلیل بہت کمزور تھی۔

رات کو نشاء اور ارسہ اسے پشاور کے مشہور ''جلیل کے چپل کباب'' کھلانے لے گئیں۔ افق کا کوئی پتا نہ تھا۔ اس پر ایک بے نام سی اداسی طاری تھی۔ وہ جو ایک دن بعد ہی بیچ راستے میں چھوڑ کر چلا گیا تھا، وہ اس کا خوابوں کا شہزادہ کیسے ہو سکتا تھا؟

جلیل کے اوپن ایئر ریسٹورنٹ میں سبز گھاس پر رکھی کرسی پر بیٹھی وہ یہی سوچ رہی تھی۔ لان کی طرز کے سبز گھاس سے ڈھکے قطعہ اراضی کے چاروں طرف سفید باڑ لگی تھی۔ رات کا وقت تھا، روشنی کے لیے باہر ایک دو ٹیوب لائٹس لگی تھیں اور یہ مدھم مدھم سی روشنی بہت اچھی لگ رہی تھی۔

''تمہیں کچھ اور لینا ہو تو بتا دو!'' نشاء نے اس کی رائے مانگی۔ اس نے چونک کر نشاء اور وردی ویٹر کو دیکھا پھر نفی میں سر ہلا دیا۔ وہ تو ٹھیک سے سن بھی نہ پائی تھی کہ ارسہ اور نشاء نے کیا آرڈر دیا تھا، بج اور شاید چپل کباب...... اس کا دماغ تو سیف اور افق کے درمیان پھنسا تھا۔

''معاف کرنا لڑکیو! میں ہرگز دیر سے نہیں آنا چاہتا تھا، مگر مجھے راستے میں ایک دلچسپ آدمی مل گیا، جو کسی زمانے میں پورٹر تھا۔ اس سے باتیں کرتے ہوئے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا۔ بہت معذرت!''

نہایت عجلت میں ہمیشہ کی طرح بشاش لہجے میں کہتے ہوئے اس دراز قد اور ستواں ناک والے ترک سیاح نے ارسہ کے ساتھ والی کرسی سنبھالی۔ ایک لمحے کو تو پریشے کا دل اچھل کر حلق میں

آ گیا تھا، مگر دوسرے ہی لمحے وہ شانت ہوگئی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کا کوئی گمشدہ حصہ ا مل گیا ہو۔

وہ آ گیا تھا، وہ اسے چھوڑ کر نہیں گیا تھا، یہ احساس ہی اس کی دن بھر کی مضمحل طبیع دینے کو کافی تھا۔ وہ ایک دم اتنی پرسکون ہوگئی تھی کہ اسے بے اختیار خود پر بھی حیرت ہوئی۔

''اچھا...... وہ کیا کہہ رہا تھا؟'' ارسہ نے بہت دلچسپی سے پوچھا۔ وہ ایسے بیٹھے تھے کے بائیں طرف نشاء اور سامنے افق تھا اور نشاء کے سامنے ارسہ بیٹھی تھی۔

افق مسکراتے ہوئے اسے وہ باتیں بتانے لگا، جو اسے اس پورٹر سے معلوم ہوئی تھیں دفعہ بھی اس نے نظر اٹھا کر پریشے کو نہیں دیکھا تھا۔

''اور نشاء تمہارا دن کیسا گزرا۔ ''کارخانہ بازار'' میں دماغ تو خالی ہوگیا ہوگا اب تک اس نے رخ سیدھا کر کے نشاء کو مخاطب کیا۔ پریشے کو وہ مکمل طور پر نظرانداز کر رہا تھا۔

''بہت تھکا دینے والا ایک آدمی پندرہ ہزار کا قالین بیچ رہا تھا، میں نے جان چھڑا پندرہ سو میں دے دو اور کیا تم یقین کرو گے، وہ بولا کہ ہاں لے لو! میرے خدایا۔''

افق لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ لیے بہت دھیان سے سن رہا تھا۔ خود کو یوں نظرانداز ہو کر وہ اپنے ناخنوں سے کھیلنے لگی، اس کے انداز میں اضطراب تھا۔

وہ بات کرتا تھا تو وہ رکھائی برتتی تھی۔ اب وہ دور ہو رہا تھا تو وہ بہت بے چین ہو اگرچہ بظاہر بے نیاز تھی۔

ویٹر ہاتھ میں پکڑی بڑی سی ٹرے لیے ان کی میز پر پہنچا تو اس نے چہرہ اونچا کیا سیدھی افق پر پڑی۔ وہ ویٹر کی طرف متوجہ تھا۔ آج اس نے گرے شرٹ اور بلیک پینٹ تھی۔ سفید جیکٹ اور سرخ مفلر غائب تھا۔ گرے شرٹ کی آستینیں کہنیوں تک فولڈ کر ر کیپ میں بھورے بال چھپ گئے تھے۔

''میں نے تمہیں جلیل ریسٹورنٹ کا اس لیے کہا تھا کیوں کہ مجھے ان کے چپلی کباب ان کے نان زیادہ پسند ہیں۔'' سفید، بے حد سفید، آنسو کی شکل کے نان پلیٹ میں نکالتے مسلسل بول رہا تھا۔ اس کی بات سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ سارا پروگرام ان تینوں کا طے شدہ وہی لاعلم تھی۔

پریشے کے قدموں کے قریب ایک سفید بلی چکراتی پھر رہی تھی۔ اسے دیکھ کر اسے اپنی بلی یاد آ گئی، ساتھ ساتھ روشان اور سنی کا رویہ بھی یاد آیا۔ اس نے تھوڑا سا کباب توڑ کر نیچے گھاس پر پھینکا، بلی نے جھٹ اسے منہ میں ڈال لیا، وہ مسکرا دی۔ اب وہ ایک نوالہ خود لیتی اور ایک بلی کو دیتی۔ وہ اپنے تئیں افق کو ذہن سے جھٹکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''میں پچھلی دفعہ ادھر آئی تھی تو جلیل بھی آئی تھی مگر وہ یہ والا نہیں تھا۔'' ارسہ کہہ رہی تھی۔

''یہاں ایک سے زیادہ جلیل ہیں۔ بہرحال یہ جلیل اوریجنل ہے۔'' وہ واقعی ان کے ملک کو بہت زیادہ جانتا تھا۔

''ویسے افق بھائی! آپ کو دیکھ کر لگتا نہیں ہے کہ آپ اتنا کھاتے ہیں۔ ایک کوہ پیما کے لیے یہ خاصی عجیب بات ہے۔''

''دیکھو، میرا زندگی کا فلسفہ یہ ہے کہ دنیا میں دو طرح کے لوگ ہوتے ہیں، ایک وہ جو کھا کر مرتے ہیں اور دوسرے وہ جو بغیر کھائے مرتے ہیں۔ مرنا سب نے ہے، سو بہتر ہے کہ کھا کر مرا جائے۔''

وہ سر جھکائے بلی کو کباب کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے کھلا رہی تھی۔

''ویسے آپ نے سارا دن کیا کیا؟ ہمارے بغیر بور تو ہوئے ہوں گے ناں؟''

''قطعاً نہیں۔ میں میوزیم اور دیگر ٹورسٹ اٹریکشنز دیکھ آیا ہوں اور میں نے خوب مزا کیا، جو آزادی تنہائی میں ہوتی ہے، وہ یقین جانو دو لڑکیوں کے ساتھ ہرگز نہیں مل سکتی۔''

اس نے تین کے بجائے دو لڑکیاں کہا تھا، اس کے دل کو تکلیف ہوئی تھی۔

''آپ نے چاول وغیرہ لے لیے؟''

''ہاں۔''

''اور مچھلی بھی؟''

''او ہو ارسہ...... میں بچہ نہیں ہوں۔ پچھلے چودہ سال سے کوہ پیمائی کر رہا ہوں۔'' وہ بے اختیار ہنسا تھا۔ ''میں نے فوڈ سپلائی بالکل درست رکھی ہے، انشاءاللہ ہم راکاپوشی کی چوٹی پر بھوک سے نہیں مریں گے۔''

ویٹر بل لے آیا تھا، افق نے بل خود ادا کیا۔ وہ ان کے ہمراہ ہوتا تو ریسٹورنٹ کا بل، ٹیکسی کا بل اور ٹپ وغیرہ خود دیتا تھا۔ نشاء نے بہت دفعہ ٹوکنے کی کوشش کی، مگر اس معاملے میں وہ خاصی انا

والا تھا۔ اب بھی اس نے سو روپیہ ٹپ رکھی تو ویٹر حیران سا ہو گیا۔

"یہ کیا ہے سر؟"

"رکھ لو نیور مائنڈ!" وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ بلی جس کا پیٹ آدھا چپل کباب کھا کر بھی نہیں بھ پریشے کے قدموں کے ساتھ لوٹنے لگی۔ وہ البتہ اچنبھے سے ویٹر کی حیرانی کو دیکھ رہی تھی۔ یہ بعد میں علم ہوا تھا کہ پشاور میں ٹپ یا بخشش کا کوئی رواج نہ تھا۔

وہ پرس اٹھا کر دو قدم آگے بڑھی تو بلی نے بے اختیار میاؤں کی آواز نکالی۔ اس نے کر پیچھے دیکھا، افق میز کے پیچھے سے نکل کر آ رہا تھا۔ افق نے اس کی نگاہوں کے تعاقب بلی کو دیکھا۔

"اوہ ہاؤ سوئیٹ!" جھک کر اس نے بایاں بازو بڑھایا اور بلی کو اٹھا لیا۔ اب وہ اس کی نر ہاتھ پھیرتے ہوئے اسے پیار کر رہا تھا۔ ٹیوب لائٹ کی دور سے آتی مدھم روشنی اور چاند کی چ اس کے چہرے کے نقوش کو بہت خوب صورت بنا رہی تھی۔

بلی نے اس کے پیار کا خاصا بُرا منایا۔ وہ ایک دم چھلانگ لگا کر پریشے کے قدموں میں اور اپنی کمر اور دم اس کے پاؤں سے رگڑنے لگی۔ اس نے چونک کر قدموں میں لوٹتی بلی کو دیکھ پھر گردن اٹھا کر افق کو، وہ بلی پر ایک نگاہ ڈالتا سائیڈ سے نکل گیا تھا۔

اسے بے اختیار رونا سا آیا۔ وہ ایسا کیوں کر رہا تھا؟ اتنی بے اعتنائی اور بے رخی کیوں رہا تھا؟

جھک کر اس نے بلی کی سفید، نرم کھال پر چمکارنے والے انداز میں ہاتھ پھیرا۔ اسی کھا ابھی افق نے چھوا تھا۔ اس کے لمس کی تمازت اسے محسوس ہوئی تھی، اس نے ہاتھ کھینچ لیا اور بھاگتی ہوئی ریسٹورنٹ سے باہر نکل آئی، جہاں وہ سب کھڑے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ البتہ ایک چھوٹے سے بچے کی جانب متوجہ تھا، جو بھیک مانگ رہا تھا۔ اس کا لباس ابتر اور پا ننگے تھے۔

"یہ لو اور ان سے شوز خریدنا۔" افق نے پانچ سو کا نوٹ بچے کی طرف بڑھایا۔ بچے نے جھپٹ لیا اور تیزی سے وہاں سے بھاگ گیا کہ کہیں وہ واپس نہ مانگ لے۔ افق بے چینی فکر مندی سے اس کو بھاگتے دیکھتا رہا پھر اس نے بے اختیار سر جھٹکا۔

"کاش میں ان پہاڑوں میں بسنے والے بچوں کے لیے کچھ کر سکوں۔"

وہ خاموشی سے لب کاٹتی، سر جھکائے ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔

☆......☆......☆

منگل، 26 جولائی 2005ء

ہوٹل کی لابی میں استقبالیہ ڈیسک کے سامنے دیوار کے ساتھ چند صوفے رکھے تھے۔ وہ ایک صوفے پر ٹانگ رکھے بیٹھی اخبار دیکھ رہی تھی۔

شہ سرخیوں پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے وہ باقی لوگوں کے نیچے اترنے کا انتظار کر رہی تھی۔ ظفر پہلے ہی باہر بس کے ساتھ کھڑا تھا۔ اس کے علاوہ ابھی تک سب اوپر تھے۔

"انٹرنیشنل کال ریلیز ہے۔" انگریزی لب و لہجہ اس کی سماعت سے ٹکرایا۔ اخبار پڑھتے پڑھتے اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ اس کی جانب کمر کیے استقبالیہ ڈیسک پر کہنی رکھے قدرے جھک کر استقبالیہ کلرک سے کہہ رہا تھا۔ اس کی گردن کے پچھلے حصے میں اسے سرخ مفلر دکھائی دے رہا تھا، بھورے بالوں پر پی کیپ بھی تھی۔ اس نے شاید ابھی تک پریشے کو نہیں دیکھا تھا۔

اسے بے اختیار اس کا رات والا مغرور اور بے رخی بھرا انداز یاد آ گیا۔ اس نے نظریں جھکا لیں۔

افق نے ڈیسک کلرک کو ایک لمبا چوڑا نمبر بتایا، کلرک نے سلسلہ ملنے پر ریسیور افق کو تھما دیا۔

"سلام علیکم آنے۔" اپنے مخصوص ترک لب و لہجے میں وہ اپنی زبان میں بہت پر جوش انداز میں بات کر رہا تھا۔ آخر میں اس نے "گلے گلے آنے" کہہ کر ریسیور رکھ دیا۔

"ایک کال اور کرنی ہے۔" اس نے دوبارہ ایک اور لمبا چوڑا نمبر ملایا۔

"مرحبا، از دس تو ماز؟ آئی ایم ارسلان۔ کین آئی سپیک ٹو مسٹر جینیک یقین پلیز؟" وہ کسی "جینیک یقین" سے بات کرنا چاہ رہا تھا۔

مطلوبہ شخص شاید لائن پر آ گیا تھا، وہ یک دم بہت بے تکلف انداز میں بات کرنے لگا۔ انگریزی کے چند جملوں کے باعث وہ اتنا سمجھ چکی تھی کہ مخاطب سے اس کی خاصی بے تکلفی تھی اور وہ اس کو اپنے پشاور سے سوات جانے کے بارے میں آگاہ کر رہا تھا۔ دوسری جانب سے کسی نے کچھ کہا تو وہ بے اختیار ہنس پڑا اور بولا "میں نے بچپن میں قصے کہانیوں میں جو بات پڑھی تھی، وہ آج سچ ہو گئی ہے۔ یقین کرو، قراقرم کے پہاڑوں پر واقعی پریاں اترتی ہیں۔"

پریشے کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں جکڑ لیا تھا، اس کے ہاتھوں پر نمی در آئی تھی۔ اس نے گھ
چہرہ بالکل جھکا کر اخبار آگے کر لیا۔ وہ یقیناً اس کی موجودگی سے بے خبر، اب اپنی مادری زبان
الوداعی کلمات ادا کر رہا تھا۔ گلے گلے کہہ کر اس نے ریسیور رکھا، پیسے ادا کیے، بقیہ رقم بٹو
ڈالی اور بٹوہ جیب میں رکھتے ہوئے پلٹا ہی تھا کہ اسے وہاں بیٹھے دیکھ کر ٹھٹکا۔ پریشے نے اپنا
جھکایا ہوا تھا کہ وہ اس کے چہرے کی اڑی اڑی رنگت نہیں دیکھ سکتا تھا۔ وہ بس ایک لمحے کو وہا
اور پھر باہر نکل گیا۔

اس نے اخبار میز پر رکھ دیا اور اپنا سر دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔ یہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا
وہ جسے اس کی بے رخی اور بے اعتنائی سمجھ رہی تھی، وہ سوائے ایک مصنوعی خول کے کچھ نہ تھا؟ ا
خود مسلسل تین دن سے اس کے متعلق کیوں سوچے جا رہی تھی۔ وہ ایک منگنی شدہ لڑکی تھی، حالا
منگنی کوئی شرعی تعلق نہ تھا پھر بھی اسے لگتا تھا کہ اسے سیف کے علاوہ کسی کے متعلق نہیں
چاہیے۔ وہ اسی لیے اسے خود سے دور رکھ رہی تھی، وہ دراصل خود سے لڑ رہی تھی۔ پچھلے تین دن
جاری اس اعصابی جنگ میں اب وہ تھکنے لگی تھی۔

وہ کب بس میں بیٹھی بس کب چلی، اسے کچھ ہوش نہ تھا۔ اس نے سیٹ کی پشت سے
لگا کر آنکھیں موند لیں۔

زندگی کی سچائیاں اور حقیقتیں کتنی تلخ ہوتی ہیں۔ وہ قفس میں قید تھی اور اپنی مرضی سے سوچ
نہیں سکتی تھی۔ نومبر میں اس کی شادی سیف جیسے ناپسندیدہ شخص سے ہو جائے گی۔ وہ کس طرح
زندگی گزارے گی اس سطحی انسان کے ساتھ؟ وہ اس کے لیے نہیں بنا تھا۔ وہ اس کے لیے بنا
نہیں گیا تھا۔

اس لمحے جب ٹور کمپنی کی بس صاف ستھری، کشادہ سڑک پر دوڑتی ہوئی پشاور کی حدود
باہر نکل رہی تھی تو پریشے کے ذہن میں بس ایک ہی فقرے کی بازگشت گونج رہی تھی۔

"قراقرم کے پہاڑوں پر پریاں اترتی ہیں۔"

وہ بند آنکھوں سے مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ بہت سوگوار تھی۔ "قراقرم کے پہاڑ
پریاں اترتی ہیں افق ارسلان، مگر وہ صرف سیف الملوک تک محدود ہو جاتی ہیں۔ پردیسی کوہ
کے لیے پریاں نہیں ہوتیں۔"

اس نے آنکھیں کھول کر دائیں جانب دیکھا۔ اس کے ساتھ نشاء بیٹھی تھی۔ نشاء کے دائیں
نب برابر والی قطار میں افق ترچھا ہو کر بیٹھا نشاء سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ خاصے خوشگوار موڈ میں
ا۔ پریشے کو جاگتے دیکھ کر اس نے ایک دوستانہ مسکراہٹ اس کی جانب اچھالی۔

"ہماری گفتگو سے تم ڈسٹرب تو نہیں ہو رہیں؟" کل رات والی اکڑ، بے نیازی، بے اعتنائی
ب غائب تھا۔ وہ واقعی اس کو نہیں سمجھ پائی تھی۔

"نہیں۔" مختصراً کہہ کر اس نے رخ کھڑکی کی طرف پھیر لیا۔ شاید وہ بھی خود سے لڑتے
تے عاجز آ چکا تھا یا پھر شاید کل رات والا رویہ محض اس کی پرسوں رات والی تقریر کے جواب
ں ناراضی کا اظہار تھا یا پھر شاید وہ سب کچھ بھی نہیں تھا۔ وہ اس کے متعلق کوئی احساس ہی نہیں
کھتا تھا۔

اس کا ذہن منفی انداز میں سوچنے لگا تھا۔

"میں غلط سوچ رہی ہوں۔ وہ نشاء اور ارسہ سے بات کرتا ہے، مجھ سے نہیں پھر میں نے
کیسے فرض کر لیا کہ وہ میرے متعلق کوئی خاص جذبہ رکھتا ہے؟ وہ تو نگر نگر پھرنے والا ایک مسافر
ہے، جو دنیا کے سب سے حسین پہاڑ کو سر کرنے کا عزم لیے میرے دیس آیا ہے اور چند دن ان
خوب صورت وادیوں، چشموں اور پہاڑوں کے درمیان بتا کر اسے یہاں سے چلے جانا ہے۔ وہ
جانے کے لیے ہی تو آیا ہے پھر میں اتنی جذباتی کیوں ہو رہی ہوں؟ مجھے اس کے ساتھ نارمل
رویہ اختیار کرنا چاہیے۔"

وہ اس کا ہم سفر تھا، وہ کیوں خواہ مخواہ کی خود سے جنگ لڑ رہی تھی؟ افق کو تو واپس ترکی جا کر
شاید یہ یاد بھی نہ رہے کہ مارگلہ کے پہاڑوں پر جب بادل اترے ہوئے تھے تو گھوڑا دوڑاتے
بیچ سڑک پر اسے کوئی لڑکی ملی تھی۔ سیاح تو بہت کٹھور ہوتا ہے، خوب صورت مناظر پلکوں میں
جذب کر کے اپنے دیس لوٹ جاتا ہے، پھر پلٹ کر نہیں آتا۔ تو وہ کیوں اپنے اندر کوئی جذبہ
پالنے لگی تھی؟

اس کا دل قدرے ہلکا ہوا تھا۔ کوئی پریشانی جیسے ختم ہو گئی تھی۔ اگر اس کے اندر کوئی جذبہ پنپ
بھی رہا تھا تو اس نے اس قطرے جتنے جذبے کو سختی سے سیپ میں بند کر کے اپنے دل کے وسیع
سمندر میں دفن کر دیا۔

"گاڑی کا انجن قدرے گرم ہوگیا ہے۔ میں نے سوچا اس میں پانی ڈال لوں، آپ آس پاس گھوم پھر لیں۔"

گاڑی اچانک روک کر ظفر نے وضاحت دی۔

وہ دوسرے مسافروں کے ہمراہ بس سے باہر نکلی تو اسے احساس ہوا کہ بس کافی دیر کے پہاڑوں پر چڑھ چکی تھی۔ اس وقت بھی وہ درگئی کے سرخ اور بھورے خشک پہاڑوں تھے۔ سڑک کشادہ تھی، دائیں جانب کھائی اور بائیں جانب پہاڑ تھے۔

ظفر بس کا تیل پانی چیک کرنے لگا۔ افتخار صاحب اور شہلا قریب موجود واحد کھوکھے کولڈ ڈرنک کارنر تھا، پر چلے گئے۔ احمر انکل تصویریں کھینچنے لگے، افق بھی تصویریں بنا رہا تھا۔

وہاں سڑک خالی ہی تھی۔ چند منٹ بعد کوئی ٹرک یا کار گزر جاتی تھی۔ صبح ساڑھے آٹھ وقت تھا۔ موسم پشاور کی نسبت خوشگوار تھا۔

"سنو پریشے!" وہ پہاڑ کے دہانے پر ایک سرخ پتھر پر اپنے قیمتی سوٹ کی پروا ہوئے خاموش بیٹھی تھی، جب افق نے اسے آواز دی۔ اس نے سر اٹھا کر افق کو دیکھا۔ وہ کیمرہ میں ڈال کر اسی کی طرف آرہا تھا۔

وہ ہلکی سی مسکراہٹ کے ساتھ کھڑی ہوگئی۔ "سن رہی ہوں، تم بولو۔" خود سے اعصابی ترک کر کے اور مصنوعی خول اتار کے وہ خاصی ہلکی ہوگئی تھی۔

"تم شرط لگاؤ گی میرے ساتھ؟" وہ کل سے مختلف اصلی والا افق لگ رہا تھا۔

"بالکل! کیوں کہ مجھے پتا ہے میں جیت جاؤں گی۔" وہ پچھلے تینوں دنوں سے مختلف بالکل اصلی والی پریشے تھی۔

"اوہ! اتنی خود پسندی؟" وہ مسکرایا۔

"خود پسندی نہیں، خود اعتمادی کہو۔"

"فائن! تم پلیز ایک شرط لگاؤ گی؟" افق کا انداز ایسا تھا جیسے وہ بچپن سے دوست رہے ہوں۔

"ہاں اب بتا بھی دو!"

"وہ اوپر جھاڑی دیکھ رہی ہو، وہ تقریباً یہاں سے چالیس فٹ اونچی ہے۔ تم میرے ایک ریس لگاؤ، دیکھتے ہیں اوپر پہلے کون پہنچتا ہے۔" افق نے ہاتھ سے اوپر جھاڑی کی طرف

کیا۔

"ایک مخلصانہ مشورہ دوں؟ اگر تم اسی وقت یہاں سے نیچے چھلانگ لگا دو تو یقین کرو بہت جلدی اوپر پہنچو گے۔"

"ویری فنی! میں ارسہ اور نشاء کو بلاتا ہوں، وہ جج ہوں گی۔" وہ پلٹ کر ان دونوں کو بلانے چلا گیا۔

"جو جیتے گا اسے کیا ملے گا؟" ان تینوں کے واپس آنے پر پریشے نے پوچھا۔ نشاء کو اس کے رویے کی تبدیلی پر خوشگوار حیرت ہوئی تھی۔ "مرسڈیز بینز؟"

"نہیں، تبت کا ریٹرن ٹکٹ۔" ارسہ فوراً بولی۔

"پوری دنیا امریکا، انگلینڈ جانے کی خواہش کرتی ہے، لیکن تم کوہ پیما تبت سے آگے مت بڑھنا۔" نشاء ان لوگوں میں سے تھی، جن کا کوہ پیمائی کے متعلق علم کلف ہینگر اور ورٹیکل لمٹ جیسی فلموں تک محدود تھا، البتہ تبت کو وہ تبت سنو کریم کے حوالے سے تھوڑا زیادہ جانتی تھی۔

"اچھا خاموش رہو تم دونوں۔ میں بتاتا ہوں جو ہارے گا اسے جیتنے والے کا ڈیئر (dare) پورا کرنا ہوگا۔ ٹھیک؟"

"ٹھیک تم میرا dare پورا کرنے کے لیے تیار رہنا۔" وہ اعتماد سے مسکرائی۔

"دیکھتے ہیں مادام!" اس کا انداز بھی بہت چیلنجنگ تھا۔

"اب شروع کرو، اس سے پہلے کہ دوسری ٹریفک آئے اور لوگ تمہارے اس بچگانہ ایڈونچر کو دیکھیں۔"

پھر ان کا پہاڑوں پر پہلا ایڈونچر شروع ہوا۔

وہ خاصی پراعتماد تھی، مگر چار سال سے وہ پہاڑوں پر نہیں چڑھی تھی، نتیجتاً وہ قدرے سست تھی اور ان خاردار کانٹوں اور جھاڑیوں کی پروا نہ کرتے ہوئے بہت تیزی سے اپنے مطلوبہ ہدف تک پہنچ گیا تھا۔ وہ چند فٹ ہی پیچھے رہ گئی تھی۔

"میں جیت چکا ہوں۔" جھاڑی کو چھو کر وہ ناہموار ڈھلان میں سے راستہ بناتا اس کے قریب آیا۔ شکست کے احساس سے اس کے اندر کی کوہ پیما لڑکی خاصی بری طرح مجروح ہوئی تھی۔

"میں مشکل راستے سے آرہی تھی جب کہ جس جگہ سے تم چڑھے تھے، وہ مقامی لوگوں کا بنایا گیا ہموار راستہ ہے اور اس سے چڑھنا خاصا آسان ہے۔"

"مادام، جب زندگی ایک آسان راستہ دے رہی ہو تو کٹھن راستوں سے سفر نہیں کیا کرتے۔ منزل ایک ہی تھی تو راستہ بھی میرے والا ہی چنتیں!"

پریشے نے شانے اچکا دیئے۔ "میں ہار مانتی ہوں۔ بہر حال تم شاعری اچھی کر لیتے ہو۔" اپنے جوگرز نیچے والے پتھر پر رکھ کر اترنے لگی۔ اترائی، چڑھائی کی نسبت زیادہ مشکل تھی۔

"شکریہ اور تمہیں میرا ڈیئر تو پورا کرنا پڑے گا۔" وہ اس کے عقب میں اتر رہا تھا۔

"بہتر ہے کہ وہ آپ سوات پہنچ کر ہی بتائیں، کیوں کہ ظفر بلا رہا ہے۔" ارسہ نے ان کی اشارہ کرتے ظفر کی طرف دلائی۔

"سوات کتنی دور ہو گا یہاں سے؟" اپنی قمیص کے دامن سے چپکا ایک کانٹا الگ کر ہوئے پریشے نے پوچھا۔

"دو گھنٹے۔" جواب افق کی جانب سے آیا تھا۔ وہ اُف کر کے رہ گئی۔ وہ ہر جگہ کا جغرافیہ چکا تھا۔

"کبھی میں ترکی آئی ناں تو تمہارے ملک کے چپے چپے کا نام حفظ کر کے تمہیں بھی امپریس کروں گی۔" بس کی طرف جاتے ہوئے وہ بولی۔ افق اس کے آگے تھا، اس کا دروازے پر تھا، اس کی بات سن کر وہ ٹھٹک کر پلٹا۔

"کب آؤ گی ترکی؟" اس کے لہجے میں خوشی اور آنکھوں میں امید تھی۔ وہ ہنس پڑی۔

"میں مذاق کر رہی تھی۔"

اس کی آنکھوں کی جوت یک دم بجھ گئی۔

"اچھا۔" وہ اسے راستہ دینے کو پیچھے ہوا، وہ دروازے کے ساتھ لگی راڈ پکڑ کر اندر چڑھی اسی وقت وہ بہت مدھم آواز میں بولا۔

"سنو، تم ہنستے ہوئے اچھی لگتی ہو۔ ہنستی رہا کرو!"

پریشے کے چہرے سے مسکراہٹ یک دم غائب ہو گئی۔ اس کی بھنویں تن گئیں۔ وہ تیزی اپنی جگہ پر بیٹھی اور سختی سے لب بھینچے کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ وہ اس کے موڈ کی خرابی کو دیکھ نہ سکا۔

تقریباً ساڑھے دس کے قریب وہ لوگ ان پہاڑوں تک پہنچ چکے تھے، جن کے دامن وادی سوات کا خوب صورت دریا، دریائے سوات بہتا تھا۔

"یہ انسانی فطرت ہے کہ پانی کے قریب جا کر وہ خود کو بہت ہشاش بشاش محسوس کرتا ہے۔ مگر تا جب ہم دریا کے قریب ہوتے ہیں تو خود کو بہت تازہ دم محسوس کرتے ہیں۔" آواز بہت اجنبی تھی۔ پریشے نے تعجب سے سر گھما کر پیچھے دیکھا کہ یہ بات کس نے کہی ہے۔ اسے حیرت ہوئی تھی کیوں کہ یہ افتخار صاحب تھے۔

"یہ بولتے بھی ہیں؟ میں تو سمجھتی تھی گونگے ہیں۔" نشاء نے بہت متعجب انداز میں اس کے کان کے قریب سرگوشی کی۔ اس کے لبوں سے ہنسی کا فوارہ چھوٹا تھا۔ سب نے...... یہاں تک کہ ڈرائیو کرتے ظفر نے بھی اس کی طرف دیکھا۔ وہ ہنسی کنٹرول کرنے کی کوشش کے باوجود ہنستی چلی جا رہی تھی۔ افق اس کو یوں بچوں کی طرح ہنستے دیکھ کر مسکرایا۔ اس کی ہنسی تھم گئی، وہ سختی سے لب بھینچ کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

"نشاء! اپنی دوست سے کہو اس کی کھڑکی کے باہر خشک پہاڑ ہیں، دریا تو بائیں طرف بہہ رہا ہے۔ وہ کس کو دیکھ رہی ہے؟" وہ نشاء کے ساتھ والی نشست پر تھا، اس کی اور نشاء کی نشست کے بیچ درمیانی راستہ تھا۔ وہ ایک جوگر اگلی نشست کی پشت پر اور دوسرا درمیانی راستے میں رکھے قدرے جھک کر آہستہ سے نشاء سے بولا۔ "پری! تمہاری کھڑکی کے باہر خشک پہاڑ ہیں، دریا تو بائیں طرف بہہ رہا ہے تم کس کو دیکھ رہی ہو؟"

"پہاڑوں کو!" اس نے چہرہ موڑے بغیر سنجیدگی سے کہا۔

"لگتا ہے ڈاکٹر کا موڈ پھر سے خراب ہو گیا ہے۔ ویسے ان کو یہ دورے دن میں کتنی دفعہ پڑتے ہیں؟"

"جتنی دفعہ کوئی عامیانہ انداز میں میری تعریف کرے۔" کھٹ سے جواب آیا تھا۔

"اوہ!" وہ سمجھ گیا تھا۔ "میں تو بس دل رکھنے کو کہہ رہا تھا تاکہ تم ہنستی رہو اور اتنی غصے والی کھڑی کھڑی سی شکل ہر وقت نہ بنائے رکھو۔ تمہیں برا لگا؟"

"ہاں!" وہ ابھی تک کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

افق نے بمشکل مسکراہٹ لبوں تک روکی تھی۔ "بہت معذرت میں آئندہ ایسے جھوٹ بولنے کی ہمت نہیں کروں گا۔"

"تمہارے حق میں یہی ٹھیک رہے گا۔"

''بہتر! اب اس طرف دیکھ لو۔ دریا بہت خوب صورت لگ رہا ہے۔''

اس نے گردن کو بائیں جانب جنبش دی، افق مسکراہٹ چھپانے کو چہرہ اپنی کھڑکی کے پار نگاہ دوڑائی اور پھر نگاہ پلٹ کر

سبزے سے ڈھکے سبز پہاڑوں کے درمیان، سڑک سے کوئی سو میٹر نیچے، بل کھاتا رہا تھا۔ اس کا پاٹ کسی ندی سے تھوڑا سا ہی زیادہ چوڑا تھا۔ پانی بے حد نیلا تھا، جس کے جھاگ پتھروں سے ٹکرانے کے باعث پیدا ہو رہے تھے۔ کسی نیلے سانپ کی طرح بل کھا کہ سڑک سے خاصا نشیب میں تھا مگر اس میں رکھے دیو قامت پتھروں سے ٹکراتے پانی کا بلند تھا۔ سوات اور کالام میں یہ شور آپ کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔

دریا کے دونوں طرف کے پہاڑ سر سبز تھے جن پر مقامی لوگوں نے فصلیں اُگا رکھ پہاڑوں کی ڈھلان ہموار نہیں ہوتی، سو فصلیں بھی سیڑھیوں کی شکل میں اگائی گئی تھیں۔ یوں ہوتا تھا کہ جیسے چوٹی تک جانے کے لیے بے شمار سبز زینے سے بنے تھے۔

کبل سے گزر کر جس وقت بس مینگورہ میں داخل ہوئی وہ اپنی اور افق کی گفتگو بھلا دراصل وہ نیلا دریا اتنا خوب صورت تھا کہ وہ اس پر سے نگاہ ہی نہ ہٹا پا رہی تھی۔

پھر بس شہر میں داخل ہوئی۔ سیرینہ ہوٹل، سیدو شریف کی عمارت کے قریب سے ٹرن بس ''مرغزار'' کی جانب روانہ ہو گئی جہاں کے فائیو سٹار ہوٹل میں ان کی بکنگ تھی۔

''ظفر! وہ ہوٹل رائل پیلس کہاں گیا؟'' افق کھڑکی سے باہر متلاشی نظروں سے کچھ ڈھونڈ

''سر! وہ جو والئی سوات کا محل تھا؟''

''ہاں وہی۔''

''وہ تو اب کوئی ٹیوشن اکیڈمی بن چکا ہے۔'' ظفر کے انداز سے لگ رہا تھا کہ ا سوات کا یہ اقدام پسند نہیں آیا۔ ''ویسے سر! قسم سے وہ بہت خوب صورت ہوٹل تھا۔''

''ہاں، وہ بہت خوب صورت تھا۔ میں دو سال پہلے ادھر آیا تھا تو ایک دن رہا تھا وہاں ٹیوشن سنٹر بنا کر والئی سوات نے اچھا نہیں کیا۔''

پری نے چونک کر افسوس سے سر ہلاتے افق کو دیکھا۔ پرسوں شام جب نشاء نے

دو برس قبل پاکستان آنے کے متعلق استفسار کیا تھا تو وہ ٹال گیا تھا۔ وہ دو سال پہلے یہاں کیوں آیا تھا؟ ایسا کون سا کام تھا جس کے متعلق وہ نہیں بتاتا تھا؟ اسے الجھن کے ساتھ ساتھ تجسس بھی ہوا تھا۔

''ایسے کیا دیکھ رہی ہو؟'' وہ الجھن کے عالم میں افق کو دیکھ رہی تھی تو اس نے مسکرا کر ٹوکا۔

''کچھ نہیں۔'' وہ سر جھٹک کر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

مرغزار جانے والا راستہ شہر سے دور ہٹ کر خاصا سنسان اور پُرسکون سا تھا۔ دور دور تک ان کی بس کے علاوہ کوئی گاڑی نہیں تھی۔ ہر طرف اتنا سکوت اور ویرانہ سا تھا کہ پریشے کو لگا ظفر راستہ بھول گیا ہے۔ وہ یقیناً کسی انجان وادی میں بھٹک رہے ہیں، مگر ہر کلومیٹر بعد ''وائٹ پیلس اتنے کلومیٹر دور'' کا بورڈ اس کے دل کو تسلی دیتا تھا۔

''ہوٹل مینجمنٹ کے نقطۂ نظر سے وائٹ پیلس کی لوکیشن زبردست ہے۔ آبادی سے بہت دور اس مرغزار میں یہ واحد ہوٹل ہے کہ جب ٹورسٹ کئی کلومیٹر سفر کر کے تھکا ہارا ہوٹل تک پہنچتا ہے تو اس کے آسمان کو چھوتے کرائے سن کر بھی واپس پلٹنے کی ہمت خود میں نہیں پاتا...... ظفر ایک منٹ گاڑی روکو۔'' وہ ہوٹل کی لوکیشن پر تبصرہ کرتے ہوئے اچانک سیدھا ہو کر بولا۔ ظفر نے گاڑی روکی۔ افق نے اپنا بند شیشہ نیچے کر لیا۔

باہر ایک سرخ رنگت اور سنہری بالوں والا بچہ کھڑا تھا۔ اس کا لباس میلا تھا، پاؤں میں جوتا بھی نہ تھا۔ اس نے لمبے اور پتلے تنکوں پر انجیر اور اخروٹ لگا رکھے تھے۔ اخروٹ سبز اور کچے تھے۔

''اس سے کہو سو روپے کی دے دے۔'' افق نے ایک سرخ نوٹ شیشے سے باہر بچے کی طرف بڑھایا۔ احمر صاحب نے ترجمانی کی۔

''یہ سب تو چالیس روپے کی ہے۔'' بچہ بولا تھا۔ احمر صاحب نے افق کو بتایا۔

''تو پھر یہ ساری دے دو!''

''تم ساری لے لے گا تو ام شام تک تمہارا سر بیچے گا؟'' بچہ سارے انجیر دینے پر راضی نہ تھا۔ احمر صاحب ترجمانی کر رہے تھے۔

''اوہو، تو دو دے دو اور باقی پیسے رکھ لو۔''

''افق! وہ ایسے نہیں رکھے گا۔ تم اس سے صرف بیس روپے کی انجیر خرید سکتے ہو۔''

"اچھا۔" افق نے دس کے دو نوٹ باہر بچے کو دے دیئے۔ اس نے دو ٹھینیا
طرف بڑھائیں۔

بس پھر سے چل پڑی تھی۔ پریشے جانتی تھی کہ افق کو انجیر کھانے کا کوئی شوق نہ تھا،
بچے کی مدد کرنا چاہتا تھا اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ باقی لوگوں میں انجیر بانٹ رہا تھا۔

"تم خود بھی کھاؤ نا!"

"میں پھل وغیرہ نہیں کھاتا۔" اس نے لاپروائی سے شانے جھٹکے۔

ظفر نے بس روک دی۔ بس سے باہر نکلتے ہوئے اس نے بالوں میں لگے کیچر کو
اسے احساس ہوا کہ کیچر کا دو رنگا پتھر قدرے ڈھیلا ہو چکا تھا۔ بس ایک بار کیچر گرنے کی
پھر وہ الگ ہو جاتا۔

اس نے وہ افق کو واپس کرنے کا سوچا تھا مگر جانے کیوں اس کا دل ہی نہیں چاہا تھا
واپس کرے۔ اب وہ اسے اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی ہمیشہ کے لیے۔

وہاں ایک کھلا سا پارکنگ لاٹ بنا تھا، جس کے آخر میں خاصی چوڑی سیڑھ
پارکنگ لاٹ کے بائیں جانب ڈھلان تھی، وہاں چند فٹ نشیب میں تین چار دکانیں
سواتی شالیں لٹکتی دکھائی دے رہی تھیں۔ دکانوں کے بائیں طرف پہاڑ ختم ہو جاتا تھا اور
تھی، جس میں چشمہ بہ رہا تھا۔ بہتے پانی کی آواز اسے بہت پسند تھی۔

سیڑھیوں کے اختتام پر دور تک پھیلا سبز لان تھا جس میں سنگ مرمر کے بینچ
میزیں رکھی تھیں۔ لان کے اختتام پر سفید رنگ کا ایک محل تھا، دودھ کی طرح سفید
صورت کہ اس پر نگاہ نہ ٹھہرتی۔ لان کے دائیں طرف سیدھی پتھریلی روش تھی، جس کا اند
کاٹ کر بنائی گئی طویل سیڑھیوں پر ہوتا تھا۔ یہ سیڑھیاں وائٹ پیلس کی بلڈنگ سے ہٹ

"پری! یہ ہوٹل میں نے دیکھ رکھا ہے۔ وہ ڈرامہ "موم کا چہرہ" یہیں تو شوٹ ہوا
نے آہستہ سے اسے بتایا۔

شہلا اور افتخار کو اس روش کے دائیں جانب بنے کمروں میں سے ایک مل گیا تھا
سب کو دوسری منزل پر کمرہ ملا تھا۔

"مجھے نہیں رہنا دوسری منزل پر۔ نانگا پربت سر کرنا آسان ہے، وائٹ پیلس
چڑھنا بہت مشکل!" افق نے یہ سنتے ہی کہ اسے دوسری منزل پر رہنا ہوگا، منہ بنایا تھا مگر کسی نے اس کی بات کو اہمیت نہ دی۔

وائٹ پیلس کی وہ سفید عمارت دراصل اس کی پہلی منزل تھی۔ پتھریلی روش کے بائیں جانب جہاں چند کمرے اور دکانیں تھیں، ان کے آگے طویل سیڑھیاں پہاڑ کے اوپر لے جاتی تھیں، جہاں دوسری منزل تھی۔ وائٹ پیلس کی چاروں منزلیں اسی طرح مختلف بلندیوں مگر ایک ہی پہاڑ پر اوپر تلے بنی تھیں۔

وہ سیڑھیاں واقعی مشکل تھیں، یہ احساس اسے انہیں عبور کرتے ہوئے ہی ہو گیا تھا۔ نیچے بہتے جھرنے کا شور ابھی تک اس کی سماعت سے ٹکرا رہا تھا۔ اس نے ارادہ کر لیا کہ وہ شام کو اس جھرنے تک ضرور جائے گی۔

☆......☆......☆

"دور سے دیکھنے میں یہ طویل سیڑھیاں جتنی خوب صورت لگتی ہیں۔ انہیں چڑھنے لگو تو اتنی ہی تھکاتی ہیں۔ اف اللہ!" سیڑھیاں نیچے اترتے ہوئے اس نے بے اختیار جھنجھلا کر دائیں طرف نصب پنجرے پر ہاتھ مارا تو اندر بیٹھا خوب صورت مور سہم کر پیچھے ہوا۔

"سوری!" اسے بے اختیار شرمندگی ہوئی۔ اس کے آگے سیڑھیاں اترتے اُفق نے سر گھما کر اسے دیکھا اور پھر ہولے سے مسکرایا۔ پھر مسکراہٹ چھپانے کو رخ آگے پھیر کر نیچے اترنے لگا۔ اس نے اس کی مسکراہٹ نہیں دیکھی تھی، وہ بہت مسحور سی ہو کر اس خوب صورت مور کو دیکھ رہی تھی۔

ان سیڑھیوں کے دائیں اور بائیں جانب بہت بڑے بڑے پنجرے بنے تھے جیسے چڑیا گھر میں ہوتے ہیں۔ ان پنجروں میں مختلف پرندے، مور اور بندر مقید تھے۔ اسے افسوس ہوا تھا کہ اس نے اتنے خوب صورت مور کو ڈرا دیا تھا۔

"رک کیوں گئی ہو؟ چلو!" نشاء نے پلٹ کر اسے دیکھا، وہ سر جھٹک کر سیڑھیاں اترنے لگی۔ وہ چاروں نیچے جھرنے پر جا رہے تھے۔

پتھریلی روش جہاں ختم ہوتی اور جہاں سے پارکنگ لاٹ میں جانے کے لیے چند بے حد چوڑے زینے بنے تھے، اس جگہ پر ناشپاتی کا ایک درخت تھا، جس کے تنے کے ساتھ کرسی پر ایک بوڑھا سیکیورٹی گارڈ بیٹھا تھا۔

"یہاں سے ناشپاتی نہیں توڑ سکتے؟" اس نے بڑی حسرت سے درخت کو دیکھا۔

افق دھیرے سے مسکرایا، "وہاں جھرنے کے اوپر دائیں طرف کے پہاڑ پر چڑھتے آگے جنگل ہے وہاں جنگلی ناشپاتی کے بہت سارے درخت ہیں۔ وہاں سے توڑ لینا، اس درخ تو یہ آدمی تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگانے دے گا۔" اس کی آواز میں تھکاوٹ تھی۔

"تم ادھر ہی پیدا ہوئے تھے یا یہ انفارمیشن ہم پر اپنے علم کا رعب جھاڑنے کو دیتے ہو؟"

"نہیں، اصل میں جینیک، جنگلی ناشپاتی بہت شوق سے کھاتا ہے۔ پچھلی دفعہ وہ میرے آیا تھا تو وہاں چشمے کے اوپر ہم نے ناشپاتی کے درخت دریافت کیے تھے۔"

"جینیک کون؟" ارسہ اور نشاء نے پارکنگ لاٹ کا احاطہ عبور کرتے ہوئے بہ یک پوچھا تھا۔

"میرا دوست، جینیک یقین۔ (Jenk Yakin)۔" اس کی آواز قدرے پژمردہ آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں، شاید وہ سفر کے باعث تھک گیا تھا۔

جھرنے کا لکڑی کا پل عبور کر کے وہ دوسرے پہاڑ پر مقامی لوگوں کے بنائے گئے کچے پر اوپر چڑھنے لگے۔ راستہ بہت کچا تھا، پریشے کے جوگرز پر مٹی لگ رہی تھی، اس نے ہاتھ باندھ رکھے تھے اور سر جھکا ہوا تھا۔ افق جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کے برابر میں مگر کا فاصلہ رکھے چل رہا تھا۔

"وہ رہے ناشپاتی کے درخت۔" افق کی آواز پر اس نے چلتے ہوئے سر اٹھا کر اوپر وہاں درختوں کے جھنڈ تھے۔ اسے سامنے پڑا پتھر دکھائی نہیں دیا، اس کا پاؤں پتھر سے ہلکا سا اور وہ جھٹکا کھا کر لڑکھڑائی۔ افق نے تیزی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔

وہ لڑھکنے نہیں لگی تھی، بلکہ ہلکی سی لڑکھڑائی ہی تھی، مگر وہ سمجھا تھا کہ وہ پہاڑ پر سے گر ہے۔ اس لیے اس نے فوری ردعمل کے تحت اس کا ہاتھ پکڑ کر سہارا دیا اور پھر فوراً ہاتھ چھوڑ ارسہ اور نشاء ان سے کافی آگے جا چکی تھیں۔

وہ چلنے کے بجائے رُک کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ قدرے وضاحت دینے والے انداز میں "سوری، میں سمجھا تم گرنے لگی ہو۔"

"تمہارا دماغ درست ہے؟" وہ اس کے سامنے کھڑی اسے گھور رہی تھی۔

"پری...... میں۔"

اس نے افق کی بات سنے بغیر تیزی سے اس کی کلائی تھامی۔

"تمہیں بخار ہے، اتنا تیز بخار۔ ہاتھ دیکھو، کتنا گرم ہو رہا ہے اور نبض دیکھو کیسے دوڑ رہی ہے ورتم بجائے ریسٹ کرنے کے ہائیکنگ کرنے نکلے ہوئے ہو، ہاں!" اسے اس لاپرواہ انسان پر بہت غصہ آیا تھا۔ "تم سے اتنا بھی نہیں ہوا کہ مجھے بتا ہی دو۔ میں ڈاکٹر ہوں، تمہیں دوائی تو دے ہی سکتی تھی، مگر تمہیں خود کو اذیت دے کر اپنے آپ کو بہادر کہلوانے کا شوق ہے۔ تم انتہائی فضول انسان ہو! فوراً واپس چلو میرے ساتھ۔"

وہ جو پہلے بوکھلا گیا تھا، اب مسکراہٹ لبوں تلے دبائے، سر جھکائے کھڑا اس کی ڈانٹ سن رہا تھا۔

"معاف کرنا ڈاکٹر، میرا نہیں خیال کہ میں اتنا بیمار ہوں کہ بستر سے لگ کر بیٹھ جاؤں۔"

"یہ فیصلہ کرنے والے تم نہیں، میں ہوں۔ سمجھے تم؟" وہ واپس جانے کو پلٹی تو وہ بھی سر جھکائے اس کے فکرمندی بھرے غصے سے محظوظ ہوتا اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ بڑبڑاتی ہوئی پہاڑ سے نیچے اتر رہی تھی۔

"ڈاکٹر! میں واقعی اتنا زیادہ......"

وہ جھٹکے سے پیچھے مڑی۔ وہ اس کے عقب میں محض ایک قدم کے فاصلے پر تھا، اس کے ایک دم مڑنے پر فوراً پیچھے ہوا نہ ہوتا تو اس سے ٹکرا جاتا۔

"سنو، تمہیں آخری مرتبہ بتا رہی ہوں۔ میرے سامنے اپنا منہ بند رکھو، مجھے بڑبڑاتے ہوئے مریض زہر لگتے ہیں۔"

افق نے تابعداری سے لبوں پر انگلی رکھ لی۔ "سوری ڈاکٹر، اب نہیں بولوں گا۔" اس کے لہجے اور شہد رنگ آنکھوں سے شرارت جھلک رہی تھی۔

"ہاں، اب ٹھیک ہے، چلو!" وہ اس کے آگے چلنے لگی۔

"ویسے کتنی دیر تک نہیں بولنا؟"

"جب تک میں نہ کہوں اور اب خاموش رہو۔" وہ اس کے آگے چلتی ہوئی اوپر کمروں تک لے آئی۔ اسے پیراسیٹامول کی دو گولیاں دے کر سختی سے سو جانے کو کہا۔

"مگر میں سونا نہیں چاہتا۔" بیڈ پر بیٹھے افق نے احتجاج کیا۔

"خاموش، بالکل خاموش رہو۔ ڈاکٹر کے سامنے اپنی زبان بند رکھا کرو۔"

اس کو باقاعدہ ڈانٹ کر وہ اس کے کمرے سے آ گئی۔ دوسری منزل پر کمروں کی قطاریں تھیں۔ سامنے لان تھا جو مستطیل شکل کا تھا۔ لان کے دہانے پر جہاں کھائی تھی، اور چند درختوں کی معمولی باڑ سی بنی تھی۔

وہ اپنے بیگ سے ڈائری اور پین نکال لائی اور لان کے وسط میں بچھی کرسیوں میں پر بیٹھ کر اپنے سفر کے متعلق لکھنے لگی۔ جب اسے یہ یقین ہو گیا کہ آس پاس اس کے سوا ہے تو اس نے جوگرز اتار کر پاؤں میز پر رکھ لیے اور ڈائری گھٹنوں پر۔ ڈائری لکھتے ہوئے بہ گاہے افق کے کمرے کی جانب نگاہ بھی دوڑا لیتی تھی۔ ایک بار جا کر دیکھ بھی آئی، وہ بازو رکھے سو رہا تھا۔ وہ مطمئن ہو کر واپس آئی تو ایک چھوٹا سا بندر میز پر بیٹھا اس کی ڈا چھیڑ چھاڑ کر رہا تھا۔ ایک اور بندر نیچے گھاس پر انگڑائیاں لے رہا تھا۔ اس کو قریب آتے د بندر تو چھپاک سے غائب ہو گیا جب کہ گھاس پر لیٹا بندر احتراماً سیدھا ہو گیا۔

اس نے مسکراتے ہوئے اپنا بال پوائنٹ بندر کی طرف بڑھایا جسے اس نے اپنے ہاتھوں کی مدد سے پکڑ لیا، کچھ دیر وہ اس سے کھیلتا رہا۔ وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھتی رہی دم بندر نے اس کا پین زور سے اچھالا۔ وہ لان کے دہانے پر سے ہوتا ہوا نیچے کھائی میں پریشے کے چہرے سے مسکراہٹ غائب ہو گئی۔

"دفع ہو جاؤ تم!" اس نے غصے سے پاؤں زور سے زمین پر مارا، بندر اچھلتا ہوا بھاگ گیا۔ پری نے افسوس سے کھائی کی طرف دیکھا۔ اس کا پین اب واپس نہیں آ سکتا تھا۔

پھر وہ افق کے متعلق سوچنے لگی۔ اسے سیف کے متعلق سوچنا برا لگتا تھا، مگر افق کی با کی شرارت بھری شہد رنگ آنکھوں اور اس کی لبوں میں چھپی مسکراہٹوں کو سوچنا اسے بہت رہا تھا۔ وہ شخص جسے چار دن پہلے تک وہ جانتی بھی نہیں تھی، اب بہت شناسا سا لگ رہا تھا بلکہ شاید اس کو وہ پیا کو صدیوں سے جانتی تھی، روح سے وجود میں آنے سے بھی پہلے، پہلی سا سے بھی پہلے سے......

اسے لگا افق کسی کو پکار رہا ہے، وہ کمرے کا دروازہ ادھ کھلا چھوڑ کر آئی تھی، تب ہی

ے آئی تھی۔ وہ اتنی جلدی جاگ گیا؟

وہ جاگا نہیں تھا، وہ شاید سو بھی نہیں رہا تھا۔ اس کا بازو اب اس کی آنکھوں پر نہیں تھا، اس کی نانی اور پورا چہرہ پسینے سے تر تھا۔

"افق!" پریشے نے اس کے نزدیک ہو کر بغور اسے دیکھا۔ اس کے لب ہولے ہولے لرز ہے تھے۔ وہ شاید کچھ کہہ رہا تھا۔

"میرا آکسیجن کین کہاں ہے؟ میرا آکسیجن کین کہاں ہے؟" بند آنکھوں اور نفی میں ہلتے سر ے ساتھ وہ مدھم آواز میں جیسے پکار رہا تھا۔

"افق، اٹھو......" اس نے اس کا شانہ دھیرے سے ہلایا، اس کی قمیص پسینے میں بھیگی ہوئی تھی۔

"میرا آکسیجن کین...... حنادے، میرا آکسیجن کنٹینر......" اس نے درمیان میں ترک زبان کا ئی لفظ بولا تھا، جسے وہ سمجھ نہیں سکی تھی۔ اس نے زور سے اس کا کندھا ہلایا۔ افق نے فوراً آنکھیں کھول دیں اور ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ اس کی آنکھوں میں بے یقینی اور خوف تھا۔ "مم، میرا سیجن کنٹینر کہاں ہے؟"

"افق! تمہارے پاس کوئی آکسیجن کین نہیں ہے، کیا تمہیں آکسیجن نہیں آ رہی؟ سانس گھٹ ہا ہے کیا؟" وہ کچھ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

اس نے چونک کر پری کو دیکھا۔ "میں کہاں ہوں؟" پھر وہ اپنی ترک زبان میں کچھ بولا۔

"تم وائٹ پیلس، مرغزار، سوات میں ہو۔ تم نے شاید کوئی برا خواب دیکھا ہے۔"

"خواب؟" وہ جھٹکے سے کمبل اتار کر بیڈ سے اتر آیا۔

"تم ٹھیک تو ہو؟" اس نے دھیرے سے افق کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر چند قدم آگے بڑھ گیا۔ وہ ادھر ادھر دیکھتے ہوئے صورتِ حال سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"تم، تم جاؤ یہاں سے۔" وہ اس کی جانب کمر کیے دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا، وہ اس سے نظریں نہیں ملا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر انجانا خوف اور اضطراب رقم تھا۔

وہ اس کے سامنے آ گئی اور بغور اس کے چہرے کو دیکھا جس کی رنگت کسی مرجھائے، پیلے گلاب کی طرح زرد ہو رہی تھی۔

"مجھے بتاؤ، تمہیں کیا ہوا ہے؟"

''تم جاؤ ادھر سے۔'' وہ رخ موڑ کر دونوں ہاتھوں کی انگلیاں بالوں میں پھنسائے
کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تم ٹھیک نہیں ہو، تمہیں......''

''جاؤ...... خدا کے لیے جاؤ یہاں سے...... جسٹ گیٹ آؤٹ آف ہیئر!'' وہ ا
سے چلایا تھا، وہ سہم کر پیچھے ہوئی، اگلے ہی لمحے وہ کمرے سے باہر نکل آئی۔

اسے حیرت ہوئی تھی، وہ بہت بہادر کوہ پیما تھا، وہ تو جسمانی تکالیف کو خاطر میں نہیں
پھر ایک خواب سے اس بری طرح سے کیوں ڈر گیا تھا؟ اس کے چہرے پر اتنا انجانا خو
دینے کا کرب کیوں تھا؟ وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔

☆......☆......☆

پھر تمام شام وہ اپنے کمرے سے نہیں نکلا۔ پریشے نے اس کو رات کے کھانے پر
تینوں وائٹ پیلس کی پہلی منزل کی سفید عمارت کے برآمدے میں رکھے خوب صورت برا
کے صوفوں پر بیٹھی کھانے کا انتظار کر رہی تھیں، جب وہ ان سے آن ملا۔

''میں ذرا لیٹ ہو گیا، معاف کرنا۔ میں اس بندر سے کھیلنے لگا تھا۔'' وہ لکڑی کے د
پھلانگ کر ان کی طرف آیا۔

''گھوڑوں کے علاوہ بندروں سے بھی آپ کی اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ لگتی ہے۔''
بے ساختہ کہا۔

''سمجھا کریں ناں......! ڈارون کہتا تھا انسان پہلے بندر تھا۔ کیوں افق بھائی؟''

''انسان پہلے بندر تھا یا نہیں، البتہ ڈارون کے آباؤ اجداد ضرور بندر تھے۔'' وہ ایک
وہی پرانا، ہنستا مسکراتا افق لگ رہا تھا۔ شام والے واقعے کا اس کے چہرے پر شائبہ تک ن
وہ سر جھٹک کر خاموشی سے کھانا کھانے لگی۔

☆......☆......☆

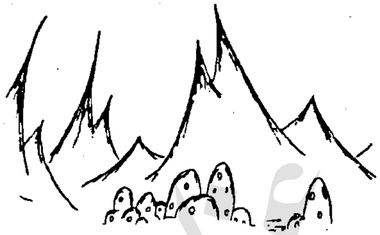

پانچویں چوٹی

بدھ، 27 جولائی 2005ء

وہ کمرے کا دروازہ کھول کر باہر برآمدے میں آ گئی۔ برآمدہ کافی طویل تھا اور ہر کمرے کے
وازے کے دونوں اطراف خوشنما پھولوں کے گملے رکھے تھے۔ برآمدے کے آگے سفید ستون
سے بنے تھے، وہ ایک ستون سے ٹیک لگائے سامنے کا منظر دیکھنے لگی۔

قدرتی لش گرین گھاس سے ڈھکے مستطیل لان کے دہانے پر لگی جھاڑیوں کی باڑ کے اردگرد
ی چھوٹا بندر چکراتا پھر رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ادھ کھایا، چھوٹا سبز سیب تھا۔ وہ فجر کا وقت تھا۔ ہر
رف گہرا نیلاہٹ بھرا اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ دور جنگل سے جانوروں کے بولنے کی آوازیں ماحول پر

چھائے سکوت کو چیر رہی تھیں۔ رات خوب بارش ہوئی تھی، برآمدے کی مخروطی چھت سے رستا رہا تھا۔

تب ہی دفعتاً اس کی نگاہ گیلی گھاس پر پڑی، جہاں ایک طرف گول سی کیاری کے پاس جائے نماز بچھائے افق ارسلان نماز پڑھ رہا تھا۔ اس نے نیلی جینز کے پائینچے اوپر چڑھا رکھے تھے۔ جسم پر جیکٹ اور مفلر نہ تھا البتہ اُس نے پی کیپ الٹی کر کے سر ڈھانپ رکھا تھا۔ اس کے جوگرز جائے نماز کے پیچھے رکھے تھے۔ سینے پر ہاتھ باندھے، سر جھکائے کھڑا وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔

وہ گھاس پر آ گئی، جوگرز کے بجائے نرم چپل پہننے کے باعث گیلی گھاس اس کے پیر گیلا کرنے لگی تھی۔ وہ سیڑھیاں اترنے لگی۔

سیڑھیوں کے دائیں طرف پنجرے میں مقید مور جاگے ہوئے تھے۔ نیلے اور سبز پروں والا مور اپنے بدصورت پاؤں کے ساتھ ناچ رہا تھا۔ سفید مورنی کونے میں بیٹھی ناچ دیکھ رہی تھی۔ وہ تحیر اور ستائش سے رک کر انہیں دیکھنے لگی۔ اس کی موجودگی کا احساس کر کے مور رک گیا۔ ایک لمحے اس مور اور خود میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ اتنا حسین مور اپنی خوب صورتی سمیت تمام عمر کے لیے اس پنجرے میں مقید کر دیا گیا تھا، بالکل ایسے جیسے خود اس کی خوب صورتی اور دولت نے اس کے قدموں میں سیف کے نام کی زنجیر ڈالی تھی۔ کاش وہ اس وقت تھوڑی ہمت کر کے پاپا کو منع کر دیتی۔

سیف کے متعلق سوچ کر ہی وہ اداس ہو گئی تھی۔ اس سے اسے نیلے اندھیرے میں ڈوبا مرغزار بہت اداس لگا تھا اور جب وہ نیچے جھرنے کے پل تک آئی تو اسے سامنے والی شاخ پر بیٹھی وہ چڑیا بھی اداس گیت گاتی محسوس ہوئی تھی۔

''پری!''

وہ اس وقت پہاڑ پر بنے بل کھاتے کچے راستے پر چڑھ کر اوپر ناشپاتی اور سیبوں کے درختوں تک پہنچ گئی تھی، جب اس نے اپنے عقب میں پکار سنی۔

اس نے گردن گھما کر پیچھے دیکھا۔ افق نیچے پل پر چلتا ہوا اس تک آ رہا تھا۔ اس کے پیروں میں جوگرز اور گردن میں مفلر تھا، الٹی پی کیپ اب سیدھی ہو چکی تھی۔

وہ رک کر اس کا انتظار کرنے لگی۔

''تم ادھر کیا کر رہی ہو؟'' وہ چند قدم نشیب میں تھا۔

''تمہارا انتظار۔ مجھے علم تھا تم میرے پیچھے جھرنے تک ضرور آؤ گے۔''

وہ سوچ کر رہ گئی، پھر بولی۔ ''میرا ناشپاتی کھانے کو دل چاہ رہا تھا۔'' وہ اب اس کے قریب آ گیا تھا۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ اوپر چڑھنے لگے۔ گہرا نیلا اندھیرا قدرے ہلکا ہوا تھا۔

''تم میری وجہ سے کل نہیں کھا سکی تھیں نا؟'' افق نے بغیر کسی شرمندگی کے کہہ کر اسے ایک نظر دیکھا۔ وہ سرخ اور گلابی امتزاج کے شلوار قمیص میں ملبوس تھی، دوپٹہ گردن کے گرد لپٹا تھا اور بال اونچی پونی ٹیل میں بندھے تھے۔ اس پر اونچی پونی بہت اچھی لگتی تھی۔

''ہاں!''

وہ چڑھتے چڑھتے اب پہاڑ کے اوپر پہنچ گئے تھے، جھرنا اب بہت چھوٹا اور وائٹ پیلس بہت دور دکھائی دے رہا تھا۔ وہ جگہ ناہموار تھی، بہت سے درخت اونچے نیچے ڈھلان پر اُگے تھے۔ وہ ایک درخت کے قریب چلی آئی۔

''کھاؤ گے؟'' ایک ناشپاتی توڑ کر اس نے دوپٹے سے خوب رگڑ کر صاف کی یہ اس کا سیبوں اور ناشپاتیوں کو صاف کرنے کا اپنا طریقہ تھا اور افق کی طرف بڑھائی۔

اس نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ نفی میں سر ہلا دیا۔ ''میں پھل نہیں کھاتا۔''

''کیوں؟'' پری نے حیرت سے بڑھا ہوا ہاتھ نیچے گرا دیا۔

''یونہی۔ اچھے نہیں لگتے۔'' وہ ایک درخت کے تنے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

''کھایا کرو، ان میں فائبرز ہوتے ہیں، معدے کے لیے اچھے ہوتے ہیں۔''

وہ ڈاکٹروں کے مخصوص انداز میں کہتی اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ ''اور سنو، تمہاری طبیعت کیسی ہے؟''

''خود دیکھ لو۔'' افق نے اپنی کلائی اس کی جانب بڑھائی۔ سنجیدہ لہجے کے پیچھے شرارت تھی۔

اس نے بس ایک سیکنڈ کو نبض پکڑی، پھر چھوڑ دی۔

''ابھی تک بخار ہے، مگر کل کی نسبت ہلکا ہے۔'' افق نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ دور نیلے آسمان پر نارنجی سورج طلوع ہونے کو بے تاب تھا مگر گہرے سیاہ بادل اسے رستہ نہیں دے رہے تھے۔

''تم نے آج مور کو ناچتے دیکھا تھا، پری؟'' اس کی نگاہیں یہاں آسمان پر چھائے بادلوں پر

تھیں۔ وہ خاموش رہی۔

''میں جب بھی ادھر آتا ہوں، یہ مور مجھے پہچان کر اپنا ناچ ضرور دکھاتے ہیں۔ جن چ... سیاح صرف لطف اندوزی کا سامان سمجھتے ہیں، وہ ہمارے جانے کے بعد ہمیں یاد ک... ہمیں پکارتی ہیں۔ تمہیں نہیں لگتا پری کہ وائٹ پیلس کی سیڑھیوں کے ساتھ نصب پنجرے م... ہمارے جانے کے بعد ہمیں یاد کرے گا۔ اس جھرنے کا تیز بہتا پانی، پانی میں رکھے پتھر اور ا... قریب لگے درخت پر وہ اداس گیت گاتی چڑیا ہمیں یاد کرے گی؟ سیاح سمجھ نہیں پاتا، در... قدموں کے نشان تو صدیوں ان پتھروں، مرغزاروں اور ان کچے راستوں پر ثبت رہتے ہیں۔''

''کل شام تمہیں کیا ہو گیا تھا، افق؟'' وہ خاموش ہوا تو اس نے پوچھا۔ سوال اتنا غی... کہ افق نے چونک کر اسے دیکھا۔

''کل شام؟''

''ہاں...... کل...... شام!'' پری نے آہستہ سے اپنی آواز دہرائی۔

''تم نے اپنی ناشپاتی نہیں کھائی۔''

''بات مت بدلو۔''

وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ''بارش ہونے والی ہے، چلو واپس چلتے ہیں۔'' کھڑے ہو کر اس... پینٹ جھاڑی، ایک سرخ رنگ کا کیڑا اس کے گھٹنے سے نیچے پتھریلی زمین پر گرا۔

''تم جاؤ۔ میں بعد میں آ جاؤں گی۔'' پریشے نے خفگی سے منہ پھیر لیا۔

جھرنے کے بہتے پانی نے دیکھا تھا کہ وہ دونوں اس پل ایک بار پھر اجنبی ہو گئے تھ... وہ کچھ کہے بنا وہاں سے چلا گیا وہ پھر ویسا ہو گیا تھا، جیسا کل شام تھا، جیسے جلیل کے... میں تھا۔ اجنبی، ناشناسا۔

پھر کتنی ہی دیر وہ بغیر کھائی ناشپاتی ہاتھ میں لیے وہاں بیٹھی بیتے لمحوں کا شمار کرتی رہ... تک کہ سیاہ بادل برسنے لگے۔ تب وہ اٹھی اور پہاڑ کی ڈھلان سے اترنے لگی۔

وہ پری کو سیڑھیوں پر موروں کے پنجرے کے قریب کھڑا تیز بارش میں بھیگتا ہوا... تھا۔ وہ بہت اداسی سے ترک زبان میں ان موروں کو کوئی گیت سنا رہا تھا، سبز اور نیلے پنکھ... ناچ رہا تھا۔ افق کے سر پر کیپ نہیں تھی۔ بارش نے اس کا پورا جسم بھگو ڈالا تھا۔ اسے یوں...

باہر کھڑے دیکھ کر اُسے بہت غصہ آیا تھا۔

''کیوں کھڑے ہو تم ادھر؟ جاؤ اپنے کمرے میں۔ کتنی مرتبہ کہوں تم سے یہ بات؟ سمجھ میں نہیں آتی تمہیں؟ ابھی تمہارا بخار بھی نہیں اترا۔ جاؤ جا کر آرام کرو۔''

وہ غصے سے بلند آواز میں چلائی تھی۔ سر پر ٹرے رکھ کر بارش کے پانی سے بچتے اس ویٹر نے جو تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتے ہوئے اتر رہا تھا، حیرت سے گردن پھیر کر ایک لمحے کو اسے دیکھا ضرور تھا جو خود بارش میں بھیگتی اسے ڈانٹ رہی تھی۔

''تمہیں کوئی حق حاصل نہیں مجھ پر حکم چلانے کا!'' وہ بھی جواباً چلایا تھا۔ ایک لمحے کو وہ چپ سی ہو گئی۔ واقعی، کہاں حق رکھتی تھی وہ ایک اجنبی پر؟

''ٹھیک ہے پھر مرو اس بارش میں۔'' وہ تیزی سے سیڑھیاں پھلانگتی اوپر آ گئی۔ لان میں تین بندر اٹکھیلیاں کر رہے تھے۔ لان کو بھاگتے ہوئے عبور کرتے اس نے راستے میں پڑی منرل واٹر کی خالی بوتل اٹھا کر میز پر چڑھے بندر کو زور سے ماری، بندر سہم کر جھاڑیوں کے پیچھے گم ہو گیا۔

وہ بارش میں بھیگتی کمرے تک آئی تھی۔ ایک بارش سوات کے پہاڑوں پر ہو رہی تھی، ایک اس کی آنکھوں سے برس رہی تھی۔ وہ خود پر کمبل تان کر پوری دنیا سے چھپ کر رونے لگی۔ ارسہ اور نشاء پرسکون سو رہی تھیں۔

باہر موسلادھار بارش میں چوڑی سیڑھیوں کے درمیان موروں کے پنجرے کے ساتھ کھڑا افق ارسلان ابھی تک بھیگ رہا تھا۔

☆......☆......☆

وہ تمام دن اپنے کمرے میں رہی تھی پھر جب دن ڈھل گیا اور افق پر سیاہی پھیلنے لگی تو وہ ٹی وی کے آگے سے ہٹی، جس پر پی ٹی وی اور جیو کے سوائے کوئی چینل نہیں آتا تھا۔ اس نے رات کا کھانا بھی نہیں کھایا، پھر نشاء اسے زبردستی اٹھا کر وائٹ پیلس کے باہر بنی دکانوں تک لے آئی۔ اس کو سواتی شالوں اور قیمتی پتھروں کی شاپنگ کا کوئی شوق نہیں تھا، مگر محض نشاء کا ساتھ دینے کو وہ کافی دیر تک وہاں سر کھپاتی رہی۔

دونوں واپس آئیں تو وائٹ پیلس کی سفید عمارت کے سامنے پھیلے وسیع و عریض لان کے وسط میں، دائرے کی صورت میں احمر صاحب، شہلا، افتخار، ارسہ اور افق بیٹھے تھے۔ افق کے پیچھے سنگ

مرمر کا سفید بینچ تھا، جس سے ٹیک لگائے وہ ایسے بیٹھا تھا کہ دائیں ٹانگ گھاس پر پھیلا رکھی تھی
بایاں گھٹنا سیدھا کھڑا تھا۔ وہ خاموشی سے سر جھکائے گھاس کے تنکے نوچ رہا تھا۔ اس کی پی
اس کے سر پر تھی۔

احمر صاحب اور باقی افراد کسی بحث میں محو تھے۔ نشاء بھی ساتھ شامل ہو گئی۔ صرف وہ او
خاموش تھے۔ وہاں وائٹ پیلس کے برآمدے سے آنے والی روشنی اور چاند کی چاندنی کے
دوسری کوئی لائٹ نہیں تھی جس کے باعث وہ اس کا چہرہ ٹھیک سے نہیں دیکھ سکی تھی، مگر وہ اسے
کی نسبت بہتر لگا تھا۔

''اتاترک کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے، افق؟'' احمر انکل بحث کو مشرف سے اتا
تک لے گئے تھے، ان کے پکارنے پر اس کی گھاس نوچتی انگلیاں رکیں، اس نے چہرہ اونچا
چمکتی چاندنی نے اس کے چہرے کے خدوخال کو قدرے واضح کیا تھا۔ نقاہت اور بیماری واضح

''اتاترک؟'' اس نے دہرایا پھر شانے اچکا دیئے۔ ''وہ ترکوں کا باپ تھا۔''

''باپ کبھی بچے کی غلط رہنمائی نہیں کرتا!'' احمر صاحب سے پہلے ہی پری شے تیزی سے
وہ خفیف سا مسکرایا۔

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں اردگان کا حامی ہوں۔'' اس نے اپنی پی کیپ کی جانب
اشارہ کیا جسے وہ سمجھ نہ سکی۔

''ویسے میں نے سنا ہے تمہارا ڈکٹیٹر اتاترک کو آئیڈیلائز کرتا ہے اور روانی سے ترکی
بولتا ہے؟'' قدرے توقف سے اس نے سوال کیا۔

''وہ اس لیے کہ ہمارے ڈکٹیٹر کو اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں ہے۔'' نشاء ڈکٹیٹر کے
چڑ گئی۔

''نشاء، یہ ڈکٹیٹرز پادشاہ (Padshah) ہوتے ہیں۔ پادشاہوں سے بھی زیادہ اختیار
ہیں ان کے پاس۔ ویسے میں نے سنا ہے کہ تمہارا پادشاہ...... یورپ اور امریکا سے آنے والو
بہت قدر کرتا ہے۔ مجھے تو اس نے آج تک نہیں پوچھا۔ شاید اس لیے کہ میں مسلمان ہوں؟''

''فکر مت کرو۔ تم راکاپوشی سر کر لو، تمہیں کوئی ایوارڈ دلوا ہی دیں گے!'' نشاء نے کہا۔

''کون سا ایوارڈ؟ نشانِ حیدر؟'' وہ دلچسپی سے بولا۔

''نہیں نہیں۔ وہ تو شہید ہونے کے بعد ملتا ہے اور ملٹری اعزاز ہے۔ خیر تم پہلے کوئی پاکستانی
پہاڑ سر تو کرو، قومی اعزاز کے بارے میں بعد میں سوچیں گے۔''

وہ بدمزہ سا ہو کر پیچھے ہوا۔ ''میں گیشر بروم ٹو، براڈ پیک اور نانگا پربت سر کر چکا ہوں۔
تمہارے صدر نے مجھے کبھی نہیں بلایا۔ اب تو میں نے امید لگانا بھی چھوڑ دی ہے۔'' وہ بہت مصنوعی
افسوس سے کہہ رہا تھا۔

''تم نے نانگا پربت سر کیا ہے؟ دی کلر ماؤنٹین؟'' پری شے چونکی تھی۔

''ہاں!'' وہ کیپ ٹھیک کرتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ ''میں چلتا ہوں، آپ لوگ باتیں کریں۔''

پری کی نگاہوں نے لان عبور کر کے سیڑھیاں چڑھتے افق کا دور تک تعاقب کیا تھا، آج وہ
موروں کے پنجرے کے پاس نہیں رکا تھا۔

محفل جاری تھی جب وہ وہاں سے اٹھ کر اوپر آ گئی۔ وہ افق کو تلاش کر رہی تھی۔ وہ مستطیل
لان میں نہیں تھا، نہ ہی اپنے کمرے کے آگے بنے برآمدے میں، وہ تو اپنے کمرے میں بھی نہیں
تھا۔ لان میں اس رات بندر بھی نہیں تھے۔

وہ تیسری منزل پر آ گئی۔ ایک ہی نگاہ میں اس نے اطراف کا جائزہ لیا۔

چوکور احاطے کے دائیں طرف کونے میں آگے جا کر ایک بالکونی بنی تھی، اسے وہاں افق کی
جھلک دکھائی دی۔ وہ وہیں آ گئی۔

وہ بالکونی پرانے وقتوں کے محلوں کی طرز پر بنی تھی۔ اس کی ریلنگ اونچی تھی جس پر کہنیاں
ٹکائے، وہ قدرے جھک کر نیچے جھرنے کو دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کے عقب میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس
کی کیپ کا پچھلا حصہ اس کے سامنے تھا، اس پر سفید مارکر سے کسی نے ہاتھ سے لکھ رکھا تھا،
Hail to Tayyip Erdogan۔ اس نے یہ فقرہ پہلی بار نوٹ کیا تھا۔

افق اپنے گردوپیش سے بے خبر دھیمی آواز میں کچھ گنگنا رہا تھا۔

''سون اکشام استورین...... انجے بانا سوزویر......''

یک دم کسی کی موجودگی کا احساس کر کے اس نے پلٹ کر پیچھے دیکھا۔

''تمہاری کیپ پر طیب کے ہجے غلط لکھے ہیں، طیب کے آخر میں "B" آتا ہے، تم نے "P"
لکھ رکھا ہے۔'' اس کے خود کو سوالیہ نظروں سے گھورنے پر جو اس کے منہ میں آیا وہ بول پڑی۔

"میں نے نہیں لکھا۔" چہرہ واپس جھرنے کی طرف موڑ کر وہ بے نیازی سے بولا، "یہ جر
کی کیپ ہے، اس نے لکھا ہے۔ ترک زبان میں "B" کی جگہ "P" استعمال ہوتا ہے۔ یہ
انگریزی میں اس لیے لکھا ہے کہ وہاں ترکی میں لوگ انگریزی سے نابلد ہوتے ہیں۔ ملٹری
بھی اور وہاں کی ملٹری، اردگان کو پسند نہیں کرتی۔"

"مگر تمہاری انگریزی تو بہت اچھی ہے۔" وہ اس کی طرح ریلنگ پر کہنیاں ٹکائے کھڑی
گئی، فرق یہ تھا کہ وہ سامنے دیکھ رہا تھا اور وہ اسے۔

"میں بچپن میں کافی عرصہ امریکا میں رہا ہوں، شاید اس کا اثر ہو۔"

"اچھا، تم نے جیپ کی کیپ کیوں لے رکھی ہے؟"

"میں مصر جا رہا تھا تو انقرہ کے ایئرپورٹ پر یونہی مذاق میں، میں نے اس کی کیپ چھینی اور
نے میری۔ بس پھر بعد میں واپس ہی نہیں کر سکا۔" وہ رکا اور قدرے توقف سے بولا، "ہم د
انجینئر ہیں اور سائٹ پر جاتے ہوئے کیپ لیتے ہیں کہ دھوپ ہوتی ہے، تو بس عادت پڑ گئی ہے۔"

"اور یہ مفلر؟" اس نے گردن میں موجود مفلر کی طرف اشارہ کیا۔ افق نے گردن جھکا کر ا
دیکھا۔

"یہ مفلر نہیں ہے۔ یہ ترکی کا جھنڈا ہے۔"

"اوہ!" وہ حیران ہوئی، "میں تو اسے مفلر سمجھی تھی۔"

"میں اسے راکاپوشی پر لہرانے کو لایا ہوں۔" وہ پھر سے اندھیرے میں دیکھنے لگا تھا۔ وہ
کی جانب دیکھنے سے دانستہ گریز کر رہا تھا۔ وہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہ
ارتکاز محسوس کر کے افق نے گردن ترچھی کر کے اسے دیکھا۔

"تم ابھی کیا گا رہے تھے؟"

"کچھ نہیں...... ہمارا ایک لکھاری ہے احمت اومت، اس نے لکھی تھی۔ ایک نظم ہے......
آف......" پھر وہ رخ پھیر کر ریلنگ سے ٹیک لگا کر کھڑا ہو گیا اور دونوں بازو سینے پر باندھ لیے۔

"کیا مطلب ہے اس کا؟"

افق اس کا مطلب سمجھانے لگا۔

"مجھے سناؤ نا۔ ویسے ہی جیسے تم ابھی گنگنا رہے تھے۔" وہ ضد کر رہی تھی۔ چند لمحے

چھائی رہی، پھر وہ بہت مدھم آواز میں گنگنانے لگا۔ "سون اکشام استودین...... انجے باتا
سوزدیر......"

"زندگی کے سفر میں بچھڑنے سے پہلے
ملن کی آخری شام کے ڈھلنے سے پہلے
اور ایک دوسرے کی سانسوں اور
دھڑکنوں کی آخری آواز سننے سے پہلے
کہ جس کے بعد تم میری دنیا سے دور چلے جاؤ گے
تمہیں مجھ سے
ایک وعدہ کرنا ہوگا
کہ جب بھی سورج طلوع ہوگا
اور اناطولیہ کی گلیوں میں روشنی بارش کے قطروں کی طرح گرے گی
اور ارارات کے جامنی پہاڑوں پر جمی برف پگھلے گی۔
اور پھر جب اس برف میں دبی داستان مارمرا کے پانیوں میں بہ جائے گی۔
تب تمہیں مجھ سے ایک وعدہ نبھانا ہوگا
کہ اس رات کے بعد اپنی زندگی میں آنے والی
ہر صبح کی ٹھنڈی ہوا
اور ہر بارش کے بعد گیلی مٹی
اور جامنی پہاڑوں پر دودھ کی سی جمی برف کو دیکھ کر
تم مجھے یاد کرنا
کہ یہ میرا تم پر
اور تمہارا مجھ پر
قرض ہے

وہ اسی مدھم سر میں ریلنگ سے ٹیک لگائے، آنکھیں موندے گنگنا رہا تھا اور وہ اس کے لہجے، اس کی آواز میں کھوئی ہوئی تھی۔

دفعتاً بادل گرجے تو افق چونک کر رک گیا اور گردن اٹھا کر سیاہ، تاریک آسمان کو دیکھنے لگا۔

''چلو چلتے ہیں، بارش ہونے لگی ہے۔'' وہ چل پڑا۔ پری اس سے پیچھے، اس کے جوتوں کے نشانات پر جو گھاس میں گم ہو رہے تھے، پاؤں رکھتی چلنے لگی۔

نیچے، اپنے کمرے کی چوکھٹ پر پہنچ کر، دروازہ بند کرنے سے پہلے افق نے ایک لمحے کو رک کر اس کی آنکھوں میں دیکھا۔

''آئی ایم سوری...... آئی ایم سوری فار ایوری تھنگ۔'' صبح والے واقعے کے متعلق دھیرے سے کہہ کر اس نے دروازہ بند کر دیا۔ وہ بے اختیار مسکرا دی۔

دور تاریک آسمان پر بادل اکٹھے ہو رہے تھے۔

☆......☆......☆

جمعرات، 28 جولائی 2005ء

سوات کے پہاڑوں پر ٹھنڈی، پرنم اور بادلوں سے ڈھکی صبح اتری ہوئی تھی۔ سورج ابھی پوری طرح طلوع نہیں ہوا تھا، کل کی طرح آج بھی بادلوں نے آسمان کو اپنی راجدھانی بنایا ہوا تھا، مگر ان کا رنگ ہلکا تھا۔

''خدا کرے آج بارش نہ ہو۔'' اپنے کمرے سے باہر برآمدے میں آتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں بے اختیار دعا مانگی تھی۔ آج انہیں سوات سے کالام جانا تھا۔ کالام تھا تو ضلع سوات کی تحصیل ہی مگر پھر بھی لوگ مینگورہ اور سیدو شریف کو ہی ''سوات'' بولتے تھے۔

برآمدے سے باہر لان کے وسط میں، جس جگہ کل وہ نماز پڑھ رہا تھا، آج بھی ادھر ہی بیٹھا تھا، مگر آج وہ نماز نہیں پڑھ رہا تھا۔ اس نے کیپ الٹی کر کے پہن رکھی تھی، پاؤں میں جرابیں تھیں، جینز کے پائینچے اوپر تہ کیے ہوئے تھے اور آنکھیں بند کیے وہ بالکل گوتم بدھا کے انداز میں ہاتھ گھٹنوں پر رکھے بیٹھا یوگا کر رہا تھا۔

وہ دبے قدموں سے چلتی اس کے عقب میں آئی، جوتے ایک طرف اتارے اور اس کے پیچھے دائیں طرف اسی بدھا والے انداز میں آلتی پالتی کر کے بیٹھ گئی۔

افق نے آنکھیں کھولیں اور ہاتھوں کی پوزیشن بدلنے ہی لگا تھا کہ کسی احساس کے تحت مڑ کر دیکھا۔ پری شے کو اپنے پیچھے یوگا کے Sukhasana انداز میں بیٹھے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں خوشگوار حیرت در آئی۔

''صبح بخیر...... یوگا؟'' اس نے یک لفظی استفسار کیا۔

''صبح بخیر...... ہاں، یوگا!''

وہ گھاس پر لیٹ گیا، بازو سر کے پیچھے کر کے پاؤں کیاری کی اینٹوں تک لمبے کیے اور فلور پوز کرتے ہوئے پوری قوت سے اینٹوں کو دھکیلا۔

''کب سے کر رہی ہو یوگا؟''

''دو منٹ پہلے سے۔'' وہ اپنے جواب پر خود ہی ہنس پڑی۔

''واقعی؟'' گھٹنے کو لیٹے لیٹے سینے تک لے جاتے ہوئے افق نے حیرت سے اسے دیکھا۔

''نہیں۔ میں سولہ سال کی عمر سے یوگا کر رہی ہوں۔''

''تب ہی تم اپنی عمر سے کم دکھائی دیتی ہو۔'' وہ اب بائیں گھٹنے کو آہستہ آہستہ اوپر نیچے کر رہا تھا۔

''شکریہ...... میں کتنے سال کی دکھائی دیتی ہوں؟''

''سولہ سال کی!''

''میرا خیال ہے اب تم جھوٹ بول رہے ہو۔''

''جھوٹ نہیں، مبالغہ آرائی۔'' وہ ہولے سے ہنسا۔ ''تم اکیس بائیس برس کی عمر کی لگتی ہو۔ اس سے زیادہ نہیں۔''

وہ یوگا چھوڑ کر لان میں رکھی سفید کرسی پر جا بیٹھی۔

''کیا ناراض ہو گئیں؟'' وہ ماؤنٹین پوز کرنے کے لیے کھڑا ہو گیا تھا۔

''اونہوں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔ ''میں ہفتے میں صرف تین دفعہ یوگا کرتی ہوں، آج وہ دن نہیں ہے۔'' وہ سر ہلا کر خاموشی سے یوگا کرتا رہا۔ کتنی ہی دیر خاموشی چھائی رہی۔ دور جنگل سے جانوروں کے بولنے کی آوازیں وقفے وقفے بعد سنائی دے رہی تھیں۔

''کتنے بجے جانا ہے کالام؟'' وہ اس سے کوئی بات کرنا چاہتی تھی، سو یہی پوچھ لیا۔

''ظفر نے آٹھ بجے کا کہا تھا۔'' اپنی مشق ختم کر کے اس نے گھاس پر رکھی کیپ، جو اس نے لیٹنے سے پہلے اتار دی تھی، اٹھا کر سر پر رکھی اور میز پر پڑی گھڑی اپنی بائیں کلائی میں پہننے لگا۔

"تم پہلے کتنی دفعہ ان علاقوں میں آ چکے ہو؟"

"دو مرتبہ پہلے آیا تھا، ایک بار تب جب گیشر بروم ٹو سر کرنے آیا تھا اور دوسری بار... پہلے۔" وہ گھاس پر بیٹھا جوگرز پہن رہا تھا۔

"دو سال پہلے کیوں آئے تھے؟"

"یونہی۔" وہ سر جھکائے جوگرز کے تسمے بند کرتا رہا۔ پریشے جواب کے انتظار میں... ہاتھوں پر نگاہیں مرکوز کیے رہی، بائیں کلائی میں پہنی گھڑی کو آج پہلی دفعہ اس نے غور سے... تھا۔ اس کے سیاہ چمکتے ڈائل کے درمیان میں ہیروں کا چھوٹا سا اہرام بنا تھا۔

"اچھی ہے نا میری گھڑی؟ سکندریہ سے لی تھی۔ مصری اپنا ٹریڈ مارک ہر چیز میں بڑ... سے ڈالتے ہیں۔" وہ ہنس کر کہتا ہوا پینٹ جھاڑتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"یہ ہمارے وائٹ پیلس میں آخری دو گھنٹے ہیں۔ آؤ یہاں گھومتے پھرتے ہیں۔"... کے ہمراہ سیڑھیوں کی طرف چلی آئی۔

"تم نے وہ کمرہ دیکھا ہے پہلی منزل، جسے رائل سوئٹ کہتے ہیں، اس میں ملکہ الز... تھی۔" وہ سیڑھیوں سے اترتے ہوئے اس کو اس تین سو سال قدیم وائٹ پیلس کی تاریخ... اس نے بے اختیار جماہی روکی۔

"یہ ہوٹل پہلے والئی سوات کا محل تھا۔ پھر......" وہ سیڑھیاں اترتے ہوئے اسے بتا... رہا تھا۔ وہ بور ہونے لگی تھی۔ اسے وائٹ پیلس کی تاریخ سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، مگر محض ا... رکھنے کو وہ سنتی رہی۔

موروں کا پنجرہ پیچھے چھوڑ کر وہ نیچے روش پر آئے تو وہ بڑا سا لان خاموشی میں ڈوبا... کے اختتام پر ناشپاتی کا درخت تھا، جس کے ساتھ کرسی ڈالے بوڑھا سیکیورٹی گارڈ بیٹھا تھا۔

"تم کیا ہر سال یونہی سیر و سیاحت کے لیے نکل جاتے ہو؟" وہ دونوں چلتے چلتے... ایک طرف بنے نیلی ٹائلز والے فوارے کی منڈیر پر بیٹھ گئے۔

"ہر سال؟ میں تو سال کے دس مہینے نگر نگر پھرتا ہوں۔ میں پیدائشی سیاح ہوں۔ مجھے... ایکسپلور (دریافت) کرنے کا شوق ہے، اس کو گھوم پھر کر دیکھنے کا شوق ہے۔ سیاحت... زندگی بدل ڈالتی ہے۔ آپ ایک دفعہ پہاڑوں پر نکل جائیں تو واپسی پر آپ ویسے نہیں...

آپ بدل جاتے ہیں پہاڑوں کا سفر انسان کو بدل ڈالتا ہے۔ اس کے بعد "Life is never the same agin" میسنر نے کہا تھا، اگر عالمی لیڈرز چند دن کسی پہاڑ پر اکٹھے چڑھتے گزار... یں، تو دنیا کے تمام معاملات اور مسائل حل ہو سکتے ہیں اور اگر دو اچھے کوہ پیما بھی چند دن راکاپوشی پر ساتھ گزار دیں تو یقین کرو ان کے بھی سارے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔" افق نے بڑی سنجیدگی بھری معصومیت سے کہا تھا۔ وہ مسکرا دی۔

"ہو سکتا ہے، مسائل بڑھ جائیں۔"

"کم آن۔ تم ایک کلائمبر ہو، تمہیں دنیا کا سب سے خوب صورت پہاڑ دیکھنا چاہیے۔"

"میں نے تصویروں میں دیکھ رکھا ہے۔"

"تمہیں اسے سر کرنا چاہیے!"

"وہ میں خیالوں اور خوابوں میں کئی دفعہ کر چکی ہوں۔"

"مگر تمہیں "میرے" ساتھ سر کرنا چاہیے۔" اس نے "میرے" پر زور دیا۔

"ناممکن ہے کیوں کہ پاپا مجھے قراقرم کی شکل دوبارہ نہیں دیکھنے دیں گے، میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں۔ یہ گارڈ کہاں جا رہا ہے؟" اس کے اصرار سے بچنے کی خاطر اس نے اس کی توجہ بوڑھے گارڈ کی طرف دلائی، جو کسی کام سے ہوٹل کی عمارت کی طرف جا رہا تھا۔ افق نے گردن پھیر کر اسے دیکھا۔ "اس کو شاید کسی نے بلایا ہے۔"

"تم نے کبھی چوری کی ہے؟" افق نے گردن واپس گھما کر آنکھیں سکیڑ کر مشکوک نظروں سے دیکھا۔ "نہیں!"

"میں نے بھی نہیں کی مگر اب میرا دل کر رہا ہے۔"

"چوری کرنے کا؟"

"نہیں، تم سے کروانے کا۔" اس نے معصومیت سے کہا۔

"مطلب کیا ہے تمہارا؟" افق نے اسے گھورا۔

"تم جانتے ہو، تم بہت گڈ لکنگ ہو۔"

"میں خوشامد سے متاثر نہیں ہوتا۔ سوری!"

"اور تم ایک بہت اچھے انسان بھی ہو۔"

''میں سچ سن کر بھی غلط کام نہیں کرتا۔''

''اور میں دعا کروں گی کہ تم راکاپوشی سر کرلو۔ اگر تم مجھے اس درخت پر سے ایک ناشپ
لادو تو!''

وہ چند لمحے خاموشی سے اسے گھورتا رہا، پھر بولا ''بہت بہتر۔ لاتا ہوں۔'' وہ چند
فاصلے پر اگے درخت تک گیا اور ہاتھ بڑھا کر ایک شاخ کو اتنی زور سے پکڑا کہ اس پر بیٹھ
سہم کر اڑ گئی۔

''اوہ۔ تم نے اسے ڈرا دیا۔'' پری نے تاسف سے آسمان پر اڑتی چڑیا کو دیکھا۔

شاخ ہاتھ میں پکڑے، افق نے رک کر بغور اسے دیکھا۔ پھر مسکرا دیا۔ ''تم میری ز
آنے والی پہلی لڑکی ہو، جو چڑیا کی پروا اور موروں سے سوری کرتی ہے۔''

(زندگی میں؟ کیا وہ اس کی زندگی میں آچکی تھی؟)

''ادھر ترکی میں ہوتی ہیں ناشپاتیاں؟'' اس نے بے تکا سا سوال کیا۔

''ترکی میں سب کچھ ہوتا ہے۔'' اس نے ہاتھ بڑھا کر ایک موٹی تازی رسیلی سی ناشپاتی

''اس کو میں مبالغہ آرائی کہوں؟''

''نہیں، تم اس کو ایک محبِ وطن ترک کا فخر کہو۔'' وہ مسکراتا ہوا ناشپاتی لیے اس کے قریب

''یور ہائینس، ایک ترک سیاح کی طرف سے یہ حقیر سا تحفہ قبول فرمائیں۔'' اس نے
ناشپاتی ہتھیلی پر رکھے اس کی طرف بڑھائی۔

''شکریہ، ویسے کیا سارے ترک چوری کے تحفے دیتے ہیں؟'' اس نے اسے چڑا
ناشپاتی اٹھا لی۔

''کوئی پری مانگے تو دے بھی دیتے ہیں۔'' وہ اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ دونوں فو
کنارے بیٹھے تھے اور ٹانگیں نیچے لٹکا رکھی تھیں۔

''یہ ایک یادگار ناشپاتی ہوگی۔ میں شروع کروں گی اور تم ختم۔ ٹھیک؟'' پریشے
کی ایک بائٹ لی، اس کا ذائقہ منہ میں محسوس کیا اور اگلے ہی پل اس کی ہنسی چھوٹ گئی۔

''ہنس کیوں رہی ہو؟''

''یہ ناشپاتی نہیں ہے، افق! ہمارے ساتھ تو دھوکا ہو گیا۔ یہ تو ببو گوشہ ہے۔'' وہ مسلہ

تھی۔

''اور کرواؤ چوریاں۔ دیکھ لیا، یہ ہوتا ہے چوری کا انجام۔ تم ناشپاتی سے ملتے جلتے پھل کو ناشپاتی
سمجھ کر دھوکا کھا گئیں۔ بہت اچھا ہوا۔'' وہ مصنوعی انداز میں ڈانٹ رہا تھا۔ وہ ہنستی جا رہی تھی۔

''اچھا سنو، مجھے بھی چکھاؤ اور اس کو ختم نہیں کرنا۔ یہ ہم اس فوارے کے پیچھے رکھ دیں گے۔
یہ ہماری یادگار ہے۔ کبھی ہم دوبارہ ادھر آئے تو اسے ضرور ڈھونڈیں گے۔'' اس نے ایک بائٹ لے
کر ادھ کھائے بگو گوشے کو فوارے کے پیچھے کر کے ایک جگہ چھپا دیا اور وہ جو ہنسے جا رہی تھی، یک
دم رک گئی۔

''کبھی ہم دوبارہ ادھر آئے......؟'' ''ہم......؟ افق نے ''ہم'' بولا تھا؟ مگر کیوں؟
اس نے ایک نگاہ اپنی انگلی میں پہنی انگوٹھی پر ڈالی اور پھر سر جھکا لیا۔ مستقبل کسی آٹھ ہزار میٹر
پہاڑ کی چوٹی کی طرح دھند میں لپٹا تھا۔

☆......☆......☆

جمعہ، 29 جولائی 2005ء

''ارسہ تم اپنے ناول میں یہ بھی لکھنا کہ جب ہم لوگ...... سوری، میرا مطلب ہے جب
تمہارے کردار کالام کی مال روڈ پر پہنچے تو وہاں مری مال روڈ کی طرح کا رش تھا، پورے پاکستان
کے لوفر لڑکے وہاں جمع تھے اور یہ بھی لکھنا کہ کالام سے روز صبح نو بجے کرائے کی لینڈ کروزرز، جیپیں
اور پجارو دو مختلف ''روٹس'' پر جاتی ہیں اور سنو تم یہ بھی لکھنا کہ تمہارے کردار آنسو جھیل والے روٹ
کے بجائے ماہوڈھنڈ جھیل والے روٹ پر جا رہے تھے، ہماری طرح......اور......''

وہ چاروں آگے پیچھے مال روڈ کے کنارے پر چلتے ہوئے دائیں طرف بہتے دریا پر بنے اس
لکڑی کے پل کی طرف جا رہے تھے، جس کے دوسری طرف سڑک پر لینڈ کروزرز اور پراڈوز کی
لمبی قطار کھڑی تھی، ان کرائے کی گاڑیوں کے ماہر ڈرائیور اپنے اپنے مسافروں کا انتظار
کر رہے تھے۔

''آگے میں بتاتا ہوں ارسہ! آگے تم لکھنا، ان کے پاؤں کے نیچے سڑک تھی اور سر پر آسمان
اور دریا کا پانی شور بہت مچاتا تھا......'' وہ ارسہ کو جس طرح کے مشورے دے رہی تھی، اس انداز
کو نقل کرتے ہوئے وہ بولا تو پریشے نے برا سا منہ بنایا۔

''زیادہ بولنے کی ضرورت نہیں ہے تمہیں۔ میں اسے صرف مشورہ دے رہی تھی۔''

''ہاں تو میں بھی مشورہ ہی دے رہا ہوں۔'' وہ اسے چڑا رہا تھا، وہ خفگی سے ر

تیز کر کے آگے نکل گئی۔

''سنو ارسہ! ایک خبر سناؤں؟'' پیچھے آتے افق نے دانستہ بلند آواز میں محض ا

غرض سے کہا، پریشے نے چلتے ہوئے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔

''ارسہ، توماز ہومر پاکستان میں ہے۔''

کانوں پر ہاتھ رکھنے کے باوجود اسے سنائی تو دیا تھا، خبر ہی ایسی تھی کہ وہ جھٹکے

پوری آنکھیں کھول کر اس کو دیکھا۔ ''واقعی؟ کدھر؟ کالام میں ہے؟''

''میں تو ارسہ کو بتا رہا تھا۔'' وہ تپانے والی مسکراہٹ کے ساتھ بولا۔

''ہاں تو اسے ہی بتاؤ، میں کون سا سن رہی ہوں۔'' اس نے شانے جھٹکے اور آگے

''ویسے ارسہ، وہ نانگا پربت جا رہا ہے۔''

''میں نہیں سن رہی۔'' پریشے نے کانوں پر ہاتھ رکھ کر اتنی بلند آواز میں کہا

گزرتے دو لڑکے رک کر اسے دیکھنے لگے۔

''تم لوگ کیا سڑک کے بیچ میں کھڑے ہو کر ٹین ایجرز والی حرکتیں کر رہے ہو؟''

نے گھر کا تو اسے احساس ہوا اور پھر پل پار کرنے تک وہ سارا راستہ خاموش رہی۔

وہ اس گرے اور سلور پیراڈو پر ماہوڈھنڈ کے روٹ پر جا رہے تھے۔ زیادہ

ڈھنڈ ہی جا رہی تھیں، آنسو جھیل کی طرف سیاح بہت کم جاتے تھے۔ کرائے کی ان

ڈرائیور پرخطر راستوں پر ڈرائیونگ میں مہارت رکھتے تھے۔ لاہور، کراچی میں گاڑ

عام ڈرائیور کالام سے آگے کے ان راستوں پر گاڑی نہیں چلا سکتا تھا۔

وہ پراڈو کے ساتھ کھڑی ہو گئی۔ ڈرائیور اسے پہچان گیا تھا۔ کل شام کالام پہنچ

پریشے ہی تو تھی، جس نے ظفر کے ساتھ اس ڈرائیور سے آج کی سواری کا سودا طے

سو دینا چاہتا تھا جب کہ ڈرائیور پندرہ سو مانگ رہا تھا۔ پریشے کو تین سو روپے کے لیے

نہیں لگی، سو اس نے معاملہ خود ہی طے کرا دیا تھا۔

وہ پراڈو کے ساتھ کھڑی پل کی جانب دیکھنے لگی، جہاں وہ تینوں آگے پیچھ

تھے۔ افق سب سے آگے تھا۔ سیاہ جینز، میرون شرٹ، سفید ٹورسٹ جیکٹ، گردن میں سرخ

، سر پر پی کیپ، پاؤں میں جوگرز اور کندھے پر بیگ پیک اٹھائے چیونگم چباتا وہ اس کی جانب آ

رہا تھا۔

رنگوں کے اس امتزاج پر پریشے کو حیرت ہوئی تھی، کیوں کہ اس نے خود بھی سیاہ ٹراؤزرز کے

میرون، کشمیری کڑھائی والا کرتا اور بڑا سا دوپٹہ لے رکھا تھا۔ بالوں کو اس نے کیچر میں باندھ

رکھا تھا اور پاؤں میں گلابی اور سفید جوگرز تھے۔

افق پراڈو کی اگلی جب کہ وہ تینوں پچھلی سیٹ پر بیٹھی تھیں۔ وہ ڈرائیونگ سیٹ سے بالکل پیچھے

بیٹھی تاکہ اسے افق کا چہرہ ٹھیک سے دکھائی دے۔ اسے خود پر بھی حیرت ہوئی کہ جب وہ مری میں

ملے تھے تو وہ اس سے بات تک نہیں کر رہی تھی اور اب وہ کتنے اچھے دوست بن چکے تھے۔ اس سفر

کو ابھی پانچ دن بھی نہیں ہوئے تھے اور یوں لگتا تھا کہ جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔

پراڈو پرخطر راستوں پر دوڑنے لگی تو وہ کھڑکی سے باہر دائیں طرف بہتے نیلے دریا کو دیکھنے

کے بجائے افق سے پوچھنے لگی، ''تمہیں کیسے پتا کہ توماز پاکستان آیا ہوا ہے؟''

''میں اس کا میڈیا ایڈوائزر تو ہوں نہیں، ظاہر ہے اخبار میں ہی پڑھا ہے۔''

''تم اس سے کبھی ملے ہو؟'' اسے جاننے کا بہت اشتیاق تھا۔

''پریشے جہاں زیب، یہ کلائمبنگ ورلڈ بہت چھوٹی اور گول ہوتی ہے، یہاں درجنوں بار آپ

ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ میں توماز سے پچھلی بار نانگا پربت پر ٹکرایا تھا، وہ آ رہا تھا اور میں جا

رہا تھا۔''

''کیسا ہے دیکھنے میں؟ اتنا ہی گڈ لکنگ جتنا تصویروں میں آتا ہے؟''

''اب میں اس سے جیلیس ہو رہا ہوں اس لیے پلیز اس موضوع کو بند کر دو۔'' وہ مسکین سی

صورت بنائے ہاتھ جوڑ کر بولا تو وہ بڑبڑاتی ہوئی کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔

''ویسے پری۔'' اس نے محض چھیڑنے کی غرض سے اسے پکارا، ''تمہاری گورنمنٹ ان علاقوں

میں گیس کیوں نہیں لاتی؟ یہ لوگ دیار کی قیمتی لکڑی کو ایندھن کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔''

''گورنمنٹ وردی اتار دے یہ بہت ہے۔ گیس بھی آتی رہے گی۔'' نشاء گورنمنٹ کے ذکر پر

بدمزہ ہو گئی تھی۔ وہ ہنس پڑا۔ پریشے خاموش رہی کیوں کہ غیر ملکیوں کے سامنے وہ اپنے ملک کی کسی

خامی کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس نے دل ہی دل میں دعا کی کہ افق کو چھوڑ دے۔ چور نظروں سے اس نے ارسہ کو بھی دیکھا۔ ارسہ نے بات سنی ہی نہیں تھی کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے کچھ تلاش کر رہی تھی۔

''کیا ہوا ارسہ؟''

''وہ...... ابھی آتا ہے تو دکھاتی ہوں...... پچھلے سال تو ادھر ہی تھا۔ پتا نہیں کدھر...'' دور تک پھیلے پہاڑی سلسلے کو متلاشی نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

''مگر تھا کیا؟''

''پہاڑ تھا، پتا نہیں کدھر گم ہو گیا ہے۔'' وہ فکر مند سی تھی۔

''لیں...... ان کی سنیں۔ پہاڑ بھی گم ہوئے ہیں ارسہ میڈم؟'' افق خوب ہنسا تھا۔ ... سنا ہی نہیں۔

''مجھے لگتا ہے اس ڈرائیور کی گاڑی کے مالک سے کوئی دشمنی ہے، تب ہی اتنے... ڈرائیو کر رہا ہے۔ ابھی پہیہ ادھر ہوا اور ہم گئے نیچے۔'' نشاء نے پریشے سے انگریزی... نے کھٹ سے وہی بات ڈرائیور سے کہہ دی۔

''باجی! یہ امارہ روز کا روٹ ہے، آپ نہیں گرو گی، اللہ خیر کرے گا۔'' وہ جھینپ کر بولا...

''آپ۔'' ایسے کہہ رہا ہے جیسے ہم اکیلے گریں گے، خود بھی تو ساتھ ہی گرے گا... زیر لب بڑبڑائی۔ اسے اتنے پرخطر راستے سے بہت خوف آ رہا تھا۔

افق تصویریں بنا رہا تھا، ارسہ ابھی تک پریشانی سے کچھ ڈھونڈ رہی تھی۔ پریشے... دیکھتے ہوئے پوچھا، ''کتنا فاصلہ رہ گیا ہے؟''

''گھنٹے تک اشوویلی پہنچ جائیں گے۔'' جواب افق نے دیا تھا۔ وہ آج بہت بول... خاصے ہشاش بشاش موڈ میں تھا۔ ''پہلے اشوویلی رکیں گے پھر گلشیئر پھر آبشار پر اور آخر... جہاں ہم آج رات گھاس پر گزاریں گے۔ پری! تم اس ملک میں رہتی ہو اور تم نے ا... جگہیں......''

''وہ آ گیا۔ وہ دیکھو۔ بالکل سامنے۔'' ایک دم ارسہ خوشی سے چلائی تھی، ''وہ سامنے دیکھو...... شاہگوری!''

''شاہگوری؟ ادھر؟ کالام میں؟'' پریشے نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں دیکھا، جہاں بالکل سامنے جامنی پہاڑوں کے سلسلے کے درمیان ایک الگ سا برف سے ڈھکا سفید پہاڑ کھڑا تھا۔

''یہ شاہگوری ہے؟ مگر شاہگوری تو سکردو سائیڈ پر ہے...... قراقرم کے پہاڑوں میں...... ہے نا افق؟'' اس نے الجھ کر افق کو مخاطب کیا، مگر وہ اپنی گود میں رکھے کیمرے کو دیکھ رہا تھا، اس نے جواب نہیں دیا۔

''یہ شاہگوری نہیں ہے، مگر مقامی لوگ اسے شاہگوری کا چھوٹا بھائی کہتے ہیں۔ بالکل وہی اہرام نما شکل ہے اس کی۔ ویسا ہی دکھتا ہے ناں؟'' ارسہ بڑی خوشی خوشی بتا رہی تھی۔

''واقعی...... بالکل ویسا ہی ہے۔'' اس کے لہجے میں فخر اتر آیا تھا۔ آخر شاہگوری، دنیا کی دوسری بلند ترین چوٹی اس کے ملک میں تھی، وہ فخر کیوں نہ کرتی؟

''ویسے افق! شاہگوری کا نام کے ٹو کس نے رکھا تھا؟'' افق اپنے کیمرے میں مصروف تھا، اس نے جواب نہیں دیا۔

''افق!'' پریشے نے پھر اسے پکارا۔

''پتا نہیں، مجھے یہ سیٹ کرنے دو نا۔'' وہ کیمرے پر جھکے بے زاری آواز میں بولا۔ پریشے نے بری طرح چونک کر اسے دیکھا۔

''میں بتاتی ہوں پری آپی! جب کیپٹن ٹی جی منٹگمری نے قراقرم کے پہاڑوں کا سروے کیا تھا تو اس نے جس ترتیب سے پہاڑ دیکھے تھے، اسی ترتیب سے ان کا نام رکھ دیا تھا۔ کے ون، کے ٹو، کے تھری اور کے فور وغیرہ۔''

''کے سے کیا مراد ہے؟'' نشاء نے پوچھا۔

"K is for karakoram" وہ مزے سے بولی۔ ''ہے نا پری آپی؟'' اس نے تائید چاہی۔

''ہوں!'' پریشے نے تو اس کی بات ٹھیک سے سنی بھی نہیں تھی۔ وہ تو افق کو دیکھ رہی تھی جو سر جھکائے کیمرے کے بٹنز خوامخواہ دبا رہا تھا۔ صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اس کا ذہن کہیں اور ہے۔ وہ ایک دم اتنا بے زار اور اکتا کیوں گیا تھا، وہ سمجھ نہیں سکی تھی۔

اشوویلی پہنچنے تک سارا راستہ وہ اور افق خاموش رہے تھے۔ وہ اپنے کیمرے پر جھکا رہا اور

پریشے خالی الذہنی کی کیفیت میں کھڑکی سے باہر، نیچے بہتے نیلے دریا کو دیکھتی رہی۔

کبھی کبھی اس کا دل چاہتا تھا کہ افق اس سے کچھ کہے۔ اپنے اور اس کے نامعلوم تعلق کی وضاحت کرے۔ اسے بتائے کہ وہ اس کے لیے کیا سوچتا ہے۔ وہ جاننا چاہتی تھی دونوں کے درمیان اگر کچھ ہے تو وہ کیا ہے مگر یہ سب وہ اس سے کہنے سے قاصر تھی۔

اشو، فلک بوس پہاڑوں کے درمیان بنی ایک چھوٹی سی وادی تھی، جس کے درمیان دریا بہتا تھا۔ وادی میں سیاحوں کی خاصی گہما گہمی تھی۔ ان کی پراڈو کے ساتھ پجارو اور جیپ ایک پورا قافلہ کالام سے نکلا تھا، ان میں سے تقریباً سب ہی گاڑیاں اشو میں رک گئی تھیں پیچھے آرہی تھیں۔

"آؤ۔ اس کیبن میں چلتے ہیں۔" یہ پہلی بات تھی جو ادھر آ کر افق نے کی تھی۔ اس نے کر اسے دیکھا پھر اس کے پیچھے چل دی۔

سڑک کے دائیں طرف نیچے شور مچاتا نیلا دریا بہہ رہا تھا۔ سڑک کے بالکل دہانے پر کے اوپر لکڑی کا ایک کیبن سا بنا تھا۔ اس کا فرش لکڑی کے تختوں کا تھا، جن کی درزوں سے نیچے بہتا نیلا دریا دکھائی دیتا تھا۔

وہ جس طرف سے کیبن میں داخل ہوئے وہ کھلی تھی۔ باقی تین اطراف میں نیچے کر کے تختے لگے تھے اور وہ کیبن بالکل بالکونی لگ رہا تھا۔

کیبن میں دونوں طرف لکڑی کے بنچ اور درمیان میں لکڑی کی بنی میز رکھی تھی، وہ ایک آخری سرے پر ٹک گئی، تاکہ بائیں طرف بہتا دریا اچھی طرح دیکھ سکے۔ نشاء اور ارسہ آئی تھیں، وہ کولڈ ڈرنک لینے چلی گئی تھیں۔ افق لکڑی کی ریلنگ کو تھامے جھک کر نیچے دیکھ رہا تھا۔

"سنو!" اس نے افق کو پکارا، مگر دیوقامت سرمئی پتھروں سے ٹکراتے نیلے پانی کا شور تھا کہ وہ سن نہ سکا۔ وہ اٹھ کر اس کے قریب آگئی۔

"سنو، تمہارا موڈ کیوں خراب ہوا تھا؟" لکڑی کی ریلنگ سے پشت ٹکا کر اسے کھڑی دریا پشت پر اور افق سامنے تھا۔

وہ چونک کر سیدھا ہوا، "میرا موڈ؟ نہیں تو۔"

"کبھی کبھی تم اتنے اجنبی بن جاتے ہو کہ....." وہ رک گئی اور گردن پھیر کر پیچھے بہتے دریا کو دیکھنے لگی۔

"کہ؟" وہ بغور اسے دیکھ رہا تھا۔

"کہ مجھے خوف آنے لگتا ہے۔" نیچے بہتے نیلے پانی اور اس کے سفید جھاگ پر نظریں جمائے وہ سرگوشی میں بولی۔

"اچھا؟" وہ ہولے سے ہنس دیا۔

پریشے نے رخ موڑ کر سنجیدہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "اس روز جلیل کے ریسٹورنٹ میں بھی تم ایسے ہو گئے تھے۔ مجھے دکھانے کو بلی کو پیار کر رہے تھے۔ ہے ناں؟"

"تمہیں وہ بات ابھی تک یاد ہے؟" وہ جواب دیئے بنا گردن پھیر کر پانی کو دیکھنے لگی۔

"آئی ایم سوری فار دیٹ پری، میں..... بس..... پتا نہیں کبھی کبھی مجھے کچھ ہو جاتا ہے۔" اس نے گردن موڑ کر اسے نہیں دیکھا، وہ یونہی پیچھے دریا کو دیکھتی رہی۔ چند لمحے خاموشی کی نذر ہو گئے۔ پتھروں سے سر پٹختے پانی کے شور کے باوجود اسے بہت خاموشی محسوس ہو رہی تھی۔

"جانتی ہو پری! جب میں نے تمہیں مارگلہ کی پہاڑیوں پر پہلی دفعہ دیکھا تھا تو مجھے کیا لگا؟ مجھے لگا میں واقعی کسی پری کو دیکھ رہا ہوں۔ تم نے وائٹ اور پنک رنگ پہن رکھا تھا، تمہیں یاد ہے؟ میں یوں کبھی بھی اجنبیوں سے فرینک نہیں ہوتا، میری طبیعت کچھ اور ہے۔ موڈی کہہ لو، اکھڑ کہہ لو..... مگر تم سے بات کرنے کو میرا دل چاہا تھا۔"

کیبن کے دائیں طرف سے دھوپ اندر آنے لگی تھی، سورج کی شعاعیں براہ راست پریشے کے چہرے پر پڑ رہی تھیں، وہ اس کے دائیں طرف سے آکر کھڑا ہو گیا، دھوپ کا راستہ رک گیا تھا۔

"تمہیں دیکھ کر مجھے یوں لگا تھا جیسے میں تمہیں جانتا ہوں، ہزاروں برس سے جانتا ہوں، تم میری ذات کا وہ گمشدہ حصہ ہو۔ جو ٹوٹ کر الگ ہو گیا تھا۔ ہم دونوں صدیوں پہلے کسی اور دنیا میں بچھڑے تھے اور اس روز مارگلہ کی پہاڑیوں پر پھر سے مل گئے تھے۔ تمہیں ایسا لگتا ہے پری؟"

پریشے نے سر جھکا لیا اپنے جوگرز تلے لکڑی کے تختوں کی درزوں سے اسے جھاگ اڑاتا نیلا پانی نظر آ رہا تھا۔

وہ کتنی ہی دیر اس کے جواب کا انتظار کرتا رہا، وہ کچھ نہ بولی۔ تب ہی اسے ارسہ کی آواز سنائی دی، وہ افق کو بلا رہی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ چند گز کے فاصلے پر کھڑی دور ہی سے بہت

بلند آواز میں اسے کسی ٹریک کا بتا رہی تھی۔ وہ سر ہلا کر پریشے کے دائیں طرف سے ہٹ گیا۔ کی تیز شعاعیں اس کے چہرے سے ٹکرائی تھیں، اسے لگا وہ اس کے جانے سے ایک دم تنہا ہو۔ بھری دھوپ میں بالکل تنہا۔

ارسہ کی طرف جاتے افق کی پشت کو دیکھتے ہوئے اس کی آنکھوں کے گوشے بھیگتے چلے

ان دونوں کا سات دنوں کا ساتھ تھا، دو دن مزید رہ گئے تھے، پرسوں انہوں نے واپس جانا تھا، پھر راستے اور منزلیں جدا ہو جانی تھیں۔ وہ اپنی شادی کی تیاریوں میں مگن ہو جائے وہ ترک کوہ پیما دنیا کی سب سے حسین چوٹی سر کر کے واپس چلا جائے گا اسے تو شاید یاد بھی نہ کہ مارگلہ کی پہاڑیوں پر جب بادل نیچے اترے ہوئے تھے، تب اسے بیچ سڑک پر ایک لڑکی ملی وہ بھلا دے گا کہ اس لڑکی کے ساتھ اس نے سوات کے مرغزاروں میں نو دن بتائے تھے، وہ جو صدیوں پر بھاری تھے۔ یہ سب جانتے ہوئے بھی کہ وہ مسافر تھا اور وہ جانے کے لیے آیا خود اس کی سیف سے تین ماہ بعد شادی ہونے والی تھی، وہ اس مسافر سے محبت کرنے لگی تھی۔

سختی سے آنکھیں رگڑ کر وہ نیچے شور مچاتے دریا کو دیکھنے لگی۔

☆......☆......☆

گلیشیئر پر گاڑی نہیں روکی گئی، ان کے خیال میں یہ وقت کا ضیاع تھا۔ آبشار تک کے راستے میں گاڑی میں خاموشی چھائی رہی۔ نشاء سو رہی تھی۔ ارسہ سٹیفن کنگ کا ناول پڑھ رہی افق کھلی کھڑکی پر کہنی جمائے مسلسل باہر دیکھ رہا تھا۔ اب دریا اس کی طرف تھا جب کہ پریشے پربتوں پر نگاہیں ٹکائے کسی بیتے لمحے کے فسوں میں کھوئی تھی۔

اس کے ذہن میں افق کے الفاظ گردش کر رہے تھے۔ وہ کیا کہنا چاہتا تھا؟ وہ کیا نہیں کہہ تھا؟ کوئی اظہار، کوئی اعتراف، کوئی اقرار؟ یا پھر وہ محض لفظوں سے کھیل رہا تھا اور وہ یک طرفہ کا شکار تھی۔ جس قطرے جتنی محبت کو اس نے سیپ میں بند کر دیا تھا، وہ قید رہ کر بھی موتی بن تھا۔ اسے یہ ادراک خاصی دیر سے ہوا تھا۔

وہ آبشار بہت بلندی سے گر رہی تھی۔ اس کا منبع پہاڑ کی چوٹی کے قریب تھا، وہاں سے بہہ ہو کر وہ کئی سوفٹ نشیب میں سڑک تک آتی تھی اور سڑک کے نیچے سے ہو کر شور دریا میں گر تھی۔

سڑک کے کنارے چند کولڈ ڈرنک کارنرز بنے تھے۔ وہاں خاصی گہما گہمی تھی۔ ان کے آنے سے پہلے بھی وہاں خاصی بڑی تعداد میں بچے، بوڑھے، نوجوان جوڑے اور فیملیز گھوم پھر رہی تھیں۔ چند لڑکے پتھروں پر چڑھتے ہوئے اوپر آبشار کے منبع تک جا رہے تھے۔ ایک سبز کیپ والا لڑکا سب سے آگے تھا۔

"مجھے یقین نہیں آ رہا کہ اتنی بڑی آبشار پاکستان میں ہے۔" نشاء نے ان تینوں کے ہمراہ پتھروں پر اوپر چڑھتے ہوئے بے اختیار کہا تھا۔ وہ پتھر آبشار کے کنارے پر ہی تھے، اتنے خطرناک کہ ذرا پاؤں پھسلے اور بندہ پانی میں جا گرے۔ تیز رفتار بہتے پانی میں تو یوں بھی لاش نہیں ملا کرتی۔

"میں نے ہمیشہ خوب صورتی کے بارے میں ناران کاغان کا نام سنا تھا۔"

"نشاء مائنڈ مت کرنا مگر ناران کاغان اتنے خوب صورت نہیں جتنا ان کو کہا جاتا ہے۔ وہاں پہاڑ قدرے خشک ہیں اور واحد خوب صورتی جھیل سیف الملوک ہے، جس پر پریاں اترتی ہیں۔ ناران کاغان کو اگر کوئی پاکستان کا بہترین تفریحی مقام سمجھتا ہے تو اس نے یقیناً کالام اور سوات کا حسن نہیں دیکھا ہوتا۔ میں ان دونوں جگہوں کو کئی بار وزٹ کر چکا ہوں اور میری رائے میں ناران، کاغان، شوگران، یہ سب جگہیں سوات اور کالام سے زیادہ حسین نہیں۔"

وہ آگے پیچھے سرمئی پتھروں پر چڑھ رہے تھے۔ نشاء اور ارسہ کھانے پینے کی جگہ پر رک گئی تھیں، افق کو ایک خالی چارپائی نظر آئی اس نے کسی محنتی مزدور کی طرح وہ چارپائی اپنے کندھے پر اٹھائی اور اوپر چڑھنے لگا۔

"بس یہیں رکھ دو۔" وہ سڑک سے کافی اوپر پتھروں پر چڑھتے ہوئے آ گئے تھے، افق نے اس کے کہنے پر پتھروں اور پانی کے درمیان چارپائی رکھ دی۔

"گندے بچوں کی طرح جوتے اتار کر پانی میں پاؤں مارنا مجھے ہمیشہ سے بہت اچھا لگتا ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے جوگرز، جرابیں اتار کر چارپائی پر رکھیں اور اس پر بیٹھ کر سیاہ ٹراؤزر ٹخنوں سے کافی اوپر تہہ کر کے اپنے سپید پاؤں ٹھنڈے پانی میں ڈال دیئے۔ افق بھی ساتھ بیٹھ گیا مگر اس نے جوگرز نہیں اتارے۔

"تم بھی جوتے اتار دو نا، اتنا مزہ آ رہا ہے۔" وہ بچوں کی طرح پانی میں اپنے پاؤں سے دائرے بنا رہی تھی، افق نے مسکرا کر سر نفی میں ہلا دیا۔

''کم آن افق، جوتے اتار دو۔ پانی اتنا ٹھنڈا ہے، لگتا نہیں یہ جولائی کا مہینہ ہے۔'' افق پھر بھی جوتے نہیں اتارے۔ اس کے بجائے اس نے قدرے جھک کر ہاتھ پانی میں ڈال دیے۔

''تم جوگرز بھی اتار دو۔'' پری نے تیسری دفعہ اصرار کیا۔

''نہیں، میں ٹھیک ہوں۔'' وہ گردن اونچی کر کے اوپر پہاڑ سے پھوٹتی آبشار کو دیکھنے لگا۔ اسے حیرت ہوئی تھی وہ اس کی بات فوراً مان جاتا تھا، تو اب؟

''یہاں پر ایک ہوٹل بنایا جا سکتا ہے مگر اس کے لیے پہلے ان کو اس علاقے کی مٹی کے ٹیسٹ کرانے پڑیں گے اور......''

''میں بھول گئی تھی کہ تم انجینئر ہو یاد کروانے کا شکریہ۔'' وہ اس کی بات پر ہنس پڑا۔

''بہت جلدی بھول جاتی ہو، مجھے بھی اتنی جلدی بھول جاؤ گی؟''

''ویسے تم نے کس چیز میں انجینئرنگ کی ہے؟'' وہ اس کا سوال نظر انداز کر کے جھکی ہوئی میں ہاتھ مار رہی تھی۔

''میں جیولوجیکل انجینئر ہوں۔''

''اوہ...... پھر ہم پاکستانیوں کے تو کسی کام کے نہیں ہو۔'' گرتے پانی سے چھینٹے اڑ رہے تھے وہ چہرے پر آئے پانی کے چھینٹے صاف کرتے ہوئے سیدھی ہو کر شرارت سے مسکرائی۔ ''کیوں پاکستان میں زلزلے نہیں آتے۔''

''اچھا؟''

''ہاں...... آخری زلزلہ 80 سال پہلے کوئٹہ میں آیا تھا، اس سے غالباً 35 ہزار لوگ مرے تھے۔ پھر اس کے بعد ایسا زلزلہ نہیں آیا۔ اس لیے تم ہمارے تو کسی کام کے نہیں ہو۔''

''ڈاکٹر صاحبہ، میری معلومات کے مطابق صرف بلوچستان میں ہی 1935ء کے زلزلے کے بعد تین زلزلے آئے تھے۔''

''میں بڑے زلزلوں کی بات کر رہی ہوں۔'' وہ سر اٹھا کر گرتے پانی کو دیکھنے لگی۔

''میں چند سال پہلے جب پہلی دفعہ ایورسٹ سر کرنے گیا تھا تو ترکی میں زلزلہ آیا تھا۔ میں ایکسپیڈیشن لیڈ کر رہا تھا اور ہم بالکونی پر تھے، جب مجھے زلزلے کی اطلاع ملی۔'' وہ اوپر آبشار کی چوڑی دھار کو دیکھتے ہوئے یاد کر کے بتا رہا تھا۔

''اوہ...... تو پھر...... بالکونی سے ایورسٹ کی چوٹی تک کا سفر یقیناً تم نے ڈپریشن میں کیا ہو گا۔''

افق نے گردن پھیر کر سنجیدگی سے پریشے کو دیکھا۔ ''میں زلزلے کے متعلق سنتے ہی ''بالکونی'' سے واپس پلٹ گیا تھا۔''

''کیا؟'' اس نے تحیر سے آنکھیں پھاڑ کر اسے دیکھا، ''ڈونٹ ٹیل می، تم بالکونی سے واپس پلٹ گئے تھے، ادھر سے ایورسٹ کی چوٹی کا فاصلہ ہی کتنا تھا بھلا۔''

''میں چوٹی سے ایک قدم دور بھی ہوتا تو زلزلے کا سن کر واپس چلا جاتا۔ میں ایورسٹ کی فتح کس کے لیے کر رہا تھا؟ اپنے ملک کے لیے ناں؟ تو میرے ہاتھ میں میرے ملک کا جو سرخ جھنڈا تھا، وہ جھنڈا مجھے کہہ رہا تھا کہ تمہارے ایورسٹ سر کر لینے سے ترکی کے لوگوں کو کوئی فرق نہیں پڑے گا، ہاں اگر تم واپس پلٹ جاؤ تو شاید بہت سے بے یار و مددگار لوگوں کی کچھ مدد کر سکو پھر میں واپس آ گیا۔ اس بے حد کامیاب انٹرنیشنل ایکسپیڈیشن کو چھوڑ کر جس میں بیسیوں کوہ پیما شامل تھے۔ ساٹھ تو صرف مقامی Sherpas (شرپا) تھے مگر میں ترکی آ گیا۔ وہاں بہت بری حالت تھی۔ ہر طرف ملبہ تھا، لاشیں بکھری تھیں۔ اس کے بعد سے مجھے زلزلوں سے بہت خوف سا آتا ہے۔''

وہ تحیر سے اسے دیکھ رہی تھی۔ کیا کوئی انسان اتنا نرم دل بھی ہو سکتا ہے کہ بالکونی سے ایورسٹ summit کیے بغیر پلٹ جائے؟ کیا کوئی کوہ پیما بالکونی سے بھی واپس آ سکتا ہے، بغیر کسی جسمانی یا موسمی تغیر کے؟

''پھر تم ایورسٹ نہیں سر کر سکے؟''

''کر لیا تھا، 2001ء میں۔ اور پلیز زیادہ ایکسائیٹڈ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میرے علاوہ تقریباً سترہ سو اور لوگ بھی کر چکے ہیں، یہ کوئی اتنی بھی بڑی بات نہیں ہے۔''

''تم میں بہت عاجزی ہے۔''

''ان پہاڑوں پر اتنی مار پڑی ہے کہ سارے کس بل نکل گئے ہیں۔ تمہیں دنیا کا کوئی بہت اچھا کوہ پیما مغرور نہیں ملے گا۔ کیوں کہ ہم کلائمبرز سے زیادہ کون جان سکتا ہے کہ ہم انسان Mother nautre کی ایک حقیر سی مخلوق ہیں۔ میں اتنی بلندیاں دیکھ چکا ہوں کہ اپنا آپ کچھ لگتا

ہی نہیں ہے۔''

''سوری مگر میں آپ کے رومانس میں مخل تو نہیں ہوئی؟'' ارسہ اچانک ہی چارپا... سامنے آئی تھی۔ پریشے نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔

''ہاں، بالکل مخل ہوئی ہو۔'' افق نے بات کاٹے جانے پر اسے برا سا منہ بنا کر دیکھا۔

''نہیں۔ ارسہ! ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' وہ گھبرا کر وضاحت دینے والے انداز میں... رہی تھی مگر ارسہ نے تو جیسے سنا ہی نہیں تھا۔ وہ نیچے سے آتے ایک گلابی رخساروں والے... طرف متوجہ ہو چکی تھی، جو ہیٹ بیچ رہا تھا۔

پریشے نے سر جھکا کر خشک لبوں پر زبان پھیری۔ اس کا دل زور زور سے دھڑک رہا تھا... کے ارد گرد کے لوگ کیا واقعی سب کچھ جان گئے تھے؟

''میں کیسی لگ رہی ہوں؟'' ارسہ بچے سے ایک ہیٹ لے کر سر پر ٹرائی کر رہی تھی۔

''بالکل ٹائی ٹینک والی کیٹ ونسلٹ!'' افق نے مسکرا کر کہا۔

''میں اتنی موٹی لگ رہی ہوں؟ بس رہنے دو، مجھے نہیں چاہیے ہیٹ۔'' اس نے فوراً... اتار کر بچے کو واپس کر دیا، اس کی گلابی رنگت پر مایوسی چھا گئی، وہ بجھے چہرے کے ساتھ پلٹنے لگا...

''سنو، مجھے تو دکھاؤ ہیٹ!'' پری سے رہا نہ گیا تو بچے کو بلا لیا۔ وہ فوراً پلٹا اور سارے... اس کے سامنے رکھ دیئے۔

''میں اسے پہن کر کچھ اور تو نہیں لگ رہی؟'' اس نے ایک اسکن کلر کا سادہ ہیٹ جس... ادھ کھلا اصلی، بے حد سرخ گلاب لگا تھا، خرید لیا۔

''نہیں، بہت اچھا ہیٹ ہے۔'' افق نے مسکرا کر کہا۔ اس نے یہ نہیں کہا تھا کہ ''تم اچھی لگ رہی ہو۔'' اس نے ایک دفعہ غلطی سے اس کی ہنسی کی تعریف کر دی تھی، وہ بھی شاید مذاق... تھی۔ وہ کبھی اس کی مغلئی آنکھوں، رسیلے ہونٹوں یا سیاہ چمک دار بالوں کی تعریف نہیں کرتا... شاید اس کو غور سے دیکھتا بھی نہیں تھا۔ وہ ظاہری چیزوں کی پوجا کرنے والوں سے بہت مختلف...

افق ہاتھ پانی میں ڈالے اس ہیٹ والے بچے کی طرف پانی اچھال رہا تھا، بچہ اپنا ہیٹ... طرف رکھ آیا تھا اور آبشار کے بالکل کنارے پر اپنی پنڈلیاں ڈالے ایک ''گورے'' سیاح... مذاق کو انجوائے کر رہا تھا، ساتھ ساتھ وہ بھی اس پر پانی اچھال رہا تھا۔

''مت کرو تم دونوں، میرے اوپر پانی آ رہا ہے۔'' اپنا کڑھائی والا نیا کرتا خراب ہوتے دیکھ کر وہ غصے سے بولی۔

''ہم کھیل رہے ہیں۔''

''بہتر..... تم شاید بیس سال پہلے، اپنے بچپن میں چلے گئے ہو، مگر میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ میں جا رہی ہوں۔'' وہ کسی صورت پانی اچھالنے سے باز نہیں آ رہا تھا، یہ دیکھتے ہوئے وہ اپنے جوگرز ہاتھ میں اٹھائے پتھروں سے نیچے اترنے لگی۔

وہ لوگ خاصی دیر تک آبشار پر بیٹھے رہے، یہاں تک کہ سورج ان کے سروں پر آ گیا اور آبشار کا پانی سنہری دھوپ میں مزید چمکنے لگا۔ بہت سے ٹورسٹ آبشار سے جا رہے تھے، کچھ اب آ رہے تھے، غرض آبشار پر ہر وقت رونق لگی رہتی تھی۔

دوپہر میں جب وہ وہاں سے روانہ ہوئے تو پریشے اتنی تھک چکی تھی کہ گاڑی میں بیٹھتے ہی سو گئی۔ اسے نیند سے نشاء نے تب جگایا جب ماہوڈھنڈ آ گئی تھی۔

وہ گاڑی سے نکلی تو اس کی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں، مگر سامنے کا منظر دیکھ کر اس کی نیند تو غائب ہوئی ہی، ساتھ ہی سانس بھی ایک دم رک گیا تھا۔

سامنے تا حد نگاہ سبزہ پھیلا تھا، جیسے ہزاروں ایکڑ پر پھیلا کوئی لان ہو، سبزے کے اختتام پر اشو دریا کا پانی ایک جگہ اکٹھا ہو جاتا تھا اور وہاں اس کی رفتار نہ ہونے کے برابر تھی، اس جھیل کی صورت اکٹھے ہوئے پانی کو ماہوڈھنڈ جھیل کہتے تھے۔

جھیل کا پانی سبزی مائل نیلا تھا، اس کی سطح پر ڈوبتے سورج کی آخری سنہری پریاں رقص کر رہی تھیں۔ جھیل کے پیچھے بلند و بالا سبز پہاڑ تھے جنہوں نے پورے علاقے پر سایہ سا کر رکھا تھا۔ پہاڑوں کے ساتھ ماہوڈھنڈ کے وائیں طرف دیار کے درختوں کا جھنڈ تھا۔ وہ اس سبزہ زار میں واحد درخت تھے، بالکل ایسے جیسے کرسمس ٹریز ہوتے ہیں۔

ٹولیوں کی صورت میں ٹورسٹ دور دور تک گھاس پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک ٹوپی والا پٹھان گھوڑے کی باگ تھامے کھڑا تھا۔ اسے دیکھ کر پریشے کو بے اختیار مری والا واقعہ یاد آیا۔ افق نے کیپ سیدھی کرتے ہوئے گھوڑے والے کو اشارے سے اپنے قریب بلایا۔

''اللہ کا، انگلش راجی کا؟'' قریب آنے پر اس نے شلوار قمیص میں ملبوس چھوٹی ڈاڑھی

والے پٹھان سے پوچھا۔

''نہ......انگلش نہ راجی کا۔پختو راجی کا؟''

افق نے مایوسی سے نفی میں گردن ہلا دی۔

''تم پشتو بول رہے ہو؟'' اس نے حیرت سے افق کو دیکھا۔

''ارے نہیں، یہ تو ایمبسی والوں نے دو چار لفظ لکھا دیئے تھے۔تم اس سے کہو کہ یہ
لے آئے، میں اس پر سواری کروں گا۔''

پریشے نے یہ جاننے کے بعد کہ اس گھوڑے بان، جس کا نام امیر حسن تھا، کو اردو آتی
تک افق کا پیغام پہنچایا۔ورنہ پشاور اور اس سے آگے لوگوں کی اکثریت اردو سے نابلد تھی۔

''آج ہمارے ٹرپ کا آخری دن ہے، کل واپسی ہے۔سو آج رات ہم کیمپ
گے۔'' گھاس پر ایک ساتھ بیٹھتے ہوئے اپنے بیک پیکس کسی بوجھ کی طرح ایک طرف
ہوئے پریشے نے کہا۔

''اور میرے پاس مناپلی بھی ہے، وہ بھی کھیلیں گے۔بس یہ ٹورسٹ یہاں سے چلے
پھر یہ پورا سبزہ زار ہمارا ہوگا اور ہاں افق بھائی، آپ نے پریشے آپی کو dare دینا تھا۔''

''اوہ......میں تو بھول بھی چکا تھا۔'' وہ کہنیوں کے بل گھاس پر نیم دراز تھا، مفلر اس
اور کیپ سینے پر رکھی تھی۔اس کی شرٹ سامنے سے ابھی تک گیلی تھی۔

''تو پھر کیا ہے آپ کا ڈیر؟'' پریشے کے لاکھ گھورنے پر (کہ اگر وہ بھول چکا تھا تو
دو) بھی ارسہ کہہ اٹھی۔

''ایسا ہے پریشے جہاں زیب، آپ کل صبح ہمیں ماہوڈھنڈ سے مچھلیاں پکڑ کر دیں گی
خود لوں گا۔''

''اور ہم بھی کھائیں گے؟''

''ہاں، بالکل......'' وہ چہرے پر مصنوعی سنجیدگی طاری کیے اسے ہی دیکھ رہا تھا
شانے اچکا دیئے۔

''پکڑ دوں گی، بنسیاں اور کنڈیاں ہیں؟''

''میرے پاس سب ہے، مادام!''

پھر جب شام کا ملگجا اندھیرا پھیلنے لگا اور سورج کی کرنیں ماہوڈھنڈ کے پانیوں سے روٹھ کر
رب میں روپوش ہونے لگیں اور سیاحوں کی گہما گہمی ماند پڑنے لگی، تو ایسے میں وہ چاروں کھلے
سمان تلے گزارنے والی رات کی تیاری کرنے لگے۔اپنے بیک پیکس سے کیمپنگ کا سامان
لا، ہنستے بولتے، باتیں کرتے خیموں کے پولز اور جوائنٹس سیٹ کیے۔ان پر شیٹ ڈالی، سلیپنگ
ز بچھائے اور خود خیموں کے ایک طرف کھلے آسمان تلے دائرہ بنا کر بیٹھ گئے۔درمیان میں امیر
ن کے توسط سے منگوائی لکڑیوں سے آگ جلالی گئی تھی۔

''میں بینکر ہوں گی۔بینکر کم پلیئر۔'' ارسہ مناپلی کا بورڈ اور کارڈ وغیرہ سیٹ کرتے ہوئے
ل۔الاؤ کے ایک طرف وہ اور نشاء تھیں۔دوسری طرف پریشے اور افق نے مناپلی کا بورڈ درمیان
ہی آگ کے قریب کسی طرح ایڈجسٹ کرلیا تھا۔

مناپلی جیسی گیم میں گھنٹے منٹوں کی طرح گزرتے ہیں، دو گھنٹے گزر گئے اور انہیں پتا ہی نہیں چلا۔

''یہ پکاڈلی کس کی ہے؟'' پریشے کی گوٹ پیلے رنگ کی پکاڈلی پر آئی تھی، اس کے اپنے پاس
رف چار زمینیں تھیں۔قسمت اتنی خراب کہ ہر باری پر وہ افق یا نشاء کی کسی زمین پر چڑھ جاتی یا پھر
دھی جیل جاتی۔

''میری ہے۔'' نشاء نے مطلوبہ کرایہ بتایا۔اس نے منہ بناتے ہوئے چند پاؤنڈز نکال کر
سے تھمائے۔افق نے نظر اٹھا کر اس کا اترا ہوا چہرہ دیکھا پھر دھیرے سے اپنے کارڈز میں سے
کسفورڈ اسٹریٹ کا گرین کارڈ نکال کر اس کے ہاتھ میں پکڑایا، پریشے نے چونک کر اسے دیکھا۔

''رکھ لو، ابھی نشاء اس پر آئے گی تو تم اس سے کرایہ لے لینا۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔پریشے
نے چور نظروں سے الاؤ کے اس پار بیٹھی ارسہ اور نشاء کو دیکھا۔وہ اس جانب نہیں دیکھ رہی تھیں۔

''شکریہ۔'' اس نے جھٹ کارڈ رکھ لیا۔

نشاء کی گوٹ ریجنٹ اسٹریٹ پر آئی۔ارسہ کی مے فیر پر پھر نشاء کی کنگ کراس اسٹیشن پر اور وہ
م افق کی زمینیں تھیں مگر وہ بڑے حق کے ساتھ کرایہ وصول کرتی رہی۔

''میرا خیال ہے یہاں کوئی بے ایمانی کر رہا ہے۔'' آدھے گھنٹے بعد ارسہ کو تب احساس ہوا
ب وہ واٹر ورکس پر آئی اور پریشے نے کرایہ مانگا۔

''یہ واٹر ورکس اور الیکٹرک کمپنی تو افق بھائی آپ کی تھیں، مجھے اچھی طرح یاد ہے۔میں بینکر

ہوں!'' پریشے نے قدرے بوکھلا کر افق کو دیکھا۔

''اوہو ارسہ! میری کہاں تھیں؟ میری تو صرف الیکٹرک کمپنی تھی۔''

''پری آپی! ذرا کارڈ نکال کر دکھائیں واٹر ورکس کا۔'' اس کا انداز قطعی تھا، پریشے
چکی تھی کہ کارڈ افق کے پاس تھا۔

''کیا کرتی ہو ارسہ! پری جھوٹ تھوڑی بول رہی ہے۔ میں نے اپنی گناہ گار
اسے یہ زمین خریدتے دیکھا ہے۔''

''گناہ گاروں کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ پری آپی! مجھے کارڈ دکھائیں۔'' وہ بضد تھی

''ارسہ! تمہاری گردن پر کوئی کیڑا چل رہا ہے۔'' افق نے فلمی اور تھرڈ کلاس
حربہ آزمایا، جو ٹھیک نشانے پر بیٹھا۔ ارسہ اپنے کارڈز چھوڑ کر گردن جھاڑنے لگی۔

''کیڑا؟ کدھر ہے؟''

''ابھی تک تمہاری گردن پر بیٹھا ہے۔ کتنا خون پی چکا ہوگا اب تک تمہارا۔ ویسے
گروپ کیا ہے؟'' وہ بات کو کہاں سے کہاں لے جا رہا تھا، صرف پریشے کو بچانے کے
نے ممنونیت سے افق کو دیکھا۔ الاؤ کی زرد روشنی اس کے چہرے کے نقوش کو مزید تیکھا بنا

''اے پازیٹو..... اور نہیں ہے کیڑا۔''

''اے پازیٹو؟ ہوں..... میرا او نیگیٹو ہے۔'' وہ یونہی بولا تو مجرموں کی طرح گردن
بیٹھی پریشے نے چونک کر سر اُٹھایا، ''سیف کا بھی او نیگیٹو ہے۔'' اس نے بے اختیار زبان
تلے کرلی، نشاء نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا۔

''سیف کون؟'' افق نے تجسس سے نہیں محض ارسہ کی توجہ واٹر ورکس والی بات سے
پوچھا تھا اور اب وہ پری کے جواب کا انتظار کیے بغیر ہی ڈائس ہاتھ میں لیے باری کرنے لگا

مگر جواب تو پریشے کو دینا ہی تھا۔ نشاء نے خاموش نگاہوں سے التجا کی تھی کہ وہ چپ
اس کو ہر صورت افق کو وہ بتانا تھا جو بتانے کا اسے موقع نہیں مل رہا تھا۔

''سیف میرا کزن ہے، پھپھو کا بیٹا اور میرا.....'' وہ لمحے بھر کو رکی، افق کی ڈائس کی
کرتی انگلیاں تھمیں، اس نے گردن اٹھا کر سوالیہ نگاہوں سے پریشے کو دیکھا۔

''اور میرا منگیتر بھی..... تین ماہ بعد میری اس سے شادی ہے۔'' بہت پر اعتماد انداز

نے کہہ ڈالا۔
وہ جو کچھ کہنے لگا تھا، یک دم رک گیا۔ اس کی آنکھوں میں پہلے حیرت در آئی پھر الجھن اور
بالآخر واضح بے یقینی۔

پل بھر کو ماہوڈھنڈ کے کنارے اس وسیع و عریض سبزہ زار میں سکوت سا چھا گیا۔ اونچے الاؤ
سے چنگاریاں نکل کر فضا میں گم ہو رہی تھیں۔

''آپ..... انگیجڈ ہیں؟'' واٹر ورکس کو بھول کر بے یقینی سے ارسہ اسے دیکھ رہی تھی۔

''ہاں، تین سال سے۔'' اس کے دل سے کوئی نادیدہ بوجھ ہٹ گیا تھا، مگر پھر افق کا زرد چہرہ
دیکھ کر اسے اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔

''اوہ اچھا۔'' وہ سنبھل گیا اور پھر اپنی نگاہیں ہاتھ میں پکڑی ڈبیا پر مرکوز کیے جیسے زبردستی
مسکرانے کی کوشش کی۔ پھیکی رنگت اور پھیکی مسکراہٹ۔

''مبارک ہو، تم نے..... تم نے کبھی بتایا نہیں..... تو..... تمہاری شادی ہو رہی ہے..... ہوں گڈ۔
تو کیا کرتا ہے وہ؟'' وہ رکا، ''وہ..... سیف؟'' وہ اپنے لہجے میں کچھ ٹوٹنے کا کرب نہ چھپا سکا تھا۔

''بزنس!''

''آہاں! ویری نائس۔'' افق نے ڈبیا رکھ دی۔ اسے شاید بھول چکا تھا کہ اس کی باری تھی۔

الاؤ کے اس پار نشاء سر جھکائے بیٹھی تھی۔ وہ اداس تھی، پریشے سمجھ سکتی تھی مگر اس کو ہر صورت
میں کسی بھی قسم کی غلط فہمی اگر تھی تو ختم کرنی تھی۔

لکڑیوں میں سے بار بار چٹخنے کی آواز آ رہی تھی۔

''چلیں، گیم دوبارہ شروع کریں۔'' ارسہ کا لہجہ بجھا بجھا سا تھا۔

''کل کھیل لیں گے، اب سوتے ہیں۔'' نشاء نے افق کی مشکل آسان کر دی۔ وہ غالباً وہاں
سے ہٹنا چاہ رہا تھا۔ نشاء کے کہنے پر کارڈ رکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔ واٹر ورکس کا کارڈ سامنے ہی تھا، مگر کسی
نے کچھ نہیں کہا۔ اس نے گھاس پر رکھی اپنی ''ہیلو طیب اردگان'' والی کیپ اٹھائی اور ان سے دور
جھیل کی طرف چلا گیا۔

''صبح آبشار پر میں نے..... آئی ایم سوری پری آپی..... وہ میرے منہ سے یونہی، غلطی سے
نکل گیا تھا۔ میں نے صرف مذاق کیا تھا، مجھے نہیں علم تھا کہ آپ انگیجڈ ہیں۔ ورنہ..... آئی ایم سو

سوری!'' تذبذب اور شرمندگی اس کے لہجے سے ٹپک رہی تھی۔

''اٹس او کے ارسہ! میں نے برا نہیں مانا۔ تم یہ گیم سمیٹ لو۔''

''تھینکس''، بے دلی سے گیم سمیٹ کر ارسہ اپنے خیمے کی طرف چلی گئی۔ پریشے نے گردن موڑ کر افق کو دیکھا۔ وہ جھیل کے کنارے، سر جھکائے جیبوں میں ہاتھ ڈالے خاموشی سے آہستہ چل رہا تھا۔

صبح وہ کتنا خوش تھا اور اب بھی اس کے ساتھ مل کر بے ایمانی کرتے ہوئے وہ کتنا بشاش لگ رہا تھا پھر ایک لفظ ''منگیتر'' سن کر یوں اس کے چہرے کی مسکراہٹ کیوں غائب ہو گئی تھی؟ پریشے نے گہری سانس لے کر گردن سیدھی کی۔ نشاء شاکی نظروں سے اسے ہی دیکھ رہی تھی۔ وہ نظریں چراتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

رات قطرہ قطرہ بھیگ رہی تھی اور کشمیر سے آنے والی تیز سرد ہوائیں ان کے خیمے کے پردے پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ وہ اپنے سلیپنگ بیگ میں چت لیٹی خیمے کی چھت کو گھور رہی تھی۔

''پری!'' باہر سے کسی نے اسے پکارا تھا۔ وہ یک لخت اٹھ بیٹھی، پکارنے والا افق تھا۔ اس نے سلیپنگ بیگ کھولا قریب پڑا ہیٹ اٹھا کر سر پر رکھا اور خیمے کی زپ کھول کر باہر نکل آئی۔

''مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ سوچا کچھ دیر اکٹھے واک کرتے ہیں۔''

وہ کچھ کہے بنا افق کے ساتھ گھاس پر چلنے لگی۔ وہ دونوں ایک ہی انداز میں سر جھکائے چل رہے تھے۔ پریشے نے ہاتھ سینے پر باندھ رکھے تھے جب کہ اس کے ہاتھ جیبوں میں تھے۔

''کیسا ہے وہ؟ تمہارا منگیتر؟'' چلتے چلتے بغیر تمہید کے افق نے سوال کیا۔ اس کے لہجے میں عجیب بے بسی اور شکست خوردگی تھی۔ ''اچھا ہے؟''

''سیف؟'' اس نے پل بھر کر سوچا۔ ''امیر ہے، ہینڈسم ہے، ویل مینرڈ ہے، مجھ سے محبت کرتا ہے۔''

وہ چلتے چلتے جھیل کے کنارے تک پہنچ گئے تھے۔ رات کے اس پہر وہاں چھائی خاموشی کو پہاڑوں سے جنگلی جانوروں کے بولنے کی آواز چیر رہی تھی۔

''مگر تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ میں نے پوچھا تھا، وہ اچھا ہے؟''

''اچھا'' بہت عجیب ہوتا ہے۔ افق! ایک ظالم و جابر بادشاہ اپنی رعایا کے لیے جتنا برا ہو، اپنی اولاد کے لیے اتنا ہی اچھا ہوتا ہے پھر ہم اسے کیا کہیں؟ برا یا اچھا؟ یہ لفظ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لیے شاید میں تمہیں یہ نہ بتا سکوں کہ وہ اچھا ہے یا نہیں، البتہ پسند اور ناپسند کی بات اور ہوتی ہے۔''

وہ جھیل کے کنارے گھاس پر بیٹھ گیا تھا۔ پریشے بھی اس کے بائیں طرف، اس سے ذرا پیچھے گھاس پر گھٹنوں کے گرد بازوؤں کا حلقہ بنا کر ان پر ٹھوڑی ٹکائے بیٹھ گئی۔ برفیلی، تیز ہوا اس کا ہیٹ اڑانے کی کوشش کر رہی تھی۔

''تم اسے پسند کرتی ہو؟'' وہ سامنے، چاندنی میں نہائی جھیل کو دیکھ رہا تھا۔

''وہ میری پھپھو کا بیٹا ہے، پاپا کو بہت پسند ہے، انہوں نے منگنی سے پہلے میری مرضی نہیں پوچھی تھی۔ پھپھو نے رشتہ مانگا، انہوں نے فوراً ہاں کر دی۔ تم ہمارے ہاں کی ''رشتوں کی بلیک میلنگ'' کو نہیں جانتے۔ پاکستان کے رسوم و رواج ترکی سے بہت مختلف ہیں۔ یہاں اگر رشتہ مانگنے پر کسی پھوپھی، چچا یا ماموں کو انکار کر دیا جائے تو وہ انا میں آ کر خون کے رشتے تک توڑ ڈالتے ہیں۔ پھپھو کو میں بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔ وہ پاپا کی اکلوتی بہن ہیں، پاپا کا واحد خونی رشتہ جو اس دنیا میں ہیں۔ میں اس وقت شاید انکار کر بھی دیتی مگر جب سیف کا رشتہ آیا تھا تو وہ مالی طور پر اتنا مستحکم ہو چکا تھا کہ پاپا سے تعلق توڑ لینا مالی مدد کے لحاظ سے کوئی گھاٹے کا سودا نہ ہوتا، پھر وہ پاپا کو بہت پسند ہے اور میں پاپا کو دکھ نہیں دینا چاہتی تھی۔''

وہ گردن اٹھا کر آسمان کو دیکھنے لگی۔ وہاں ہر سو جگمگاتے تارے بکھرے تھے۔ جمادی الثانی کی آخری تاریخوں کا ہر پل گھٹتا چاند پوری جھیل کو چمکا رہا تھا۔

''تمہیں کبھی نہیں لگا کہ تمہاری زندگی میں کبھی نہ کبھی کوئی ایسا آئے گا جو تم سے محبت کرتا ہوگا، جس کو دیکھ کر تمہیں یہ لگے گا کہ یہی ہے جس کا ساتھ تمہیں عمر بھر کے لیے چاہیے؟''

پریشے نے مغموم مسکراہٹ کے ساتھ اس کی چوڑی پشت اور جھکے سر کو دیکھا۔

''بعض لوگ زندگی میں بہت دیر سے ملتے ہیں، افق ارسلان! اتنی دیر سے کہ ہم چاہیں بھی تو انہیں اپنی زندگی کا حصہ نہیں بنا سکتے۔''

''تو جو لوگ زندگی میں بہت دیر سے ملتے ہیں، ان کو آپ اپنی ترجیحات میں کس مقام پر رکھتی ہیں، ڈاکٹر پریشے جہاں زیب؟''

پری نے چونک کر اسے دیکھا، گردن اس کی طرف موڑے، سختی سے لب بھینچے وہ ا
تھا۔ شکوہ کرتی خفا آنکھیں، طنزیہ لہجہ...... وہ گہری سانس بھر کر رہ گئی۔

"میرے نزدیک ہر فرد کی اہمیت......" تیز ہوا کا جھونکا اس کا ہیٹ اڑا کر لے گیا۔ بات روک کر اٹھ کھڑی ہوئی۔ "میرا ہیٹ!"

چند قدم دور جا کر اس نے گھاس پر پڑا ہیٹ اٹھایا۔ وہ بھی اٹھ کر اس کے قریب آ گیا۔

"چلو خیر۔ جانے دو، تم منگنی شدہ ہو تو کیا ہوا، ہمارے درمیان ایک اور تعلق تو ہے۔"

وہ چونکی، "وہ کیا؟" اس کا دل زور سے دھڑکا تھا۔

"ہم اچھے دوست تو ہیں نا۔" وہ ایک دم پھر سے پرانا افق ارسلان لگنے لگا تھا۔ وہی ہنس مکھ اور اپنا اپنا سا۔

"ہاں، وہ تو ہیں۔" وہ کھل کر مسکرا دی۔

"تو پھر تم اس اچھے دوست کے ساتھ راکاپوشی آ رہی ہو نا؟" وہ پھر سے پرانے موڈ میں تھا۔ وہ دونوں ماہوڈھنڈ کے چمکتے پانیوں کے کنارے ٹہلنے لگے۔

"یہ میرے لیے ناممکن ہے۔ مجھے پاپا کبھی اجازت نہیں دیں گے۔"

"وہ بہت کنزرویٹو ہیں کیا؟"

"نہیں۔ یہ بات نہیں ہے۔ اس لحاظ سے تو وہ بہت لبرل ہیں۔"

"اچھا...... پھر؟"

"چار سال پہلے میں "سپانتک" کی ایکسپیڈیشن پر گئی تھی۔ بنیادی طور پر ملٹری ایکسپیڈیشن تھی، پاکستان نیوی کی۔ میں ایکسپیڈیشن ڈاکٹر کے طور پر یوں ہی ساتھ فٹ ہو گئی تھی۔" وہ کر کے ہنسی، "بہت منتیں کی تھیں نذیر صابر کی، انہوں نے ہی ایڈجسٹ کرایا تھا مجھے پاک ساتھ۔ ہم نے بڑے کم وقت میں سپانتک کو سر بھی کر لیا مگر واپسی پر، چوٹی سے چند فٹ دور گر گئی۔ میرا بایاں کندھا بری طرح زخمی ہو گیا۔ اس کے بعد پاپا نے میری climbing پیمائی) پر پابندی لگا دی۔ وہ میرا اسکردو سے آگے، قراقرم کا پہلا تجربہ تھا۔ میں اور کرنا چا پاپا اجازت نہیں دیتے۔ وہ ڈرتے ہیں کہ میں گر نہ پڑوں۔"

"میں تمہارے ساتھ ہوں گا تو تم کیوں گرو گی؟" بہت اپنائیت سے افق نے کہا۔ وہ

"یہ بات تم میرے پاپا کو نہیں سمجھا سکتے۔"

"کوشش تو کر سکتا ہوں۔"

"نن۔ نہیں...... نہیں...... اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ گھبرا کر تیزی سے بولی۔ پھر فوراً اپنی کیفیت کو چھپا کر وضاحت کرنے والے انداز میں کہا، "وہ نہیں مانیں گے، اس قصے کو چھوڑ دو۔"

"اچھا۔ ٹھیک۔ اور اگر زیادہ پرسنل نہیں ہو رہا تو ایک بات پوچھوں؟"

"پوچھو۔"

"تم نے کبھی بتایا نہیں۔ تم کہاں رہتی ہو مری میں؟"

"ہم نے شاید اپنے بارے میں ایک دوسرے کو کچھ بھی نہیں بتایا افق!" وہ مسکرا کر بولی۔

"شاید۔ مگر تم کہاں رہتی ہو؟"

یہ وہ سوال تھا، جس کا وہ جواب نہیں دینا چاہتی تھی۔ پرسوں شام وہ اپنی تمام کشتیاں جلا کر واپس جانا چاہتی تھی کہ جلی ہوئی کشتیوں پر سواری کر کے افق ارسلان اس تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

"میں اس ملک اور ان ہی پہاڑوں میں رہتی ہوں۔ قراقرم کے پہاڑ ہی میرا گھر ہیں۔" وہ سمجھ گیا کہ وہ بتانا نہیں چاہ رہی، سو مسکرا کر بولا،

"ہاں، میں نے سن رکھا تھا کہ قراقرم کے پہاڑوں پر پریاں اترتی ہیں۔"

"اور تم نے اس روز یہ بات جینیک یقین سے بھی کہی تھی ناں؟"

"میں اس بات سے بے خبر تھا کہ تم پیچھے بیٹھی ہو۔"

"مگر میں پری نہیں ہوں۔" اس نے اداسی سے ہاتھ میں پکڑے ہیٹ پر کھلے سرخ گلاب کو دیکھا۔

"تم پری ہو؟"

"نہیں۔" اس نے نفی میں گردن ہلائی، "نام سے کوئی پری نہیں بن جاتا۔ میرا صرف نام پری ہے۔"

"جانتی ہو پری! جب میں نے تمہیں پہلی دفعہ دیکھا تھا تو مجھے کیا لگا تھا؟ یوں جیسے قراقرم کے پربتوں سے رستہ بھول کر مارگلہ کی اس پہاڑی پر برستی بارش میں پناہ لینے والی کوئی معصوم سی خوف زدہ سی پری ہو......"

"میں نے عرصہ ہوا خوابوں کی دنیا میں رہنا چھوڑ دیا ہے۔ ٹوٹے خواب بہت اذیت دیتے

ہیں، افق!''

وہ خاموش رہا، پھر چند ثانیے بعد آسمان کو دیکھ کر بولا ''رات بہت گہری ہو چکی ہے۔ تمہیں سو جانا چاہیے۔''

''تم جاؤ، میں ابھی جھیل کے کنارے بیٹھنا چاہتی ہوں۔'' وہ اس سے دور جھیل کے کنارے گھاس پر بیٹھ گئی، جوتے اتار کر ایک طرف رکھے اور ماہوڈھنڈ کے سیاہ نظر آنے والے پانی میں، جس پر چاندنی کی تہ چڑھی تھی، پاؤں لٹکا دیے۔

وہ اپنے خیمے کی طرف بڑھ گیا۔ البتہ خیمے کی زپ کھولنے سے پہلے ایک لمحے کو اس نے گردن کو خم دے کر پیچھے ضرور دیکھا تھا، جہاں وہ پانی میں پاؤں لٹکائے، چاند کی میٹھی چاندنی میں خاموش گیت سن رہی تھی۔

☆......☆......☆

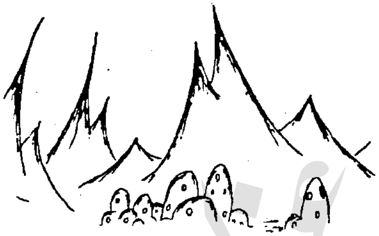

چھٹی چوٹی

ہفتہ، 30 جولائی 2005ء

گھوڑے کی تیز دوڑتی ٹاپوں کی آواز پر اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دور خیموں کے قریب سے گھوڑا دوڑاتا اس کی طرف آ رہا تھا۔ وہ وہیں بیٹھی تھی جہاں رات کو افق نے اسے آخری بار دیکھا تھا۔ فرق صرف یہ تھا کہ چاندنی واپس چلی گئی تھی، اندھیرا چھٹ چکا تھا۔ نیلی روشنی ہر سو پھیلنے لگی تھی۔ دور افق پر ایک نئی صبح طلوع ہو رہی تھی۔ جھیل کا پانی سبزی مائل لگ رہا تھا، ابھی تک سورج کی کرنوں نے اس پر اپنا رقص شروع نہیں کیا تھا۔

''تم ادھر کیا کر رہی ہو؟'' گھوڑا اس کے قریب لے جا کر افق نے رفتار کم کر دی۔

''زندگی میں پہلی دفعہ ہارنے کی سزا پوری کر رہی ہوں، مگر یا تو ماہوڈھنڈ کی مچھلیاں بہت

ہوشیار ہیں، یا پھر میری قسمت ہی خراب ہے۔'' اس نے ہاتھ میں فشنگ راڈ پکڑ رکھی تھی۔

''اوہ خدایا۔ تم رات بھر یہی کرتی رہی ہو کیا؟'' شہد رنگ آنکھوں میں حیرت در آئی
نہیں ہو کیا؟''

''کسی دانشور نے کہا تھا، سونا وقت کا ضیاع ہے۔'' وہ کیا کہتی کہ رات بھر نیند ہی نہیں آ

''بہت معذرت، مگر میں تمہیں بتانا بھول گیا کہ آج کل ماہوڈھنڈ میں مچھلیاں نہیں ہ
گھوڑے کی لگام تھامے، آنکھوں میں شوخی لیے وہ مسکرا رہا تھا۔ وہ ابھی تک گھوڑے پر بیٹھا

''کیا؟'' وہ چلا کر کھڑی ہوئی، گود میں رکھا ہیٹ نیچے گھاس پر گر پڑا۔ ''تم نے مجھے
کیوں دیا؟''

''مجھے بھی اسی دانشور نے بتایا تھا کہ وقت ضائع کروانے کے اور بھی طریقے ہوتے ہیں
ہنسا۔

''بہتر۔ اب تم نئی راڈ خریدنا۔'' غصہ اتنا شدید چڑھا تھا کہ اس نے افق کی راڈ اٹھا کر
طرف اچھال دی، راڈ نے ایک غوطہ کھایا اور پھر پانی میں ڈوب گئی۔

''میں یہ راڈ دریا سے ٹراؤٹ کا شکار کرنے کے لیے لایا تھا مگر تم نے خود کو ٹراؤٹ کھانے
محروم کر لیا ہے۔''

''میں ٹراؤٹ کھائے بغیر بھی ایک اچھی زندگی گزار رہی ہوں۔'' وہ ہیٹ سر پر رکھ کر
چل پڑی۔

''سنو، قراقرم کی پری!''

پریشے کے قدم زنجیر ہوئے تھے، اس نے پلٹ کر گھوڑے پر بیٹھے افق کو دیکھا۔ ''تمہارا
یادگار تصویر کھنچوانے کا دل چاہ رہا ہے؟''

''نہیں!'' وہ دو قدم مزید آگے چل دی۔

''مگر میرا چاہ رہا ہے۔'' وہ جست لگا کو گھوڑے سے اترا اور بھاگ کر اس کی طرف آیا
سے ہاتھ بڑھا کر اس نے اس کا ہیٹ اتار دیا۔

''کیا ہے؟'' وہ ایڑیوں کے بل گھومی۔ افق نے اپنی کیپ اس کے سر پر رکھی۔ ''تم یہ
اپنی جیکٹ، گھڑی اور مفلر اس نے پریشے کو تھما دیئے اور اس سے اس کی گھڑی لے لی۔

''تم کرنا کیا چاہ رہے ہو؟''

''مڈل ایسٹ ٹیکنیکل یونیورسٹی میں ہمارے آخری دن میں نے اور جینیک نے ایک دوسرے کی ٹوپیاں، جیکٹیں، ٹائیاں، گھڑیاں اور سن گلاسز پہن کر تصویر کھنچوائی تھی۔ بہت یادگار تھی وہ۔'' اس نے افق کی چیزیں پہن کر اس کو اپنا ہیٹ پہنے دیکھا اور بے اختیار ہنس دی۔

''ہم مضحکہ خیز لگ رہے ہیں، افق!''

''ہم نہیں، صرف تم!'' مسکراتے ہوئے اسے چڑا کر، اس نے دور کھڑے امیر حسن کو آواز دی۔ وہ پاس آیا تو اشاروں سے تصویر کھینچنا سکھا کر اپنا پولا رائیڈ کیمرہ اس کے ہاتھ میں تھمایا۔ تصویر کے لیے دونوں گھوڑے کے ساتھ کھڑے ہو گئے، افق نے ایک ہاتھ سے گھوڑے کی لگام تھام لی۔

''تصویر بن کر آئے تو اوپر لکھ دینا کہ گھوڑا میرے دائیں طرف ہے۔'' پچھلی بات کا بدلہ اتار کر وہ خود ہی ہنس دی، اسی لمحے گھوڑے والے نے بٹن دبا دیا۔ فلیش چمکی اور چند ہی لمحوں بعد تصویر باہر نکل کر آ گئی۔

''ایک فوٹوگرافر کی حیثیت سے تمہارا مستقبل بہت روشن ہے۔ مسٹر!'' اس کے یوں ریڈی نہ کہنے پر وہ تصویر جھاڑتے ہوئے بہت جل کر بولا تھا۔ امیر حسن ٹکر ٹکر اس کا چہرہ دیکھنے لگا۔

''یہ شکریہ کہہ رہا ہے۔'' اپنی ہنسی روک کر اس نے اسے بتایا۔

''خیر، اس کا قصور نہیں، تم سارے پاکستانی ہی ریڈی کہے بغیر تصویر کھینچتے ہو۔'' تصویر جھاڑتے ہوئے وہ مسکرایا۔

پریشے کو یاد آیا، مری میں اس نے بھی ریڈی کہے بغیر تصویر کھینچی تھی۔

''ہم بہت سے کام ریڈی کہے بغیر کرتے ہیں۔ خیر تصویر دکھاؤ۔''

اس نے تصویر افق کے ہاتھ سے لی۔ وہ ہنس رہی تھی، ہنستے ہوئے وہ گردن کو قدرے پیچھے پھینک دیتی تھی۔ ہنسی روکنے کو اس نے منہ پر ہاتھ رکھا ہوا تھا، کلائی میں موجود سیاہ گھڑی کے ڈائل کا اہرام چمک رہا تھا۔ افق گھوڑے کی لگام تھامے گردن موڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کے سر پر موجود ہیٹ جس کا گلاب اب مرجھا سا گیا تھا، اس کو بالکل کاؤبوائے کی طرح دکھا تھا۔

''اچھی ہے۔'' اس نے تصویر واپس کر دی۔

''تم رکھنا چاہتی ہو؟''

''نہیں۔'' وہ اپنی تمام کشتیاں جلا کر جانا چاہتی تھی۔

"بہت اچھا۔" افق نے تصویر اپنی سفید جیکٹ کی جیب میں ڈال لی، جو پریشے ا
دوسری چیزوں کے ساتھ واپس کر چکی تھی۔

"رائیڈنگ کرو گی؟"

"نہیں، مجھے گھوڑوں سے ڈر لگتا ہے۔" وہ فوراً پیچھے ہٹی۔

"ایک بہادر کوہ پیما کو گھوڑے سے ڈر نہیں لگنا چاہیے۔"

"بالکل ایسے ہی، ایک بہادر کوہ پیما کو برے خواب سے بھی نہیں ڈرنا چاہیے۔" وہ
کر بولی۔

"بیٹھ جاؤ۔ یہ بہت اچھا گھوڑا ہے، خوب صورت عورتوں کا احترام کرتا ہے۔" وہ
نظر انداز کر گیا۔

"شکریہ، مگر میں تو لڑکی ہوں۔"

"اچھا اوپر بیٹھو ناں، ایک پاؤں ادھر رکاب پر رکھو..... رکھو تو سہی۔" اس کے
قدرے ہچکچاتے ہوئے وہ آگے بڑھی اور پاؤں رکاب میں ڈالا۔

"او کے، اب دایاں ہاتھ میرے کندھے پر رکھو اور بایاں پیٹھ پر۔"

"کس کی پیٹھ پر؟" وہ چڑھتے چڑھتے رکی۔

"گھوڑے کی پیٹھ، مادام!" وہ تحمل سے مسکراہٹ دبائے بولا۔

"اچھا۔" وہ شرمندہ سی ہنس ہنسی، پھر قدرے ڈرتے ہوئے، اس کے کندھے کا
گھوڑے پر بیٹھ گئی۔

"ڈرو نہیں، میں نے کہا نا، یہ خوب صورت عورتوں کا احترام کرتا ہے۔" اس کی
صورت دیکھ کر وہ بظاہر بڑی سنجیدگی سے بولا۔

"مجھے زمین پر پٹخنا اس کے احترام کے دائرے میں آتا ہے یا نہیں؟" وہ اپنی تما
کے باوجود گھوڑے سے سخت خوف زدہ تھی۔

"یہ تو میں نے اس سے نہیں پوچھا، خیر تم یہ باگ پکڑو اور اس طرح کرو گی تو یہ چل
پریشے نے ہڑبڑا کر اسے دیکھا، "کیا مطلب؟ تم نہیں بیٹھو گے؟"

"نہیں۔ فکر مت کرو، یہ تمہیں نہیں گرائے گا۔"

"نہیں نہیں، مجھے اتارو۔ مجھے نہیں بیٹھنا اس پر۔" وہ گھبرا گئی تھی۔

"کم ان پریشے ڈیئر، یہ زیادہ سے زیادہ تمہیں ماہوڈھنڈ میں پھینک دے گا؟ تو پھینک
دے..... میں تمہارے پیچھے پانی میں چھلانگ لگا دوں گا۔"

"مگر تم تو کہہ رہے تھے کہ تمہیں سوئمنگ نہیں آتی۔"

"ہاں، مگر مجھے ایک پری کے پیچھے جھیل میں ڈوبنا تو آتا ہے ناں۔" وہ اس کی حالت سے
محظوظ ہو رہا تھا۔

"پلیز مجھے نیچے اتارو۔ یہ مجھے گرا دے گا۔" وہ رو دینے کے قریب تھی۔

"یہ اچھا گھوڑا ہے، خوب صورت عورتوں کا......" فقرہ اس کے لبوں میں تھا جب بے حد
گھبراہٹ میں پریشے نے گھوڑے سے اترنا چاہا، گھوڑا ایک دم کسی گولی کی طرح تیز رفتاری سے
آگے بھاگا تھا۔

"افق!" وہ چلائی تھی۔

"او گاڈ..... پریشے، اسے روکو۔ نیچے مت اترو۔" وہ جو اتنی دیر سے مذاق کر رہا تھا، گھوڑے
و بھاگتے دیکھ کر بوکھلا گیا۔ مگر وہ اس سے زیادہ بوکھلائی ہوئی تھی، سو لگام چھوڑ کر نیچے چھلانگ لگا
ی، اس کا بایاں پاؤں رکاب میں پھنس گیا اور وہ تیورا کر گھاس پر گری۔ کھینچ کر پاؤں رکاب سے
زاد کرایا مگر اس کا بایاں ہاتھ ایک پتھر سے ٹکرا کر معمولی سا زخمی ہو گیا تھا۔ وہ بمشکل سیدھی ہوئی۔
س کا ہیٹ اڑتا ہوا دور ماہوڈھنڈ میں جا گرا تھا اور اب نیلے سبزی مائل پانی کی سطح پر تیر رہا تھا۔

"پری..... تم ٹھیک ہو؟" وہ بھاگتا ہوا اس تک آیا اور پنجوں کے بل اس کے مقابل بیٹھ گیا۔
میں مذاق کر رہا تھا، آئی ایم سوری۔ مگر تمہیں کس نے کہا تھا کہ تم لگام کھینچ دو؟"

"تم نے ہی کہا تھا۔" اس نے شکوہ کرتے ہوئے بڑی بڑی آنکھیں اٹھائیں، جن میں آنسو
بر رہے تھے۔

"میں تو بس یونہی....." وہ سخت شرمندہ تھا۔ "ادھر دکھاؤ، ہاتھ کو کیا ہوا ہے؟" افق نے
رمندگی سے اس کا ہاتھ تھام لیا، جس میں انگلیوں کے نیچے، ہتھیلی پر رگڑ لگنے سے ایک معمولی سا
ٹ لگ گیا تھا جس سے بمشکل خون کی دو تین بوندیں ٹپکی تھیں مگر وہ پریشان ہو گیا تھا۔

"کیا بہت درد ہو رہا ہے؟" وہ جواب دیئے بنا سر جھکائے اپنے زخمی ہاتھ کو دیکھتی رہی۔ آنسو
ں کی پلکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تھے۔

"اچھا دیکھو، روؤ تو مت، میں دوا لے کر آتا ہوں ٹھیک؟"

وہ اسے کیسے بتاتی کہ وہ اس معمولی خراش پر نہیں رو رہی، رات بھر سے اندر جمع ہو
کسی صورت تو راستہ ملنا ہی تھا۔

وہ اُٹھ کھڑا ہوا، پریشے نے دائیں ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے۔ ''بس ز
لے آؤ۔''

وہ جاتے جاتے پلٹا۔ ''کیا؟''

''پلاسٹک والا بینڈ ایج!''

''اچھا یو مین سانیتا بانت؟ ابھی لایا۔'' وہ سمجھ کر اپنے خیمے میں چلا گیا۔ شاید تر
پلاسٹ کو سانیتا بانت کہتے ہوں گے۔

وہ وہیں گھاس پر بیٹھی اپنی قسمت کی لکیروں کے درمیان لگے کٹ کو دیکھتی رہی
لے کر واپس بھی آ گیا۔

''اب خبردار، رونا نہیں ہے۔'' اس کے ہاتھ پر سنی پلاسٹ کی طرز کا بینڈ ایج لگا کر
ڈانٹتے ہوئے بولا، ''اتنی پیاری آنکھوں کو رو رو کر سرخ کر ڈالا ہے تم نے۔''

اس نے چونک کر نم آنکھوں سے اپنے ساتھ گھاس پر بیٹھے افق کو دیکھا براہ راست
اس نے اسے خوب صورت کہا تھا، اس کے دل میں جیسے کوئی نرم احساس جاگا تھا۔

''اب درد ہو رہا ہے؟'' وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ وہ کہنا چاہتی تھی کہ ہاں، درد تو
اذیت دیتا درد اس کے دل میں ہو رہا ہے، مگر اس نے گردن کو نفی میں جنبش دی۔

''گڈ۔ اب اپنی آنکھیں صاف کرو۔ اپنی چیخوں سے تم نے نتاشا اور ارسہ کو اٹھا دیا
ابھی آ کر پوچھیں گی کہ میں نے ایک منگنی شدہ لڑکی کو کیا کہہ ڈالا کہ وہ یوں رو رہی ہے۔''

وہ بھیگی آنکھوں سے مسکراتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی، ''تم نے تو کہا تھا یہ گھوڑا خو
عورتوں کا احترام کرتا ہے؟''

''ہاں۔ مگر تم تو لڑکی ہو ناں!'' وہ بھی اس کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ پریشے نے تاسف
کو دیکھا، سبزی مائل نیلے پانی پر اس کا ہیٹ تیر رہا تھا۔ افق نے اس کی نگاہوں کا تعاقب

''جانے دو۔ تم نیا لے سکتی ہو۔''

''اونہوں۔'' اس نے اداسی سے نفی میں گردن ہلائی۔ ''نئے ہیٹ پر ایسا باسی سر
لگا ہو گا جس کی پتیاں کنارے سے سیاہ ہو کر مرجھائی ہوں گی۔''

''صحیح کہہ رہی ہو۔ بعض چیزیں کھو جائیں تو پھر نہیں ملتیں، ان کا نعم البدل بھی نہیں ملتا اور بعض انسان بھی۔ چلو خیموں کی طرف چلتے ہیں۔''

وہ ساتھ ساتھ گھاس پر چلنے لگے، وہ ننگے پاؤں تھی جب کہ افق کے پاؤں میں جرابیں تھیں۔

''تمہارا ڈیر ابھی تک نامکمل ہے۔''

''جانتا ہوں اور میں تمہیں اب کوئی مشکل dare دوں گا۔''

''مگر وہ راکاپوشی کر کرنے سے متعلق نہیں ہوگا۔'' اس نے متنبہ کیا۔

''او کے، اب سنو۔ نتاشا کہہ رہی تھی اس کے بھائی کے کسی دوست کا باپ تمہاری کسی انٹیلی جنس ایجنسی کا چیف ہے؟''

''ہاں ہے۔ پھر؟''

''تم اس سے کہو، اپنے صدر سے کہہ کر مجھے گورنمنٹ آف پاکستان کی طرف سے کوئی صدارتی ایوارڈ دلوا دے۔'' وہ بچوں کے سے انداز میں ضد کر رہا تھا۔

اسے ہنسی آ گئی۔ ''تمہیں ہماری گورنمنٹ کی طرف سے ایوارڈ لینے کا شوق کیوں ہے؟''

''میں بیس سال بعد اپنے سفرنامے میں لکھنا چاہتا ہوں کہ جب میں اسلامی دنیا کے سب سے طاقت ور ملک میں گیا تو اس کے 'پادشاہ' نے میری خوب آؤ بھگت کی وغیرہ وغیرہ۔ سمجھا کرو نا، شو آف!''

''خیر، حسیب کے دوست کا باپ ایک سرکاری ملازم ہی ہے، رچرڈ آرمیٹیج نہیں جو اس کی بات مان لی جائے گی۔''

افق ہنس پڑا۔ ''کیا خوب بات کہی۔ عراق، امریکا جنگ میں امریکا ہماری منتیں کرتا رہا تھا مگر ترکی نے اور طیب اردگان نے اپنی سرزمین استعمال کرنے کی اجازت نہیں دی۔'' وہ دونوں گھاس پر چلتے ہوئے اردگان، مشرف اور افغان جنگ کی باتیں کرتے رہے۔ خیموں کے بجائے وہ جھیل کی طرف آ گئے تھے۔ سورج ابھی طلوع نہیں ہوا تھا، فجر کا وقت تھا۔

''میں نے نماز نہیں پڑھی۔ تم ٹھہرو، میں وضو کر لوں۔''

وہ جھیل کے پانی کے قریب چلا گیا اور گھاس پر پنجوں کے بل بیٹھ کر چلتے صاف پانی سے ہاتھ دھونے لگا۔

وہ اس کے ساتھ کھڑی مسکراتے ہوئے اسے وضو کرتے دیکھنے لگی۔ بازو کہنیوں تک دھو کر

اس نے کیپ اتاری اور مسح کیا پھر دونوں پاؤں کی جرابیں اتار کر انہیں پانی میں ڈبو کر دھو
وہ مسکراتے ہوئے اس کی انگلیوں کی حرکت کو دیکھ رہی تھی، یک دم اس کے چہرے سے مسکراہٹ
غائب ہوگئی۔ وہ جھٹکے سے دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

''افق...... یہ......'' وہ بے یقینی سے اس کے بائیں پاؤں کو دیکھ رہی تھی۔

''یہ کوہ پیماؤں کی زندگی ہے، مادام جہاں زیب۔ کچھ پانے کے لیے کچھ کھونا تو
ہے۔'' وہ بہت اطمینان سے اپنا بایاں پاؤں دھو رہا تھا جس کی آخری دو انگلیاں نہیں تھیں۔

''مگر...... کیسے...... یہ کیسے ہوا؟'' اس سے الفاظ ادا نہیں ہو رہے تھے۔

افق نے لاپروائی سے شانے اچکا دیئے۔ ''فروسٹ بائٹ۔'' اب وہ جرابیں واپس پہن رہا

''نماز قضا ہوگئی ہے شاید، مجھے جانے کیوں دھیان ہی نہیں رہا۔'' وہ افسوس کرتا ہوا
کیپ اٹھا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ یک ٹک اسے دیکھ رہی تھی۔

☆......☆......☆

''کتنی دیر رکنا پڑے گا ادھر؟'' پریشے نے قدرے جھنجلا کر پوچھا۔ یہ ماہوڈھنڈ
کے دوران پہلی بات تھی، جو اس نے کہی تھی۔ ورنہ وہ افق کی طرح بالکل خاموش رہی تھی
جب لینڈ کروزر سڑک کے درمیان میں رک گئی تھی تو اسے پوچھنا ہی پڑا۔

''جب تک یہ پتھر راستے سے نہیں ہٹے گا، ہم آگے نہیں جا سکتے۔''

ابھی آدھا گھنٹہ پہلے محض پانچ منٹ کی بوندا باندی ہوئی تھی، جس سے سڑک کے بالکل
طرف پہاڑ سے چپکا ایک دیوقامت پتھر ذرا سا سرک کر دائیں طرف ہو گیا تھا اور اس کے
سرکنے پر گاڑیوں کی ایک لمبی قطار جو دوسری جانب سے آ رہی تھی، رک گئی تھی۔ وہ جگہ اتنی
کہ اگر پتھر کے سائیڈ سے گاڑی نکالنے کی کوشش کی جاتی تو وہ سیدھا کھائی میں بہتے اشو میں
یہ جگہ آبشار اور اشو ویلی کے درمیان میں تھی، ان کی گاڑی کے پیچھے آبشار سے پلٹنے
لمبی قطار تھی اور دوسری جانب سے آبشار پر آنے والی گاڑیوں کا قافلہ تھا۔

لوگ گاڑیوں سے نکل کر اس وزنی پتھر کو دھکا لگانے لگے تھے، مگر وہ ہل کے ہی نہیں دے

''اس کو امریکا سمجھ کر دکا (دھکا) لگاؤ۔'' ایک گاڑی کے پٹھان ڈرائیور نے جوش
ماحول کشتِ زعفران بن گیا۔

''آؤ نیچے دریا پر اترتے ہیں۔'' وہ افق کے کہنے پر خاموشی سے اس کے پیچھے پہاڑ

نے لگی۔

''اتنی دیر سے کیا سوچ رہی ہو؟'' مسلسل خاموشی سے وہ جلد ہی اکتا گیا تھا۔

''یہی کہ ہم کل یہاں سے چلے جائیں گے۔ ان حسین وادیوں اور مرغزاروں کو چھوڑتے
ہوئے میں بہت اداسی محسوس کر رہی ہوں۔''

''تم حسین یادیں ساتھ لے جا رہی ہو۔''

''بچھڑنے کا دکھ حسین یادوں کو دل پر لگا گھاؤ بنا دیتا ہے جو وقت گزرنے کے ساتھ ناسور بن
جاتا ہے اور ناسور کوئی مسیحا نہیں بھر سکتا، وقت بھی نہیں۔'' وہ سر جھکائے، احتیاط سے پتھروں پر
پاؤں رکھ رہی تھی۔ چلتے چلتے اس نے جوتے کی نوک سے ایک پتھر کو ہٹایا، نیچے بے تحاشا سیاہ
رنگ کے موٹے کیڑے تھے، اس نے فوراً پتھر واپس رکھ دیا۔ کیڑے دب گئے۔

''ہم بچھڑ نہیں رہے۔ ہم پھر ملیں گے۔ مجھے اس بات کا پورا یقین ہے۔''

وہ چونکی، ''کدھر؟''

''راکاپوشی بیس کیمپ میں آٹھ تاریخ کو بیس کیمپ میں تمہارا انتظار کروں گا۔''

''کم آن!'' اس نے سر جھٹکا۔ ایک زخمی مسکراہٹ اس کے چہرے پر بکھر گئی۔ ''میں دُمانی
میں آؤں گی۔''

''تم دُمانی ضرور آؤ گی۔'' وہ پُر یقین تھا۔

ہنزہ کے باسی راکاپوشی کو پیار سے دُمانی کہتے تھے۔

''تمہیں کیسے اتنا یقین ہے۔''

''ایسے کہ تمہیں معلوم ہے کہ میں تمہارا انتظار کروں گا۔''

''تم بے جا انتظار کرو گے۔ میں نہیں آؤں گی۔ چلو اوپر چلتے ہیں، شاید امریکا، میرا مطلب ہے
تھر اب تک سرک چکا ہو۔'' وہ واپس اوپر چڑھنے لگی۔ دریا ان سے کئی فٹ نیچے نشیب میں بہ رہا تھا۔

''ہم اچھے دوست بھی تو ہیں، پری!''

(ہم اچھے دوست ''ہی'' تو ہیں؟ ہم اور ہیں کیا؟) وہ پوچھنا چاہتی تھی، اس کے جذبات کی
شدت، ان کے تعلق کی نوعیت، مگر بولی تو بس یہ کہ ''میری شادی ہے اور مجھے اس کی تیاری کرنی
ہے، میں نہیں آ سکوں گی، تمہیں بیس کیمپ سے سی آف کرنے بھی نہیں۔''

''مجھے بلاؤ گی اپنی شادی میں؟''

وہ ایک لمحے کو چپ سی ہوگئی۔ وہ ہنس پڑا، ''مذاق کر رہا تھا، جانتا ہوں تم مجھے اپنی
شریک نہیں کرو گی۔''

''خوشیوں میں؟'' اس نے یاسیت سے سوچا۔ کتنا بڑا مذاق کیا تھا ناافق نے بچھڑ
مگر اس نے کہا تھا وہ بچھڑ نہیں رہے اور اگلی شام، 31 جولائی کو پشاور ایئر پورٹ
اسے سی آف کرتے ہوئے بھی اس نے یہی کہا تھا۔

''میں تم سے دوبارہ ملنے کا منتظر ہوں۔''

''میرا خیال ہے، میں تمہیں زندگی میں آخری دفعہ دیکھ رہی ہوں۔''

افق نے مسکرا کر نفی میں سر ہلایا، ''میں نے کہا ناں۔ ہم بچھڑ نہیں رہے۔ میں راہ
کیمپ میں ایک بہت اچھی کوہ پیا کا منتظر رہوں گا۔''

اپنے بیگز کی ٹرالی دھکیل کر ڈیپارچر لاؤنج کی طرف بڑھتے وقت پریشے نے
اداس نظر اس پر ڈالی۔

''میں نہیں آؤں گی، افق! کوہ پیا کو اب پری کو بھلا دینا چاہیے۔''

''کوہ پیا اور پری کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی۔ میں قراقرم کے تاج محل پر قراقرم
انتظار کروں گا۔''

وہ مسکرایا، شہد رنگ آنکھیں چھوٹی ہوگئیں، پھر اس کی مُسکراہٹ دھندلا گئی۔ اس کے
ہر نقش پریشے کی آنکھوں میں چھائی دھند میں دھندلا ہوتا چلا گیا۔ وہ تیزی سے مڑی اور
وہاں سے چلی گئی، اس سے پہلے کہ قدیم یونانی دیومالا کے اس کردار کا کوئی لفظ روایات
اس کے قدموں کو زنجیر کر دیتا۔

☆......☆......☆

منگل، 2 اگست 2005ء

''میں کھانے کو دیکھ لوں'' کہہ کر وہ لاؤنج سے جانے ہی لگی تھی کہ پاپا نے روک
آہستگی سے کہا، ''وحید سے کہو، بازار سے چپلی کباب بنوا لائے۔''

''جلیل کے؟'' وہ بے خیالی سے بولی۔

''کیا؟'' وہ سمجھ نہ پائے تھے۔

''نہیں نہیں۔ کچھ نہیں۔ میں وحید سے کہتی ہوں۔'' وہ گڑبڑا کر سنبھلی۔ بھلا جلیل
گیا درمیان میں؟

''کتنی کمزور ہوگئی ہو پری بیٹا۔ خوامخواہ اتنی دور چلی گئیں۔ بھلا کیا رکھا ہے ادھر؟'' پھپھو پاپا کے
سامنے پیار جتاتی اسے بہت مصنوعی لگ رہی تھیں۔ (ادھر کیا رکھا تھا؟ ادھر ہی تو سب کچھ رکھا تھا)۔

''بس یونہی۔'' وہ مزید کچھ نہ کہہ سکی اور کچن میں آگئی۔ پھپھو ٹھیک کہہ رہی تھیں، اس نے کچن
کے کیبنٹ کے شیشے میں اپنا عکس دیکھ کر سوچا، وہ واقعی بہت کمزور اور الجھی الجھی لگ رہی تھی۔ یہ
اسے کیا ہو گیا تھا؟

''میں قراقرم کے تاج محل پر قراقرم کی پری کا انتظار کروں گا۔'' وہ آواز جو کسی نغمہ ساز کی دھن
سے زیادہ خوب صورت تھی، پچھلے تین دن سے اس کی سماعتوں میں گونج رہی تھی۔

وہ اس کا انتظار کرے گا اور اسے نہ پا کر واپس چلا جائے گا۔ قراقرم کی پری اور کوہ پیا کی کہانی
کا یہی منطقی انجام تھا پھر وہ کس کے لیے اداس تھی؟ اس کے لیے جس نے ایک دفعہ بھی نہیں کیا تھا
کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے، جس نے یہ تک نہیں بتایا تھا کہ اس کا گھر ترکی کے کس شہر میں ہے؟
پھر وہ اتنی جذباتی کیوں ہو رہی تھی؟

ان دو تین دنوں میں خوش گمانی کے سارے رنگ اس کی آنکھوں سے اتر چکے تھے۔ وہ بے
شک اس سے محبت کرنے لگی تھی، مگر وہ بھی اس سے محبت کرتا ہے، یہ اس نے کیسے اخذ کر لیا تھا۔
اب غیر جانب داری سے معاملے کو دیکھتی تو اسے لگتا کہ وہ یک طرفہ محبت کا شکار تھی۔

''پری، کیسی ہو؟'' وہ سلاد کاٹ رہی تھی جب سیف بغیر کسی دستک کے اندر داخل ہوا اور عین
اس کے پیچھے آکر بولا۔ وہ چونک کر پلٹی۔ سیف کو اتنے قریب دیکھ کر ناگواری سے اس کی پیشانی پر
بل پڑ گئے۔

''آپ اندر جا کر بیٹھیں، میں کھانا لگانے ہی لگی ہوں۔'' وہ واپس پلٹ کر جھک گئی۔

''میں ادھر ٹھیک ہوں۔ تم نے فون ہی نہیں کیا وہاں سے؟''

''پاپا کو کرتی تھی روزانہ، یہ بہت تھا۔'' اس کا انداز اتنا روکھا تھا کہ سیف چونکے بغیر نہ رہ سکا۔

''پھر بھی...... خیر گنوار قسم کے پہاڑی لوگوں میں جا کر رہنا کیسا تجربہ تھا؟''

اس نے زور سے چھری رکھی۔ ''پہاڑی لوگ گنوار نہیں، مخلص اور بہادر ہوتے ہیں۔''

''مگر میں نے تو سنا ہے کہ حیات آباد کے دکان داروں سے زیادہ چرب زبان اور بے ایمان
کوئی نہیں ہوتا۔''

''دکان دار تو سب ہی ایک جیسے ہوتے ہیں، چاہے حیات آباد کے ہوں یا اسلام آ
وہ سلاد میں لیموں نچوڑنے لگی۔

''پریشے!'' پاپا نے اسے آواز دی۔ وہ ''جی'' کہہ کر سیف کو مکمل طور پر نظرانداز کر کے با

''اپنے ماموں، ممانی کو بلا لاؤ۔'' وہاں اس کی شادی کی تاریخ رکھی جا رہی تھی اور ما کی موجودگی لازمی تھی۔

''ہاں ہاں، ان کو بھی ہونا چاہیے۔ آخر کو اکلوتی بھانجی ہے۔'' پھوپھو نے فوراً خوش کہا۔ وہ انہیں دیکھ کر رہ گئی۔

''جاتی ہوں پاپا!'' وہ دانستہ لاؤنج کے دروازے سے باہر گئی، نہ کہ کچن سے، کیوں سیف تھا۔

اسے سیف اور پھپھو جتنے برے اور منافق آج لگ رہے تھے، اتنے پہلے کبھی نہیں لگے پہلے وہ ان کو پسند نہیں کرتی تھی مگر اب ناپسند کرنے لگی تھی۔ اس کا رویہ اتنا روکھا پھیکا پہلے ک ہوا تھا، جتنا آج وہ اختیار کیے ہوئے تھی۔ پچھلے آٹھ دنوں نے اس کی زندگی بدل ڈالی تھی۔ دفعہ انسان پہاڑوں پر چلا جائے، تو پھر زندگی کبھی پہلے جیسی نہیں رہتی۔

نشاء کے لان میں آج پھر وہ لڑکا...... حسیب کے ساتھ بیٹھا کاغذ پر کوئی لسٹ بنا رہا تھا۔ دیکھتے ہی اٹھ کھڑا ہوا۔

''السلام علیکم پری آپا۔''

''ڈونٹ کال می آپا۔'' وہ ناک سکوڑ کر کہتی اندر چلی آئی۔ وہ اسے بہت برا لگتا تھا۔

ماموں اور ممانی لونگ روم میں ہی تھے۔ اس نے چہرے کے زاویے درست انہیں سلام کیا۔

''وہ آپ کو پاپا بلا رہے ہیں، دراصل پھپھو آئی ہوئی ہیں تو پاپا نے کہا کہ آپ لو جائیں۔''

''اچھا ڈیٹ فکس کرنے آئی ہوں گی۔ تم جاؤ پری! ہم آ رہے ہیں۔'' ماموں نے کہا۔

''اور کھانا وغیرہ سب ٹھیک ہے نا، کوئی مدد چاہیے تو بتاؤ، بنوا دوں تمہارے ساتھ کچھ بالکل ماؤں والے انداز میں فکر مند ہو رہی تھیں، وہ مسکرا دی۔

''مامی، سب کچھ تیار ہے۔ بس آپ لوگ آجائیں۔'' وہ وہاں سے جا رہی تھی، جب م

دھیرے سے ماموں سے کہا۔

''میرا بیٹا بڑا ہوتا تو میں کبھی پریشے کو ان ناقدروں میں نہ جانے دیتی۔''

''کبھی میں سوچتا ہوں کہ جہاں زیب سے ایک دفعہ تو پوچھوں کہ سیف میں اچھی شکل اور پیسے کے علاوہ اسے کیا نظر آیا ہے جو اس نے......'' اس سے آگے وہ سن نہ سکی کہ باہر آ گئی تھی۔

وہ دونوں لان میں بیٹھے تھے، اس کو دیکھ کر بولتے بولتے رک گئے۔

''ویسے نام کیا ہے تمہارا؟'' وہ ان کے قریب سے گزر کر جانے ہی لگی تھی، مگر کسی خیال کے تحت رک کر پوچھ لیا۔ وہ اس کا نام ہمیشہ بھول جایا کرتی تھی۔

''مصعب...... مصعب عمر......'' وہ کھڑا ہو گیا۔

''تم وہی ہو نا، تمہارے ابا شاید کور کمانڈر تھے اور پچھلے سال شاید ان کو ایک ایجنسی کا اعلیٰ عہدہ دے دیا گیا ہے، ہے ناں؟''

''بالکل! پنڈی کو ان جیسا ہینڈسم کور کمانڈر آج تک نہیں ملا۔'' وہ اس کے ساتھ چلنے لگا تھا۔

''میں نے سنا ہے ان کو آگے بھی ''بہت زیادہ'' ترقی ملنے کے چانسز ہیں اور یہ کہ وہ صدر کے خاص دوستوں میں شمار ہوتے ہیں۔'' وہ بڑے اکھڑے اکھڑے انداز میں پوچھ رہی تھی۔

''میں نے کبھی ان سے پوچھا نہیں۔''

''کم آن۔ اتنا تو مجھے بھی پتا ہے کہ پنڈی کا کور کمانڈر آرمی چیف کا فیورٹ ہوتا ہے۔''

''فیورٹ کی بات نہیں ہے، بعض لوگوں میں اتنی خوبیاں ہوتی ہیں کہ آپ کے لیے انہیں نظرانداز کرنا مشکل ہو جاتا ہے اور مجھے زیادہ نہیں پتا ہوتا۔ یو سی، میں ادھر نہیں گھوڑا گلی میں ہوتا ہوں!'' اس نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔

پریشے نے کھڑے کھڑے اسے گھور کر دیکھا۔ ''ویسے باجیوں کی عمر کی لڑکیوں کو دیکھ کر سیٹی بجانا بھی لارنس کالج میں سکھایا جاتا ہے؟''

''وہ پریشے آپی، میں......''

''جسٹ ڈونٹ کال می آپی۔'' وہ کھٹ کھٹ کرتی وہاں سے چلی گئی۔

☆......☆......☆

بدھ، 3 اگست 2005ء

''میں گھنٹے تک تمہیں پک کر لوں گا، ڈنر ساتھ کریں گے۔'' سیف کا اس کے موبائل پر فون

آیا تھا۔

''کدھر؟''

''کسی ریسٹورنٹ میں یار!''

''نمبر ایک میں کوئی ''یار'' نہیں ہوں۔ دوسری بات، میں ابھی بہت بزی ہوں،
کا انداز کھردرا سا تھا۔

''تم اپنی مصروفیت ملتوی کردو اور......''

''سیف، میری کال آرہی ہے، میں بعد میں بات کرتی ہوں۔'' اس نے موبائل
اسے یاد آیا، افق نے گہری رات میں اسے جھیل کے کنارے واک کرنے کا کہا
ساتھ چل پڑی تھی، مگر سیف پر اسے ذرہ برابر بھی اعتبار نہ تھا۔

''کیا وہ شخص اس کی قسمت میں نہیں ہوسکتا تھا؟ اگر ایسا تھا تو وہ دونوں برستی بارش
کی پہاڑیوں پر ایک دوسرے سے کیوں ٹکرائے تھے؟'' وہ ہمیشہ یہ بات سوچتی تھی۔

☆......☆......☆

چائے کا مگ اس نے ٹرے میں رکھا اور پاپا کے کمرے کے قریب آ کر
دستک دی۔

''آؤ پریشے۔'' وہ بیڈ کراؤن سے ٹیک لگائے کوئی بزنس میگزین دیکھ رہے تھے
کر رکھ دیا۔

''کیا پڑھ رہے تھے آپ؟'' ان کو چائے کا مگ تھما کر وہ بیڈ کی پائینتی پر ٹک گئی۔

''شوکت عزیز کی بتائی گئی گروتھ ریٹ میں اضافے کی فگرز کا رٹیل فگرز سے موازنہ
آدمی سٹاک مارکیٹ اسکینڈل کا حصہ رہا ہے، یہ تو اس ملک کی اکانومی تباہ کردے گا اور
جھوٹ......'' وہ کہتے کہتے اس کے چہرے کے تاثرات کو دیکھ کر رک گئے۔ ''تم کچھ کہنا

''پاپا...... وہ...... اگر آپ اجازت دیں تو وہ البرتو ہے نا...... میں نے آپ کو
البرتو کی گیارہ افراد کی ایکسپیڈیشن ٹیم راکاپوشی summit کرنے جارہی ہے۔ ایک
ایکسپیڈیشن اور بھی ہے۔ بائیس دن کی کوہ پیمائی ہوگی اور......''

''تم ان کے ساتھ آٹھ ہزار میٹر بلند پہاڑ پر جانا چاہتی ہو؟'' ان کے لہجے میں سنجیدگی

''آٹھ ہزار کہاں، راکاپوشی تو بس سات ہزار اور چند میٹر بلند ہے۔'' (اس نے

چند میٹر 788 میٹر تھا)۔ ''اور اس کی کلائمب تو خاصی مختصر ہے۔'' (اس نے دعا کی کہ ان کو علم نہ ہو
کہ راکاپوشی کا شمال مغربی Ridge دنیا کا طویل ترین رج ہے) ''اور موسم تو ادھر بالکل بھی خراب
نہیں ہوتا۔'' (اس نے یہ بھی نہیں بتایا کہ البرتو اپنی ٹیم کے ساتھ کئی دن سے راکاپوشی بیس کیمپ میں
موسم ٹھیک ہونے کا انتظار کر رہا ہے)۔ ''میں چلی جاؤں پاپا؟''

''تم جانتی ہو، میں تمہیں اجازت نہیں دوں گا۔'' ان کا لہجہ قطعی تھا۔

''جی!'' وہ مایوس ہوکر وہاں سے چلی آئی۔

باہر برآمدے میں آکر وہ ستون سے ٹیک لگا کر سیاہ آسمان کو دیکھنے لگی۔ تاریکی کے پردے کی
اوٹ سے کمان سا باریک چاند جھانک رہا تھا۔ پریشے نے اداسی سے چاند کو دیکھا، یہ چاند ہنزہ کے
آسمان پر بھی روشن ہوگا، نگر کے دریا کے پانی پر بھی چاندنی کی پریوں نے رقص کیا ہوگا، ہوسکتا ہے
اس وقت افق ارسلان بھی اسے ہی دیکھ رہا ہو، اس کے روشن وجود میں کسی اور کو تلاش کر رہا ہو۔

''میں قراقرم کے تاج محل پر قراقرم کی پری کا انتظار کروں گا۔'' یونانی دیومالا کا وہ
کردار قراقرم کے تاج محل پر اس کا انتظار کر رہا تھا، مگر وہ وہاں نہیں جاسکتی تھی۔ پری کے پر کاٹ
دیے گئے تھے۔

پھر پتا نہیں اس کے دل میں کیا سمائی، وہ اپنے کمرے میں آئی اور دیوار پر لگے پوسٹرز اتارنے
لگی۔ ان کو اتار کر وہ کچن میں آگئی اور چولہا جلایا۔

مایہ ناز کوہ پیما اور دنیا کے بلند پہاڑ اس نے آگ میں ڈالنے شروع کردیے، ایورسٹ، کے ٹو، براڈ پیک، گیشر برم ٹو، Nuptse, Annapurna II کی دیوار، سب اس کے چولہے میں جل
رہے تھے۔ زندگی میں ایک مقام ایسا آجاتا ہے جہاں انسان کو اپنے تمام خوابوں سے دستبردار ہونا
پڑتا ہے۔ پریشے کی زندگی میں وہ مقام آگیا تھا۔

''پری!'' اس نے چونک کر بھیگے چہرے کے ساتھ پیچھے دیکھا۔ پاپا دروازے میں حیران سے
کھڑے تھے۔ اس نے جلدی سے آنسو صاف کیے۔

''یہ کیا کر رہی ہو؟'' انہوں نے آگے بڑھ کر چولہا بند کیا اور اس کے ہاتھ میں موجود آخری
پوسٹر تھاما۔ توماز ہومر نانگا پربت کے سامنے کھڑا تھا۔

''انہیں کیوں جلا رہی ہو؟ یہ تو تم نے بہت شوق سے خریدے تھے۔''

''بس پاپا، اس شوق کا کیا فائدہ جو صرف خوابوں تک محدود رہے۔'' زبردستی مسکرانے کی

کوشش میں اس کی آنکھیں مزید بھیگتی چلی گئیں۔ کتنی ہی دیر وہ اس کو دیکھتے رہے۔ پیاری اور فرماں بردار بیٹی یوں رو رہی تھی، وہ بھی ایک چھوٹی سی خواہش کے پیچھے؟

''تم جاسکتی ہو، پری!''

''جی، میں سونے جا ہی رہی تھی۔'' وہ سر جھکا کر ان کے سامنے سے ہٹنے ہی لگی تھی کہ

''تم راکاپوشی جاسکتی ہو۔''

وہ جاتے جاتے تیزی سے ایڑیوں کے بل گھومی، اسے لگا اس نے کچھ غلط سنا ہے۔

''آپ نے کیا کہا، پاپا؟''

''تم راکاپوشی کلائمب (کوہ پیمائی) کے لیے جاسکتی ہو مگر صرف 22 دن کے لیے'' وہ ہلکے سے مسکرائے۔

وہ ہکا بکا سی انہیں دیکھ رہی تھی۔ ''میں...... میں جاسکتی ہوں؟''

''ہاں۔ مجھے آج اندازہ ہوا ہے کہ اگر میں نے اپنی بیٹی کو اس کا سب سے بڑا خواب یہ اس کے ساتھ بہت بڑا ظلم ہوگا۔'' انہوں نے ہولے سے اس کا سر تھپکا، ''مگر تم جاؤ سیف کو کہوں، تمہارے ساتھ چلا جائے؟''

''نہیں، سیف نہیں، پاپا!'' اس سے تو بہتر تھا وہ نہ ہی جاتی۔ ''نشاء اور حسیب ساتھ ناں، حسیب کے فرینڈز کا گروپ ویسے بھی پرسوں ہنزہ جا رہا ہے، راکاپوشی بیس کیمپ کرنے۔ میں ان کے ساتھ چلی جاؤں گی۔'' اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ پاپا اتنی جلدی دے دیں گے۔

''تم نے تو پوری پلاننگ کر رکھی ہے۔'' انہوں نے مشکوک انداز میں اسے گھور دی۔ وہ دونوں ساتھ ساتھ چلتے ہوئے باہر لاؤنج میں آگئے۔

اچھا، مجھے بتاؤ۔ کتنے پیسے چاہیے ہوں گے، تمہاری ٹور کمپنی نے تو گیارہ ہزار لیے انہوں نے والٹ جیب سے نکالا۔

''راکاپوشی کے لیے پاپا، سات، آٹھ......'' اس نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔

''بس آٹھ ہزار؟'' وہ ہزار ہزار کے نوٹ گننے لگے۔

''آٹھ لاکھ پاپا۔'' اس نے تھوک نگل کر کہا۔ پہلے ہمیشہ وہ سپانسرڈ اور فنڈز ایکسپیڈ ساتھ جاتی تھی، اب دو دن میں وہ فنڈ ریز کرنے سے یا سپانسر شپ حاصل کرنے سے تو

''پری، آر یو سیریس؟'' وہ حیران ہوئے تھے۔ ان کا دل تنگ تھا، نہ ہاتھ مگر انہیں حیرانی ہوئی تھی۔

''بس پاپا، تھوڑا مہنگا شوق ہے ناں۔'' وہ جھینپ کر ہنس دی۔ اسے اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب اتنا آسان ہوگا، اگر ہوتا تو وہ تو کافی عرصہ پہلے ہی پوسٹرز جلانا شروع ہو جاتی۔ اسے تو ماز ہومر کا وہ پوسٹر پہلے کبھی اتنا اچھا نہیں لگا تھا، جتنا آج لگ رہا تھا۔

☆......☆......☆

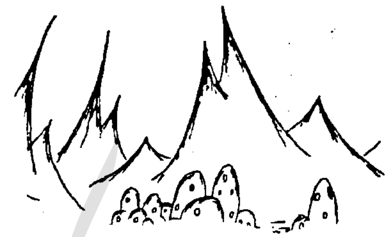

ساتویں چوٹی

پیر، 8 اگست 2005ء

''کدھر پھنسا دیا ہے آپ نے پریشے آپا؟ میں تو پتا نہیں کتنا رومانٹک سفر سوچ کر آیا تھا۔ ہنزہ پہنچ کر چار پانچ پورٹرز لیں گے، سامان گدھوں پر اور پھر آئے گا جگلت کے دریا کے کنارے سفر کرنے کے بعد تغافری کا بیس کیمپ، خوب صورت دریا، گھنا جنگل، سبزہ ہی سبزہ، وہ جیسے بتایا تھا۔ مگر اللہ بھلا کرے آپ کا، آپ ہمیں رومانٹک قسم کے راکاپوشی کے ویسٹ فیس کے کدھر برف زاروں میں لے آئی ہیں؟ اتنی برف اور اتنے کریوس ہیں ادھر۔ یہاں تو گدھے نہیں آتے، ہم تو پھر انسان ہیں۔''

''خیر تمہارے انسان ہونے پر مجھے شک ہے، حسیب!'' شاہراہ قراقرم سے راکاپوشی شمال مغربی رخ کا فاصلہ دو دن کی پیدل مسافت پر تھا اور پچھلے دو دن میں حسیب یہ بات کوئی چھے سو دفعہ کہہ چکا تھا۔ سو بے حد تنگ آ کر نشاء نے جواب دیا۔

''یہ اتنا خطرناک علاقہ ہے، اس ایکسپیڈیشن ٹیم کی مت ماری گئی ہے جو راکاپوشی نارتھ ویسٹ پر سے سر کرنا چاہتی ہے؟ اس راستے سے کوئی بھی چوٹی تک نہیں پہنچ سکا۔''

وہ سب ایک گلیشیئل وادی میں آگے پیچھے ایک قطار میں چل رہے تھے۔ پریشے، نشاء اور حسیب سے پیچھے اس کے دوست اور ان سے پیچھے اٹھائیس پورٹر تھے، جو انہوں نے ہنزہ سے ہی لیے تھے۔

''حسیب! تمہیں تکلیف کیا ہے؟ تمہارا ''بوجھ'' تو پورٹرز نے اٹھایا ہوا ہے۔'' حسیب کی مسلسل چلتی زبان پر پریشے غصے سے بولی۔ دو دن پورٹرز کے ساتھ رہ کر وہ بھی سامان اور کندھے پر اٹھائے رک سیک کو ''بوجھ'' بولنے لگی تھی۔

پورٹرز پاکستان میں وہی کام کرتے ہیں، جو نیپال میں شرپا کرتے ہیں۔ سیزن میں جب سیاحوں کی آمد و رفت عروج پر ہوتی ہے، یہ پورٹر ان کا سامان اٹھاتے ہیں اور انہیں ان کی منزل تک پہنچا دیتے ہیں۔ نشاء نے اتنے سارے پورٹرز لینے پر دو دن پہلے پریشے سے حیرت سے کہا تھا۔

''ان پر اتنے پیسے خرچ کرنے کے بجائے ہم ان کے بغیر چلے جاتے ہیں...... کیا فرق پڑے گا؟''

''فرق تو کوئی نہیں پڑے گا، بس ہم دو دن تو کیا دو مہینوں میں بھی راکاپوشی نہیں پہنچ سکیں گے۔''

پچھلے دو دن سے وہ پیدل ان برفیلی وادیوں میں سفر کر رہے تھے۔ یہ وہ علاقے تھے، جہاں آپ فاصلے کو کلومیٹر، میٹر، یا میل سے نہیں، دنوں، ہفتوں اور مہینوں سے ناپتے ہیں۔

پریشے نے دو دن پہلے جب پیدل سفر شروع کیا تھا تو اسے اسلام آباد، کراچی، لیک ڈسٹرکٹ، سب بھول گیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ سینکڑوں سال پہلے وقت میں پیچھے چلے گئے ہوں، جب انسان پیدل پتھروں اور برف پر سفر کیا کرتا تھا۔

''ویسے مجھے لگتا ہے، ہم سا پاگل کوئی نہیں ہوگا، جو گھروں کا سکون چھوڑ کر پہاڑوں میں ٹریکنگ پر نکل جاتے ہیں اور آپا جیسا پاگل بھی کوئی نہیں ہوگا، جو پہاڑوں کو سر کرنا چاہتی ہیں۔''

''اب کتنا فاصلہ رہ گیا ہے؟'' وہ حسیب کے مذاق کو نظر انداز کر کے عقب میں اس تنگ راستے پر چلتے پورٹرز کے سردار سے پوچھنے لگی۔

''بس میڈم، آدھا گھنٹہ اور!'' پورٹرز کے سردار نے پورٹرز کے دستور کے مطابق بو... رکھا تھا۔

''پچھلے 12 گھنٹوں سے یہ بلڈی چیپ ''آدھا گھنٹہ اور'' کہہ رہا ہے۔'' عقب... انگریزی میں بڑبڑایا۔

پریشے نے گردن پھیر کر دیکھا۔ حبیب کا وہی دوست ایک برفانی نالے کے کنارے... ہوا بڑبڑا رہا تھا۔ وہ کوئی سخت بات کہنا چاہتی تھی، مگر سامنے سے آتے افراد دیکھ کر ان کی طرف... ہوگئی۔

وہاں گلیشئر پر ان کے سامنے سے ایک ٹیم آ رہی تھی۔ پریشے اپنی ٹریکنگ اسٹک کو... چلتی، تیز قدمی سے ان تک جا پہنچی۔ یوں لگتا تھا جیسے سالوں بعد ان تنہا، سنسان وادیوں... انسان کو دیکھا ہو۔

''السلام علیکم۔ پاکستانی؟'' ان کے چہروں سے ظاہر تھا، پھر بھی قریب پہنچنے پر اس نے...

وہ پانچ تھے، ان کے پاس کوئی سامان نہیں تھا، ان سے کئی گز پیچھے ان کے پورٹرز کی فوج آ رہی تھی۔

''جی میڈم۔ پاکستانی الحمدللہ!'' وہ خاصا تھکا ہوا لگ رہا تھا، پھر بھی بہت رعب... سے بولا۔ وہ اس کی کٹنگ سے ہی پہچان گئی تھی کہ فوجی تھا۔ باقی بھی آرمی کے ہی تھے... خاصے تھکے تھکے لگ رہے تھے، البتہ پانچواں بہت تازہ دم اور مطمئن دکھائی دیتا تھا، اس کا... گلاسز اور مفلر کی وجہ سے وہ اس کا چہرہ ٹھیک سے دیکھ نہیں سکی تھی۔

''بیس کیمپ سے آ رہے ہیں آپ؟ وہاں موسم کیسا ہے؟''

''موسم؟'' تازہ دم پانچویں ساتھی نے ہنس کر سر جھٹکا اور آگے بڑھ گیا۔

لیڈر، جس کا نام میجر اطہر تھا، کہنے لگا۔

''موسم کی مت پوچھیں، مس! ہم پاکستان آرمی کی ملٹری ایکسپیڈیشن کر رہے تھے... راکاپوشی کے اوپر پانچ ہزار میٹر کی بلندی پر خیموں میں قید ہو کر موسم کے ٹھیک ہونے کا انتظ... رہے۔ آٹھویں دن ہار مان کر نیچے اتر آئے۔ جس دن بیس کیمپ پہنچے، موسم بالکل ٹھیک ہو... کی بات پر پریشے ہنس پڑی۔

''اب کون کون ہے بیس کیمپ میں؟'' اس نے میجر اطہر سے پوچھا۔

''البرتو کی ٹیم ہے مگر وہ بھی ہمت ہار کر جانے لگے ہیں، اس کے علاوہ دو پاکستانی...

موجود ہیں۔''

''افق ارسلان کی ٹیم؟'' اس کا دل زور سے دھڑکا۔ اس نے ایک نظر میجر اطہر کی پشت پر ...یہ قراقرم کے پہاڑوں کی اوٹ سے جھانکتے ''بگ وائٹ ماؤنٹین'' راکاپوشی پر ڈالی۔ وہ قریب ہی تھا۔

''جی ہاں، یہ میجر عاصم، جو ابھی آگے گیا ہے، افق ارسلان کا دوست بھی ہے اور لیزان آفیسر بھی۔ ارسلان کو کچھ چاہیے تھا، اس کے لیے ہی ہنزہ جا رہا ہے۔'' پریشے نے پلٹ کر دیکھا، میجر عاصم خاصا دور جا چکا تھا۔

وہ پاک آرمی کی ملٹری ایکسپیڈیشن ٹیم کو خدا حافظ کہہ کر اپنی ٹیم کے ساتھ چلنے لگی۔ نگر اور ہنزہ کے دریاؤں کو وہ کافی پیچھے چھوڑ آئے تھے۔ ہنزہ کے دریا کے پانی سے اس نے سونے کے ذرّات ڈھونڈنے کی کوشش کی، مگر اسے ناکامی ہوئی۔ اس نے سن رکھا تھا کہ سکندر اعظم کی فوج کی نسل جس وادی میں آباد ہے، (ہنزہ کی وادی) وہاں کے دریائے ہنزہ سے سونا نکلتا ہے۔

''اف کتنا لمبا راستہ ہے نا! حکومت کو چاہیے، راکاپوشی تک سڑک بنا دے، بندہ آرام سے پہنچ جائے۔'' حبیب کا دوست جس کا نام وہ پھر بھول چکی تھی، کہہ رہا تھا۔

''ہاں تاکہ مری کی طرح ہر بندہ منہ اٹھائے ادھر چلا آئے؟ نہیں بیٹا، راکاپوشی کا حسن خراج مانگتا ہے، اس کو ایک نظر دیکھنے کے لیے پیدل میلوں کی مسافتیں طے کرنی پڑتی ہیں۔''

''ثابت ہوا کہ بندہ ''پربتوں کی دیوی'' راکاپوشی کو دیکھ کر عقل مند ہو جاتا ہے، مثلاً حبیب جس نے زندگی بھر کوئی عقل مندی کی بات نہیں کی، مگر بیس کیمپ پہنچتے ہی......''

وہ آگے سن نہ سکی، کیوں کہ بیس کیمپ کے قریب پہنچ کر اس نے اپنا رک سیک برف پر پھینکا اور اپنی ٹیم سے آگے بھاگ پڑی۔

اس کے سامنے پربتوں کی دیوی اپنے تمام تر حسن کے ساتھ کھڑی تھی، مگر اسے اس کی تلاش نہیں تھی، جس کے لیے وہ یہاں آئی تھی۔

برف سے ڈھکے راکاپوشی کے قدموں میں پتھروں کے Moraine پر بالکونی کی صورت ایک بیس کیمپ تھا۔ ہر طرف نیلے، پیلے اور سرخ خیمے لگے تھے۔ بیس کیمپ سے 100 میٹر نیچے ایک دیوقامت بے ترتیب گلیشئر تھا۔ یہ تمام ''برو'' کا گلیشئر تھا اور برو کے گلیشئر پر افق ارسلان اور البرتو کی ٹیم نے بیس کیمپ ٹھیک اس جگہ لگایا تھا، جہاں 1979ء میں ایک پولش (Polish) پاکستانی

ٹیم نے نصب کیا تھا۔ اس پر اگلے دن ہی راکاپوشی سے برف کی ایک دیوار ٹوٹ کر گری
برفشار (avalanche) سے پیدا ہونے والی ہواؤں سے ہی تمام خیموں کی میخیں اکھڑ گئی
پریشے برو کے خطرناک گلیشیئر پر اپنے ہلکے، واٹر پروف، ٹریکنگ بوٹس کی مدد سے بھا
خیموں کی طرف آئی۔ وہاں درجنوں خیمے نصب تھے۔

''افق ارسلان کہاں ہے؟'' دھڑکتے دل سے اس نے سامنے سے آتے اطالوی
سے پوچھا۔

''ان دی میس تینت۔ دی لاست ون!'' وہ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں بتا کر عجلت میں آگے
گیا۔ وہ دوڑتی ہوئی آخری نیلے خیمے کے قریب آئی، باہر رک کر اس نے اپنا تنفس درست کیا
سے اونی ٹوپی اتار کر پونی ٹھیک سے باندھی، پھر ٹوپی پہنی، سن گلاسز اتار کر اپنی جیکٹ کی جیب
رکھے اور خود کو نارمل کرتے اور اندرونی خوشی کو چھپاتے ہوئے خیمے کی کھلی زپ سے اندر جھانکا

وہ میس ٹینٹ کے اندر کرسی پر بیٹھا تھا، اس کی پشت پریشے کی جانب تھی۔ دُمانی سے آتی
سرد ہوا کے تھپیڑوں کے باعث خیمے کا کپڑا پھڑ پھڑا رہا تھا۔ وہ اندر آ گئی۔

''کیسے ہو، افق؟'' اس کے عقب میں بازو سے پر باندھے، اس نے مسکرا کر پوچھا
چونک کر گردن گھمائی اور اسے دیکھ کر اٹھ کھڑا ہوا۔

''ایم فائن۔'' اس کی توقع کے برعکس وہ حیران نہیں ہوا تھا، اس کے چہرے کے
ایسے تھے، جیسے وہ کسی گہری سوچ سے چونکا تھا اور پھر دوبارہ اس میں کھو گیا تھا۔

وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ کیسا ہے، اس نے اتنے دن کیسے گزارے۔ اس کا
نہیں اور اسے اس کا سرپرائز کیسا لگا؟ مگر کچھ بھی پوچھنے سے پہلے اس کی نظر افق کے ہاتھ
ایک چھوٹی سی پاسپورٹ سائز تصویر پر پڑی۔

''یہ کیا ہے؟'' پچھلے دو دن سے اس نے اپنی اور افق کی جو گفتگو تصور کی تھی، وہ بالکل
نہیں تھی۔ وہ جو بہت سی باتیں بتانا اور پوچھنا چاہتی تھی، اب اچھنبے سے اس تصویر کو دیکھ رہی
''یہ؟'' افق نے گردن جھکا کر تصویر کو دیکھا، زخمی انداز میں مسکرایا اور تصویر اس کی
دی۔ ''یہ حنادے ہے۔''

''کون حنادے؟'' اس نے تصویر کے لیے ہاتھ بڑھایا، جس میں ایک سنہری بالوں
صورت آنکھوں والی لڑکی مسکرا رہی تھی۔

''حنادے...... میری بیوی۔''

تصویر تھامنے کو بڑھا پریشے کا ہاتھ نیچے گر گیا۔ وہ بے یقینی سے اسے دیکھتی دو قدم پیچھے ہٹی تھی۔

''بیوی؟''

ہمالیہ اور قراقرم کے سارے پہاڑ اس کے سر پر گرے تھے۔

وہ بے یقینی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس نے اپنی حیرت، صدمہ کچھ بھی چھپانے کی سعی نہیں کی تھی۔ کسی نے جیسے اس کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی تھی اور وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے تکے جا رہی تھی۔

''ہاں، یہ اس کی پکچر یونہی نکال لی تھی۔ خیر، تم کب آئیں؟'' تصویر واپس والٹ میں رکھ کر جیب میں ڈالتے ہوئے افق کا انداز بہت نارمل تھا۔

''ابھی۔'' اس کا لہجہ ایک دم روکھا سا ہو گیا تھا۔ اس نے گردن دوسری جانب پھیر لی۔

''مجھے علم تھا، تم ضرور آؤ گی۔ میں نے تمہارا انتظار کیا اور دیکھ لو، بے جا انتظار نہیں کیا۔'' وہ مسکرایا۔

کوئی دھوکا کھا جائے تو دھوکا دینے والا ایسے ہی مسکراتا ہے۔ پریشے کا نسوانی وقار بری طرح مجروح ہوا تھا۔

''ٹھہرو، میں اپنی باقی ٹیم کو دیکھ آؤں۔'' افق نے اس کا خشک اور رکھائی بھرا انداز نوٹ نہیں کیا۔ وہ اسے چھوڑ کر قدرے بددلی سے باہر آ گئی۔ وہ بھی اس کے پیچھے آ گیا۔

''یہ تمہاری سپورٹ ٹیم ہے، ٹریکرز ہیں یا یہ بھی کلائمب کریں گے؟''

''ٹریکرز ہیں۔'' وہ اس سے دور ہٹ کر پتھروں پر چلتے ہوئے نیچے کی سمت سے آنے والی اپنی ٹیم کے افراد تک آئی۔ وہ سب پرجوش سے ہو کر اپنے رک سیک اتار کر نیچے برف پر پھینک رہے تھے اور راکاپوشی کی حسین چوٹی کو گھوم پھر کر دیکھ رہے تھے۔ صرف وہ تھی جس کی دلچسپی وہاں موجود ہر شے سے ختم ہو گئی تھی۔

دور ایک پتھر پر ارسہ بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے گھٹنوں پر کاغذ رکھے تھے اور ان پر کچھ لکھ رہی تھی۔ شور، ہلچل اور ٹریکرز کی آوازیں سن کر اس نے سر اٹھایا۔ پریشے کو سامنے دیکھ کر وہ سارے کاغذ وہاں چھوڑ کر بھاگتے ہوئے اس کی جانب آئی۔

''پریشے آپی! آپ ادھر؟ اوہ گاڈ، مجھے یقین نہیں آ رہا۔'' وہ خوشی کے مارے اس سے لپٹ

گئی، پھر الگ ہو کر اسے کندھوں سے تھام کر خوشی سے مخمور لہجے میں بولی، ''یقین کریں، آج
میں آپ کے متعلق سوچ رہی تھی۔ بہت اچھا کیا جو آپ آ گئیں۔ ویسے اتنی جلدی کلائمنگ
کیسے بنا آپ کا؟''

''کم آن، میں پاکستانی ہوں، مجھے کلائمنگ پرمٹ کی ضرورت نہیں ہے۔'' اپنی آوا
بشاشت پیدا کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے وہ پھیکی مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

بیس کیمپ کے ہنگامے ٹریکرز کی آمد کے باعث جاگ اٹھے تھے۔ چند پورٹرز خیمے لگا
تھے، لڑکے ان کی مدد کرنے لگے۔ پریشے اپنے ساتھ ایک کک ''شفالی'' بھی لائی تھی، جو
کر چپاتیاں پکانے لگا تھا۔ شفالی کے قریب بیٹھے پورٹرز پانی میں ستو گھول کر پی رہے تھے۔

Paulo Alberto (پالو البرتو) کی اطالوی ٹیم بھی ان کے قریب آ گئی تھی۔ البرتو ا
سے نابلد تھا، باقی اطالویوں میں سے ایک کو تھوڑی بہت انگریزی آتی تھی۔ وہ سب کو بتا ر
کل صبح اس کی ٹیم واپس جا رہی ہے اور وہ راکاپوشی کو چھوڑ کر بلتورو کی کسی چوٹی کو سر کرنے
رہے ہیں۔

پریشے نے پورٹرز کی مزدوری کی تمام رقم ''سردار'' پورٹر کے ہاتھ میں رکھ دی اور اپنے خیمے
چلی آئی۔ یہ پورٹرز کا دستور تھا کہ ہمیشہ رقم سردار کو ملتی تھی، پھر وہ آگے اس کو تمام پورٹرز میں تقسیم
تھا۔

اپنے خیمے میں آ کر اس نے میٹ بچھا کر سلیپنگ بیگ رکھا اور اس میں لیٹ کر آنکھیں
لیں۔ اس کی سماعتوں سے باہر ہونے والا شور و غل اور قہقہوں کی آوازیں ٹکرا رہی تھیں مگر اس
کہیں اور تھا۔

حنادے...... افق کی بیوی...... وہ شادی شدہ تھا۔ کسی اور کا پابند تھا تو پھر اسے کیوں
کے تاج محل پر بلایا تھا؟ وہ غلط سمجھی تھی اسے؟ اس نے دھوکا کھایا تھا؟ جانے کب اسے نیند
گھیرا۔ افق اسے رات کے کھانے پر بلانے آیا مگر سوتا خیال کر کے واپس چلا گیا۔

☆......☆......☆

منگل، 9 اگست 2005ء

ہر سو گہری دھند چھائی تھی۔ وہ کسی بادل کے وسط میں پھنسی تھی۔ دھند میں اسے اس
دکھائی دیا۔ سبز آنکھوں اور سنہری بالوں والی لڑکی۔ وہ پریشے کو دیکھ کر تمسخر سے مسکرائی۔ پھر

سے چلانے لگی، ''افق میرا ہے۔ وہ صرف میرا ہے۔'' اسے لگا اس کی آواز سے اس کے کانوں کے پردے پھٹ جائیں گے۔ نہایت طیش میں آ کر وہ آگے بڑھی اور دونوں ہاتھوں سے زور سے حنادے کو دھکا دیا۔ وہ چیختی، زور زور سے چلاتے ہوئے اس برفیلی چوٹی سے نیچے لڑھک گئی۔ اگلے ہی پل کسی چھوٹی سی گڑیا کی مانند اس کا جسم نیچے کھائی میں گر رہا تھا، وہ بلند آواز میں چیخ رہی تھی، اتنی بلند گڑگڑاہٹ نما آواز کہ اس کو لگا وہ بہری ہو جائے گی۔ ہوا کو آری کی طرح چیرتی بھاری گڑگڑاہٹ......

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔ اس کا سانس تیز تیز چل رہا تھا اور چہرہ پسینے سے بھیگا ہوا تھا۔ اس نے بے اختیار اپنے چہرے کو چھوا اور گھبراہٹ میں ادھر ادھر دیکھا۔ وہ اپنے خیمے میں تھی۔ یہ سب ایک بھیانک خواب تھا مگر وہ آواز ابھی تک سنائی دے رہی تھی۔ ہوا کے زور سے اس کے خیمے کا گور ٹیکس پھڑ پھڑا رہا تھا۔ وہ تیزی سے زپ کھول کر باہر آئی۔

ہنزہ کے دریا کے ساتھ واقع کریم آباد گاؤں پر صبح طلوع ہو رہی تھی۔ نیلاہٹ مائل سنہری روشنی سے راکاپوشی کا دودھ کی طرح سفید اور اطراف کے سیاہ دیوہیکل پہاڑ چمک اٹھے تھے۔

پریشے نے ارد گرد دیکھا۔ سامنے ہی خالی قطعے پر پاکستان آرمی کا سبز ہیلی کاپٹر لینڈ کر رہا تھا۔ اس کے گھومتے پروں کی تیز ہوا سے اطراف کے تمام خیموں کے گور ٹیکس پھڑ پھڑا رہے تھے۔

دور نصب نیلے خیمے کے سامنے کھڑے افق ارسلان نے شناسا انداز میں ہیلی کاپٹر کی جانب ہاتھ ہلایا۔ وہ سیاہ فلیس جیکٹ اور ٹراؤزر میں ملبوس، گرے اونی ٹوپی سے سر ڈھکے مسکراتے ہوئے پائلٹ کو دیکھ رہا تھا۔

ہیلی کاپٹر کے پر سست ہو چکے تھے۔ کھلے دروازے سے پستہ قد پھیکے نقوش کے حامل سیاح اتر رہے تھے۔ ہیلی کاپٹر کے پائلٹ کا چہرہ اسے دور سے ٹھیک طرح دکھائی نہیں دیا تھا، نہ اسے دیکھنے کا شوق تھا۔ وہ اپنے کھلے بال انگلیوں سے سنوارتی، آنکھیں ملتی ان سے دور ہٹتی گئی۔ اس کا ذہن حنادے اور اپنے خواب کے درمیان پھنسا تھا۔

یہاں نرم گدلی برف کے درمیان ایک برفانی نالہ بہ رہا تھا۔ سورج کے چمکنے کے باعث نالے کا آدھا پانی پگھل چکا تھا اور اس میں برف کے بڑے بڑے ٹکڑے تیر رہے تھے۔ نالے کے اس طرف حسیب کا دوست بیٹھا تھا۔

''یہ ہیلی پر کون آیا ہے، پری آپا؟''

وہ اپنے خیالات سے چونکی، پھر ناگوار شکنیں ماتھے پر ابھریں۔ ''جسٹ ڈونٹ کال
پہلے آپا اور بہن جیسے رشتوں کا احترام سیکھو اور پھر یہ لفظ کہو۔'' اپنے نئے ٹراؤزر اور جیکٹ
کرتے ہوئے وہ وہیں گدلی برف پر بیٹھ گئی۔

''آپ مجھ سے ہر وقت خفا کیوں رہتی ہیں؟''

''مجھے زہر لگتے ہیں تمہارے جیسے لاابالی قسم کے نوجوان، جو لڑکیوں کو دیکھ کر سیٹی
ہوں......'' وہ رخ پھیر کر پہاڑوں پر بنی قدرتی چراہ گاہوں کو دیکھنے لگی جہاں جانور چ
رہے تھے۔ البرتو کے ٹیم ممبرز اور اس کے پورٹرز سامان کندھوں پر اٹھائے، چیونٹیوں کی طرح
قطار میں چلتے ہوئے بیس کیمپ سے واپس نیچے جا رہے تھے۔

''یہ عمر ایسی ہوتی ہے۔ سب اس عمر میں ایسے ہی ہوتے ہیں۔''

''سب نہیں ہوتے۔ محمد بن قاسم نے اس عمر میں سندھ فتح کیا تھا۔''

''وہ تو میں نے بھی کر لینا تھا اگر یہ تلواروں کا دور ہوتا!'' وہ لاپروائی سے ہنسا۔

''شٹ اپ!'' اس نے اسے جھاڑ دیا، ''اور آئندہ مجھے آپا مت کہنا۔''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ اسے ناشتہ کرنا تھا، بال باندھ کر کان بھی ڈھکنے تھے کیوں کہ ہلکی
برفیلی ہوا اس کے کانوں میں گھس رہی تھی۔ وہ جانے کے لیے مڑی، تب اسے خیال آیا۔

''سنو، تمہارا نام کیا ہے؟'' وہ پھر بھول گئی تھی۔

نالے کے اس پار برف پر بیٹھا لڑکا مسکرایا، ''مصعب عمر۔''

''فائن۔'' وہ سر جھٹک کر بیس کیمپ کی جانب بڑھ گئی۔

بیس کیمپ جاگ رہا تھا۔ ناشتے کی خوشبو، چہل پہل، پورٹرز کی واپسی، پستہ قد
کی آمد۔ وہ کچن ٹینٹ کی طرف جاتے جاتے رک کر افق کو دیکھنے لگی جو ہیلی کاپٹر کے درو
کے قریب کھڑا ہنس ہنس کر اندر بیٹھے پائلٹ سے بات کر رہا تھا۔ کچھ سوچ کر وہ ان
چلی آئی۔

''ایکسکیوزمی آفیسر! یہ کون لوگ ہیں؟'' افق کو یکسر نظرانداز کر کے اس نے پائلٹ
سوال کیا۔

''یہ کچھ امیر و کبیر جاپانی سیاح ہیں، جو راکاپوشی کے N W Supr (شمال مغربی
فوٹوگرافی کرنے کے لیے دو دن پیدل چل کر بیس کیمپ آنے کے بجائے پاکستان آرمی کا ہی

...ڈر کتے ہیں۔'' مسکراتے ہوئے افق نے جواب دیا۔

''کیا واقعی توماز ہومر کو نانگا پربت سے آپ لوگ نکال لیں گے؟'' دوبارہ پائلٹ کو مخاطب
یہ اس نے یوں ظاہر کیا جیسے اس کی بات سنی ہی نہیں۔

ان دنوں توماز ہومر نانگا پربت پر پھنسا ہوا تھا۔

''میم! اس میں بے یقینی کی کوئی بات نہیں ہے۔ پاکستان آرمی کے پہاڑوں پر سرچ اینڈ
ریسکیو آپریشنز دنیا بھر میں مشہور ہیں۔ توماز کو ہم ان شاء اللہ جلد ہی نکال لیں گے۔'' پروفیشنل مگر
شائستہ لب و لہجے میں آفیسر نے جواب دیا۔ اس کا چہرہ سیاہ گلاسز اور کیپ کے باعث واضح نہ تھا۔

''پری! یہ میرا دوست ہے۔ میجر عاصم اور عاصم، یہ میری ساتھی کلائمبر ہیں، ڈاکٹر پریشے
ہالہ زیب۔''

''نائس ٹو میٹ یو ڈاکٹر! آپ کو کل بیس کیمپ کے راستے میں دیکھا تھا۔''

''جی، مگر بیس کیمپ تو ہنزہ سے دو دن دور ہے۔ آپ اتنی جلدی واپس جا کر ادھر کیسے پہنچ
گئے؟ اور میجر اطہر کہہ رہے تھے آپ ترک ٹیم کے لیزان آفیسر ہیں۔ حالاں کہ لیزان آفیسر کا
کام تو پچھلے سال نومبر میں ختم ہو گیا تھا، سوائے بلتورو کے۔''

''میں ہیلی سے پہنچ گیا تھا اور ارسلان کا لیزان آفیسر دو سال پہلے بلتورو میں تھا۔ اب
جاپانیوں کو لانا تھا، ساتھ ارسلان کی کچھ چیزیں بھی بغیر فیس لیے لے آیا ہوں۔'' وہ ہنسا۔

''اچھا!'' وہ افق کو بغیر لفٹ کرائے وہاں سے ہٹ گئی۔

☆......☆......☆

ناشتے کے بعد وہ اس کے پاس آیا۔ وہ اپنے خیمے کے باہر پتھروں پر بیٹھی تھی۔

''تم نے آج اور کل ٹھیک سے ریسٹ کیا؟'' وہ اپنائیت اور فکرمندی سے کہتا اس کے ساتھ
پتھروں پر بیٹھ گیا یوں کہ دونوں کے سامنے راکاپوشی کا پہاڑی سلسلہ تھا۔

''ہوں۔'' اس نے نظر بھی اس کی جانب نہ اٹھائی۔

''آج ہم 4800 میٹر تک جائیں گے۔ راکا کا موسم بہتر ہو رہا ہے۔ ہمیں آج
Acclimatization شروع کر دینی چاہیے۔''

''بہتر۔''

''تم اتنی فکرمند تھیں کہ تمہیں اجازت نہیں ملے گی اور دیکھو، ذرا لگن سے تم نے ریکوئسٹ کی

اور تمہارے پاپا نے فوراً تمہیں......"

"میں چیلنج کرلوں۔" وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ وہ بولتے بولتے رک گیا، پھر سرہلا[یا]

"ٹھیک ہے، میں تمہارا انتظار کررہا ہوں۔"

(ہونہہ۔انتظار تو میں نے کیا تھا)۔وہ اسے نظرانداز کیے اپنے نارنجی خیمے میں چلی [گئی]

گھنٹے بعد وہ فرید اور افق کے ہمراہ ہاتھ میں آئس ایکس اور کمر پر بیس کلو وزنی "بو[جھ]"

راکاپوشی کے قدموں پر چڑھنے لگی۔ اسے Acclimatization کی شدید ضرورت [تھی]

اپنے جسم اور پھیپھڑوں کو کم آکسیجن اور سطح سمندر سے زیادہ بلندی کا عادی بنانا تھا، مگر ابھی [اس] کا ذہن نئی حقیقتوں کو قبول نہیں کر پا رہا تھا۔

وہ سارا راستہ خاموش رہی۔ افق بولتا اور اس کو ڈھلان پر راستہ سمجھاتا رہا۔

راکاپوشی سر کرنے کے تین روٹ تھے، جنوب مشرقی فیس، جو "جوگلت گوہ" کے گلیشیئر [...] کر جاتا تھا، طویل مگر آسان ترین تھا۔ دوسرا مغربی فیس (پسان گلیشیئر) اور پھر تھا "نارتھ [ویسٹ]" رج (N W Ridge) دنیا کا طویل ترین رج جو آج تک کوئی سر نہیں کرسکا تھا۔ افق [کی] ٹیم یہی کرنے ادھر آئی تھی۔

دوپہر تک کیمپ ون میں پہنچ کر افق اور فرید نے تمام سامان خیموں میں بھرنا شر[وع کیا]

اس نے ایک نظر اس پر ڈالی جو پوری مستعدی سے سامان نکال رہا تھا۔ اس کے سر پر گہ[ری] اونی ٹوپی پر سفید بنائی سے "Rakaposhi 2005" لکھا تھا۔

وہ رخ پھیر کر اطراف کا جائزہ لینے لگی۔

وسیع برفیلا میدان، تین شوخ رنگوں کے خیمے اردگرد کہیں کہیں سے گدلی برف، [...] فلموں کے برعکس صاف ستھری نہیں تھی۔ بیس کیمپ سے کیمپ ون تک برف کم تھی، کیمپ [...] اوپر راکاپوشی کی بلندیاں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں۔

پریشے نے گلیشیئر گلاسز آنکھوں پر چڑھائے اور گردن پوری طرح اٹھا کر چوٹی کو دیکھا۔ پہاڑ کی "گردن" سے اوپر برف سے ڈھکی چوٹی کے گرد بادلوں کا ہالہ تھا، ا[س کی چوٹی] دھند اور بادلوں میں گم تھی۔ اوپر آسمان نیلا اور صاف تھا، مگر چوٹی دھند میں لپٹی تھی اور یہ [اس] کی سب سے بڑی خوب صورتی تھی۔ اسی باعث اسے دنیا بھر کے پہاڑوں میں خوب صور[ت ترین] پہاڑ کہا جاتا تھا۔ چوٹی سے نیچے پہاڑ کئی ہزار میٹر تک ایک خاص زاویے سے نیچے آتا [تھا جیسے کسی] نے سانچے میں ڈھال کر مہارت سے بنایا ہو۔ دنیا کا کوئی پہاڑ ایسی انوکھی اور منفرد ساخت نہیں رکھتا۔ یہ خصوصیت صرف دومانی کو حاصل ہے۔

راکاپوشی کا مطلب ہنزو کشز زبان میں "چمکتی دیوار" ہے اور دُومانی، "دُھند کی ماں" کو کہتے ہیں۔

وہ واقعی دُھند کی ماں تھی۔

واپسی کا سفر، کمر پر خالی رک سیک کے باعث آسان تھا۔ وہ افق کے آگے آگے اتر رہی تھی۔ اس کا جوتا کاٹ رہا تھا، جس کے باعث اسے چلنے میں دقت کا سامنا تھا۔

"جس طرح پیپر کبھی نئے پین سے حل نہیں کرتے، اسی طرح کوہ پیمائی یا کوہ نوردی (ٹریکنگ) کا آغاز نئے جوتے سے کبھی نہیں کرتے۔" اس کی ذہنی رو سے بےخبر وہ اس کے عقب میں کہہ رہا تھا، "تم نے غالباً نئے ٹریکنگ بوٹس لیے ہیں اور......"

"مجھے پتا ہے۔" اس نے اتنی درشتی سے اس کی بات کاٹی کہ وہ خاموش ہوگیا۔ پریشے نے اپنی رفتار تیز کردی۔ افق نے اس کے رویے کو ماحول کی تبدیلی پر محمول کیا۔

سورج ڈوب چکا تھا۔ بیس کیمپ کے رنگ برنگے خیموں میں واضح کمی آچکی تھی۔ اطالوی جاتے جاتے اپنا کچرا بھی سمیٹ کر نہیں گئے تھے۔ خالی بوتلیں، کین، بےکار سامان ان کے خیموں کی جگہ بکھرا پڑا تھا۔ سرمئی اندھیرا پہاڑ کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا۔ خیموں کے اندر روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ وہ تیز قدموں سے کچن ٹینٹ میں آئی۔

شفالی چپاتیاں پکا رہا تھا۔ نشاء اور ارسہ قریب ہی پلاسٹک چیئرز پر بیٹھی تھیں۔

"ارسہ باجی! آپ اپنی کتاب میں یہ ضرور لکھنا کہ یہ گورا لوگ دال چاول اور چپاتی کو مکس کرکے کیسے مزے سے کھاتا ہے۔ پھر کہہ رہا ہوتا ہے "نو کارب، نو فیٹ، چپاتی از دی بیسٹ!""

شفالی، ارسہ کو مشورہ دیتے ہوئے البرتو کے کسی اطالوی ٹیم ممبر کی نقل اتار رہا تھا۔ پریشے ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی اور ایک سپورٹس ڈرنک اٹھا کر منہ سے لگالی۔

"ارسہ! تم اتنا رومینٹک ناول اس پہاڑ کے بارے میں کیسے لکھ سکتی ہو؟ اس بلندی پر تمہاری کرداروں کی قلفی جمی ہوگی، ناکہ وہ رومانس جھاڑ رہے ہوں گے۔"

نشاء ہنستے ہوئے کہہ رہی تھی، دفعتاً پریشے کو خاموش دیکھ کر سنجیدہ ہوئی۔

"تمہیں کیا ہوا ہے؟"

"کچھ نہیں۔" وہ ڈرنک کے گھونٹ لیتی رہی۔

"میں جا رہی ہوں ادھر سے۔ ایک تو لوگ بھی ناں، جدھر رائٹر دیکھتے ہیں، شروع کر دیتے ہیں۔" ارسہ کافی دیر سے تنگ آئی بیٹھی تھی، بالآخر اٹھ کر چلی گئی۔ شفا باہر گیا تو نشاء نے کہا،

"تم نے خواہ مخواہ اتنا ہوا بنا رکھا تھا کہ انکل اجازت نہیں دیں گے، بالکل نہیں دیں گے، مگر انہوں نے اتنی جلدی اجازت دے دی، مجھے تو یقین نہیں آیا تھا۔"

"یقین؟ یقین تو مجھے بھی نہیں آیا تھا۔" اس کی نگاہوں کے سامنے حنا دے کی تصویر

"پری! اگر ممی اور پاپا، انکل سے بات کریں تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ میں ممی کو سب؟ آخر ماؤں سے کیا پردہ ہوتا ہے۔"

پریشے چونکی، "کیا بتا دوں؟"

"جو تمہارے اور افق کے درمیان ہے۔"

"ہمارے درمیان کیا ہے؟" اس نے الٹا سوال کیا۔

نشاء نے بغور اسے دیکھا، "پری کیا ہوا ہے؟"

"نہیں۔ تم بتاؤ۔ ہمارے درمیان کیا ہے؟" اس نے خالی بوتل میز پر رکھ دی۔

"تمہارے درمیان......تم دونوں......" نشاء الجھی۔ وہ زور سے ہنس دی۔

"ہمارے درمیان کچھ بھی نہیں ہے۔ تم پاگل ہو نشی۔" وہ اٹھی اور خیمے سے باہر نکل آئی۔

نشاء اس کی بہت اچھی دوست تھی مگر ہر بات بتانے کی نہیں ہوتی۔ وہ نشاء کو نہیں بتا وہ شادی شدہ تھا۔ اگر بتا دیتی تو نشاء اس کا چہرہ پڑھ کر جان جاتی کہ اس کے دل میں کیا کی نسوانی غرور اور انا مجروح ہوتی، سو اس نے نشاء کو کچھ نہیں بتایا۔

وہ سر جھکائے اپنے خیمے کی طرف بڑھنے لگی۔ راستے میں اسے وہ برفانی نالہ نظر آیا کنارے وہ صبح مصعب کے ساتھ بیٹھی تھی۔ صبح اس میں پانی تیر رہا تھا، مگر رات کو درجہ گرنے کے باعث اب وہ مکمل برف ہو چکا تھا۔ وہ ہر چند گھنٹوں بعد روپ بدل لیتا تھا۔

"بالکل افق کی طرح۔ ہونہہ۔" اس نے سر جھٹکا اور اپنے قدم خیمے کی طرف تیز کر دیے

☆......☆......☆

بدھ، 10 اگست 2005ء

بیس کیمپ میں آج پورٹرز نے بہت اچھا ناشتا دیا تھا۔ دلیہ، انڈے، چپاتی، جوس اور پنیر، جس کے باعث اگلی صبح جب وہ کیمپ ون تک فرید اور افق کے ساتھ چڑھ رہی تھی، تو اس کی طبیعت بوجھل سی تھی۔ افق اس سے آگے تھا اور مسلسل اس سے بات کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ کبھی اس کے جوتوں کے متعلق پوچھتا تو کبھی کھانسی کے بارے میں، کیوں کہ وہ مسلسل کھانس رہی تھی۔

"تم احمت کو دکھا لیتیں تو اچھا تھا۔" اس نے بیس کیمپ مینیجر اور ڈاکٹر احمت دوران کا نام لیا۔

وہ جواب دیئے بنا سر جھکائے اپنے "سکی پولز" کی مدد سے برف پر چلتی رہی۔

افق کی Acclimatization مکمل تھی مگر محض پریشے کے لیے کہ وہ گر نہ جائے، اس کی طبیعت نہ خراب ہو جائے، اسے کوئی مسئلہ نہ ہو، وہ روز اتنا بوجھ لے کر اس کے ساتھ چڑھتا تھا۔ اس کا ارادہ آج تمام سامان کیمپ ون پہنچا کر، پوری شام ریسٹ کرنے کے بعد اگلی صبح بالکل تازہ دم ہو کر بیس کیمپ کو الوداع کہہ کر چڑھائی شروع کرنے کا تھا۔

سورج ابھی چمک ہی رہا تھا جب انہوں نے واپسی کا سفر شروع کیا۔ وہ آگے پیچھے ڈھلان سے نیچے اتر رہے تھے۔ گرمی اتنی شدید تھی کہ پریشے نے دستانے اتار کر ہاتھ میں پکڑ لیے تھے۔ تقریباً سات ہزار میٹر تک سورج جب چمکتا تھا تو گرمی شدید ہو جاتی تھی اور رات کو درجہ حرارت ایسا گرتا کہ بوتلوں میں موجود پانی بھی برف ہو جاتا۔

اونچائی کم ہو رہی تھی، مگر اس کی کھانسی شدید ہوتی جا رہی تھی۔ چکر آ رہے تھے، سر میں درد تھا، nausea بھی ہو رہا تھا، ایک جگہ کھڑے ہونے کی کوشش میں وہ پھسلنے لگی تو افق نے پیچھے سے اس کا بازو تھام کر اسے سہارا دیتے ہوئے قریب پتھر پر بٹھایا۔

"تمہیں altitude sickness ہو رہی ہے۔"

"نہیں۔ میں ٹھیک ہوں۔" گھومتے سر کو اس نے دونوں ہاتھوں میں تھام لیا۔

"سر میں بہت درد ہو رہا ہے کیا؟" اس کو اپنی کنپٹی سہلاتے دیکھ کر وہ فکرمندی سے کہتا اس کے بالکل سامنے آ گیا۔ سورج اب افق کی پشت پر تھا، اس کی نارنجی شعاعیں اس کے اطراف سے نکل کر پریشے تک پہنچ رہی تھیں۔

"میں Diamox لے لوں گی۔" وہ اس کی فکر کر رہا تھا، وہ چڑ سی گئی۔ اسے اس کے حال پر کیوں نہیں چھوڑ دیتا؟

"Diamox سے کام نہیں چلے گا۔ اگر یہ ایلٹی ٹیوڈ سک نیس ہے تو یہ سیریبرل ایڈیما یا پلمنری

ایڈیما میں تبدیل ہو سکتی ہے اور......''

''اُفوہ افق......! کیا مسئلہ ہے؟ میں ڈاکٹر ہوں، مجھے پتا ہے۔ تمہیں میری فکر
ضرورت نہیں ہے۔'' وہ اتنے غصے سے بولی کہ افق نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔

''پری! کیا ہوا ہے؟ میں کل سے نوٹ کر رہا ہوں۔ تم کچھ اپ سیٹ ہو۔''

''مجھے جو بھی ہو، یہ تمہارا دردِ سر نہیں ہے۔ تم میری فکر مت کرو، سمجھے تم۔'' وہ کھڑی ہو
درد بڑھتا جا رہا تھا۔

''کیوں نہ کروں تمہاری فکر؟ تم میری......''

''میں کچھ نہیں ہوں تمہاری۔'' وہ ایک دم حلق پھاڑ کر چلائی، ''تمہاری صرف حنادے
اس کی فکر کرو۔''

افق کے ماتھے پر ناگواری شکن در آئی۔ ''حنادے کا یہاں کیا ذکر؟ تمہیں اس سے
ہے؟'' اس کا لہجہ سخت ہو گیا تھا۔

''ہونہہ! مجھے تمہاری بیوی کے ساتھ کیا مسئلہ ہو گا؟''

''شٹ اپ......اس کا نام مت لو بیچ میں۔''

پریشے نے پہلی دفعہ اسے غصے میں دیکھا تھا اور اسے غصہ آیا بھی کس بات پر تھا کہ
بیوی کا نام تحقیر سے نہ لے۔ وہ اس سے اتنی محبت کرتا تھا کہ صرف نام لینے پر......؟

پریشے کے حلق میں آنسوؤں کا گولہ پھنسنے لگا۔ وہ جھٹکے سے مڑی اور تیزی سے ڈھلا
نیچے اترنے لگی۔

''پری! رکو۔'' وہ اس کے پیچھے لپکا۔ وہ جتنا تیز دوڑ سکتی تھی دوڑی۔ بیس کیمپ اب نظر
تھا۔ برفانی نالہ پگھل چکا تھا۔ اس میں پانی تیر رہا تھا اور برف کے بڑے بڑے ٹکڑے......

وہ بہت تیزی سے خیموں کی طرف آئی تھی۔ اس کا دماغ ایک نہج پر پہنچ چکا تھا۔ اسے ہر
صورت وہاں نہیں رہنا تھا۔ اسے واپس گھر جانا تھا۔ بس اب بہت ہو چکا تھا۔ اب وہ کسی
میں نہیں آ سکتی تھی۔ وہ راکاپوشی تسخیر کرنے نہیں آئی تھی، وہ تو خود تسخیر ہو کر آئی تھی، مگر اب

اپنے خیمے میں آ کر اس نے اپنا مختصر سامان اٹھایا اور رک سیک میں بھرنے لگی۔ اس
وہ کریم آباد سے کوئی پورٹر اور شفالی کو ساتھ لے لے گی۔ حسیب لوگ ابھی صبح ہی نکلے تھے
دور نہیں گئے ہوں گے۔ وہ ان کو جا لے گی۔

''پری! تمہیں کیا ہوا ہے؟'' وہ بھاگتا، ہانپتا اس کے خیمے میں داخل ہوا۔ پریشے نے جواب نہیں دیا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے اپنی چیزیں اکٹھی کر رہی تھی۔

وہ اس کو بیگ تیار کرتے دیکھ کر ٹھٹکا، ''تم کہاں جا رہی ہو؟''

''گھر۔'' وہ اپنی شیل جیکٹ، ڈاؤن جیکٹ اور دوسری واٹر پروف بیگ میں بھر رہی تھی۔

''مگر کیوں؟''

''مجھے تمہارے ساتھ کلائمب نہیں کرنی۔'' اس نے دوسرے بیگ میں جرابیں، دستانے اور اسکارف ڈالے۔

''یہ اچانک تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ تم ادھر کلائمب کرنے آئی تھیں اور بہت خوشی سے آئی تھیں۔''

''وہ میری غلطی تھی، حماقت تھی۔'' اس نے لوشن اور آخر میں کریم ڈال کر زپ چڑھائی۔

''مگر ہوا کیا ہے؟'' وہ حیران تھا اور جھلا بھی گیا تھا۔

بیگ ایک طرف رکھ کر وہ ایک جھٹکے سے اس کی جانب مڑی۔

''ہوا کیا ہے؟ مجھ سے پوچھتے ہو کہ ہوا کیا ہے؟ تم......تم دھوکے باز ہو......تم نے دھوکا دیا ہے مجھے۔ بہت ہرٹ کیا ہے تم نے مجھے افق! بہت زیادہ۔''

اس نے اسے پرے دھکیلا۔ وہ حیران سا دو قدم پیچھے ہٹا، ''کیا دھوکا دیا ہے میں نے؟''

''تم شادی شدہ ہو اور تم نے......تم نے مجھے کبھی یہ نہیں بتایا۔ تمہاری ایک بیوی بھی ہے اور تم نے مجھے اندھیرے میں رکھا۔'' وہ چلائی تھی۔

''تم نے بھی تو مجھے نہیں بتایا تھا کہ تم انگیجڈ ہو۔'' وہ ایک لمحے کو چپ ہوئی۔

''ہاں نہیں بتایا تھا، کیوں کہ منگنی اور شادی میں فرق ہوتا ہے۔''

''کوئی فرق نہیں ہوتا۔ ساری بات کمٹمنٹ کی ہوتی ہے۔''

''کوئی فرق نہیں ہوتا افق؟ کوئی فرق نہیں ہوتا؟ تم......تم اس فضول عورت کے ساتھ......''

''اس کا نام مت لو۔'' وہ پھر غصے میں آ گیا۔

پریشے نے بہت بے بسی سے اسے دیکھا۔ سامنے کھڑا وہ شان دار سا مرد اس کا تھا، نہ ہو سکتا تھا اور جس کا تھا، اس کا نام بھی احترام سے لینے کو کہتا تھا۔

''اتنی محبت ہے تمہیں اس سے افق؟'' اس کا گلا رندھ گیا۔ ''اتنی محبت ہے اس سے تو پھر مجھے

کیوں بلایا تھا ادھر؟ ہاں...... بولو...... جواب دو۔'' اس کی بھیگی آواز بلند ہونے لگی۔ ''تم ا
اور صرف اس کے ہی ہو۔ باوجود اس کے تم نے مجھے بلایا اتنی دور، صرف اپنی انا کی تسکین
کیا چاہتے تھے تم؟ ایک لڑکی دو دن پیدل چل کر تم سے ملنے، محض تمہارے ایک فقرے کا
آئے اور تم اس کا استقبال یہ کہہ کر کرو کہ ''اسے دیکھو، یہ میری بیوی ہے۔'' تمہیں ایک
نہیں لگا کہ تم کسی کا دل توڑ رہے ہو۔ کسی کی روح چھلنی کر رہے ہو؟ پھر کہتے ہو، میں اسے
کہوں؟ کیوں نہ کہوں، وہ گھٹیا ہے اور تم بھی گھٹیا ہو۔'' وہ رونے لگی تھی۔ وہ بری طرح ہار
پیار کی پہلی بساط پر ہی اسے شہ مات دے دی گئی تھی۔ ''چلے جاؤ تم ادھر سے۔ مجھے تمہاری ہر
سے بھی نفرت ہے۔ چلے جاؤ۔ خدا کے لیے مجھے اکیلا چھوڑ دو۔''

وہ بالکل خاموشی سے کھڑا اس کی ہر بات، نفرت کا ہر اظہار سن رہا تھا۔ وہ خاموش ہو
اس کے قریب آیا، اتنا قریب کہ اس کے عقب میں پریشے کو کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس کے
سامنے آ کر افق نے اس کے دونوں شانوں کو پکڑ کر زور سے جھٹکا دیا۔

''تمہیں مجھ سے نفرت ہے؟ میری صورت سے بھی نفرت ہے؟ یہ نفرت اس وقت
جب سے تمہیں حنادے کا علم ہوا ہے، ہاں؟ تو پھر میری بات غور سے سنو۔ مزید کچھ کہنے
یہ بات سنو۔ تم حنادے کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔ دو سال پہلے کے ٹو پر برفشار
حنادے اس میں دب کر مر گئی تھی۔ اس کا نام اس طرح مت لو۔ وہ میری بیوی تھی۔''

اس نے پریشے کے کندھوں کو ایک جھٹکا دے کر چھوڑ دیا۔ پھر ایک آخری نظر اس پر ڈا
تیزی سے پلٹا اور خیمے کا گورٹیکس اٹھایا۔ باہر سے راکاپوشی کے سرمئی قدموں کی جھلک
ساتھ میں سرد ہوا کے تھپیڑے بھی اندر آئے۔ وہ باہر نکلا، خیمے کا پردہ گرا دیا۔ راکاپوشی چھپ
ہوا کا راستہ رک گیا اور وہ...... وہ...... جہاں تھی، ابھی تک وہیں منجمد سی کھڑی تھی۔

☆......☆......☆

بیس کیمپ پر رات اتر آئی تھی۔ اندھیرے میں دومانی کی سفید چوٹی کسی ہیرے کی طرح
جگر جگر چمک رہی تھی۔ پہاڑ کے قدموں میں، خیموں سے ایک طرف ہٹ کر، خالی جگہ پر آگ
جلا تھا۔ اس الاؤ کے گرد افق کی سپورٹ ٹیم کے افراد، مقامی پورٹرز اور کریم آباد کے با
لگائے بیٹھے تھے۔ بیس کیمپ کی پر رونق فضا میں لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز کے ساتھ بلند بانگ
بھی گونج رہے تھے۔ کریم آباد کے لوگوں نے افق سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ راکاپوشی سر کر

اس کے اعزاز میں پورا گاؤں دعوت دے گا۔

کبھی اس محفل سے ہنزہ کے روایتی نغموں کی صدا گونجنے لگتی تو کبھی ترک اپنے گیت سنانے
لگتے۔ ان عروج پر پہنچی رونقوں میں دو افراد کی کمی تھی۔ ایک ارسہ جو اپنے خیمے میں بیٹھی اپنا ناول
پڑھنے میں محو تھی اور دوسری پریشے، جو ان سب سے دور اس برفانی نالے کے اس پار سوگوار سی بیٹھی
تھی۔ وہ کہنی گھٹنے پر رکھے اور مٹھی ٹھوڑی تلے جمائے سامنے خیموں کو دیکھ رہی تھی۔ خیموں کے اس
پار بون فائر کا منظر آدھا نظر آ رہا تھا، آدھا خیموں کے باعث چھپ گیا تھا۔

تب دفعتاً اس نے افق کو محفل میں سے اٹھتے دیکھا۔ وہ خیموں کے درمیان میں سے جگہ بناتا،
اپنی گرے فلیس جیکٹ کی زپ بند کرتا اسکی جانب آ رہا تھا۔ پریشے نے سر جھکا دیا۔ اسے اس وقت
افق سے بے انتہا شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔

''تم کیا ادھر بور لوگوں کی طرح بیٹھی ہو؟ آؤ وہاں چلو سب ادھر اتنا انجوائے کر رہے ہیں۔
صرف تمہارے لیے اتنا شغل چھوڑ کر آیا ہوں۔'' وہ اتنے فریش انداز میں مخاطب تھا جیسے صبح کچھ ہوا
ہی نہ ہو۔

پریشے نے اپنی لانبی پلکیں اٹھا کر ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہ اس کے سامنے ایک
پتھر پر کہنی جمائے آرام سے بیٹھ چکا تھا اور اب اسے ہی دیکھ رہا تھا۔

''تم نے ہم ترکوں کے گیت مس کر دیے۔ ابھی میں انہیں اتنا اچھا گانا سنا رہا تھا، وہ پورٹرز
کہنے لگے، صاب آپ نے غلط پروفیشن چوز کیا ہے۔ آپ کو تو......''

''افق!'' اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ اسے ڈانٹنے، یا اس پر خفا ہونے کے
بجائے یوں اتنا لاپروا اور ہشاش بشاش کیوں لگ رہا تھا؟

''میں...... میں بہت بری ہوں ناں افق؟''

''تمہیں واقعی آج پتا چلا ہے؟''

''افق پلیز! میں سیریس ہوں۔''

''میں بھی ڈیڈ سیریس ہوں، پیاری پری۔'' وہ مصنوعی سنجیدگی سے بولا۔

دور الاؤ کے قریب سے اٹھتا شور یہاں تک سنائی دے رہا تھا۔

''پلیز افق! مجھے بات تو کرنے دو۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''کم آن۔ مجھے پتا ہے تم نے کیا کہنا ہے۔ یہی کہ ''افق مجھے معاف کر دو۔ میں بہت شرمندہ

ہوں۔ مجھے نہیں پتا تھا وہ مر چکی ہے ورنہ میں وہ سب نہ کہتی۔'' یہی کہنا ہے ناں تمہیں؟ تو بر
ہے میں نے کہہ دیا تمہاری جگہ۔ اب اس قصے کو ختم کرو۔''

''افق! مجھے واقعی نہیں پتا تھا۔ میں اتنا کچھ کہتی رہی اور......'' وہ رو دینے کے قریب تھی
جھنجھلا گیا۔

''ایک تو تم پاکستانیوں میں یہ بڑی خرابی ہے۔ بات کو چباتے رہتے ہو۔ پلیز، باتوں
لیا کرو، ہضم کرلیا کرو۔ جو ہوا بھول جاؤ پلیز!''

وہ اسی طرح بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

''ویسے مجھے اگر علم ہوتا کہ تم حنادے سے اتنی جیلس ہوگی تو اس کا ذکر بہت پہلے کر
ویسے......'' وہ شرارت سے تھوڑا سا جھکا۔ ''میں تمہیں اتنا اچھا لگتا ہوں کیا؟'' مسکراہٹ دبا
بمشکل خود پر سنجیدگی طاری کیے وہ مصنوعی معصومیت سے پوچھتا اتنا اچھا لگ رہا تھا۔

''ہاں، لگتے ہو نا!'' خفگی بھرے انداز میں کہہ کر وہ خیموں کو دیکھنے لگی۔ افق کی طرح ا
ناک بھی سرخ ہو رہی تھی اور منہ سے دھواں نکل رہا تھا۔

وہ کتنی ہی دیر اسے دیکھتا رہا، جیسے کوئی بڑا کسی بچے کی معصومانہ شرارت پر اسے پیار سے
ہے، مگر کہتا کچھ نہیں ہے۔

''پری! آج تک یہ ہوتا آیا ہے کہ کوہ پیما خوب جسمانی مشقیں جھیل کر خود کو ان خوب صو
پہاڑوں کے لیے تیار کرتے ہیں۔ آج رات یہ پہلی دفعہ ہوگا کہ میرے عقب میں موجود یہ پہا
کو ایک بہت خوب صورت کوہ پیما کے لیے تیار کرے گا۔''

پریشے نے نگاہوں کا زاویہ اس کی جانب واپس موڑا۔ قدرے اتراہٹ، قدرے معصو
سے وہ بولی، ''کون، میں؟''

''نہیں یار، اپنی بات کررہا ہوں۔'' وہ ہنستے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ پریشے نے ناراضی سے
دیکھا۔

''اچھا اٹھو۔ تمہارا چیک اپ کراتے ہیں احمت سے۔ سارا دن روتی رہی ہو۔ اب
تمہاری ایلٹی ٹیوڈ سک نیس عروج پر ہوگی۔''

کھڑے کھڑے افق نے اس کی جانب ہاتھ بڑھایا۔ وہ نالے کے دوسری طرف تھی
نے پہلے خفگی سے اسے دیکھا، مگر وہ اس سے زیادہ دیر خفا نہیں رہ سکتی تھی۔ اس نے افق کا ہاتھ

اور کھڑی ہوگئی۔ پھر اس کا ہاتھ تھامے، نالہ کراس کیا۔ دوسری جانب پہنچ کر افق نے اس کا ہاتھ چھوڑ
دیا۔ وہ دونوں ساتھ چلتے ہوئے خیموں کے قریب آئے۔

کریم آباد کے دیہاتی اب اٹھ کر جا رہے تھے۔ احمت ابھی تک بیٹھا کوئی گانا سنا رہا تھا۔
پریشے کو آتے دیکھ کر جھینپ کر خاموش ہوگیا۔

افق نے اس سے ترک زبان میں کچھ کہا۔ وہ سر ہلا کر اٹھ کھڑا ہوا اور ان کو اپنے ساتھ لیے
ایک خیمے میں آگیا۔

''تمہارا تعارف نہیں کرایا۔ یہ میرا دوست ہے ڈاکٹر احمت دوران۔ جیبک اور کینین جیسا
بہترین دوست، اس سے میری دوستی کا اس سے بڑا ثبوت کیا ہوگا کہ میں ہر ممکن طریقے سے اس
کے لیے مریض پکڑ لاتا ہوں۔''

احمت کے خیمے میں کرسی سنبھالتے ہوئے افق نے ہنس کر کہا۔ وہاں بڑی سی میز رکھی تھی۔
پریشے کے مقابل کرسی احمت کی تھی۔ افق اس کے دائیں جانب بیٹھ گیا۔

پریشے کے چیک اپ کے دوران احمت مسلسل ترک زبان میں افق کو کچھ بتاتا رہا۔

''یہ کہہ رہا ہے تم صبح تک بالکل ٹھیک ہوگی اور تمہاری کھانسی تو اب پہلے سے بہتر ہے۔''

پریشے مسکراہٹ چھپاتے ہوئے احمت کو دیکھتی رہی۔ وہ افق کا ہم عمر تھا، مگر بے حد دبلا پتلا
اور چہرہ نوعمر لڑکوں جیسا تھا۔ بال سنہری مائل بھورے تھے۔ پریشے کے دیکھنے پر اس نے شرما کر
ہونٹ ایسے بند کرلیے کہ جیسے کوئی بچہ غلط کام کرتا پکڑا جائے تو گھبرانے کے بجائے جھینپ کر مسکرا
دے۔ وہ اتنا معصوم لگ رہا تھا کہ پریشے کہے بغیر نہ رہ سکی۔

''تمہارا دوست بہت کیوٹ ہے۔''

افق نے ایک نظر پریشے کو دیکھا، دوسری نگاہ احمت پر ڈالی جو جھینپ کر ہنس دیا تھا اور پھر
دوبارہ پریشے کو دیکھا، ''میرے کیوٹ دوست کو بہت اچھی انگریزی بھی آتی ہے۔''

''اوہ......'' اب بوکھلانے کی باری پریشے کی تھی، ''میں سمجھی اسے انگریزی نہیں آتی اور اگر ایسا
نہیں ہے تو تم دونوں ترک میں کیوں بات کررہے تھے؟''

''اب ترک ہو کر ہم فرنچ میں تو بات کرنے سے رہے۔ ویسے یہ اندر سے اچھا خاصا ہے،
مادام۔ کسی زمانے میں احمت اومت (رائٹر) بننے کے خواب دیکھا کرتا تھا۔''

''اور تم نصوع محرو کی بننے کے۔'' کھٹ سے احمت کی جانب سے جواب آیا۔

"یہ صاحب کیا شاعر ہیں؟"

"اتنا بڑا ترک کلائمبر ہے، تمہیں نہیں علم؟ خیر جتنا بھی بڑا ہو جائے، افق ارسلان جیسا نہیں ہو سکتا۔" وہ مصنوعی تفاخر سے بولا۔ مگر پریشے نے سر کو اثبات میں جنبش دی۔

(صحیح کہتے ہو۔ کوئی بندہ افق ارسلان نہیں ہو سکتا۔)

"اس کے علاوہ احمت انتہائی ذلیل قسم کا کمپیوٹر جینئس اور ہیکر بھی ہے۔" اس نے

"ذلیل" اسی طرح شرما کر مسکرا دیا۔

"کمپیوٹر سے یاد آیا احمت، میں تمہارا کمیونیکیشن ٹینٹ استعمال کرلوں؟ مجھے پاپا کو ای میل کرنی تھی۔" پری کو اچانک یاد آیا۔

"کرلو اور اس سے ایسے پوچھ رہی ہو جیسے اس کا پیسہ لگا ہو۔ مادام! یہ میرے باپ حسن حسین ارسلان کی خون پسینے کی کمائی ہے، جسے ہم یوں ہمالیہ میں جھونک رہے ہیں۔ جینیک اکثر کہتا ہے اگر "اور ہن یقین" اور حسن حسین ارسلان کے آباؤ اجداد نے اتنی جائیداد نہ چھوڑی ہوتی تو ملک افق اور جینیک کی مہمان نوازی کرنے سے محروم رہ جاتے۔"

وہ دونوں باہر نکل آئے۔ پورٹرز ادھر ادھر پھرتے، اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ الائ... چند گز کے فاصلے پر البرتو کے کیمپ کی جگہ کل والا کچرا ابھی تک پڑا تھا۔

"تم اس نیلے ٹینٹ میں چلی جاؤ۔ وہ کمیونیکیشن ٹینٹ ہے۔ میں ذرا یہ صاف کر دوں۔" زمین پر بیٹھ کر بکھرا کچرا چننے لگا۔

"خود کیوں ہلکان ہوتے ہو؟ پورٹرز سے کہہ دو۔"

"کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ وہ بے چارے تھکے ہوئے ہوں گے۔ میں خود کرلوں گا۔" یہ سب خالی کین، بوتلیں اور یورپین، پروسیسڈ فوڈ کے خالی ڈبے سمیٹنے لگا۔

وہ کمیونیکیشن ٹینٹ میں چلی آئی۔ احمت نے اسے زبردست انداز میں ترتیب دے رکھا... سیٹلائٹ فون، لیپ ٹاپ کمپیوٹرز، جنریٹرز، بجلی کے سیلولر پینل، دوسرے کچھ آلات...... ستائشی نگاہ اس سب پر ڈال کر اس کرسی کے قریب آئی، جس پر ارسہ بیٹھی تھی۔

"تم کیا کر رہی ہو؟"

"فین میل چیک کر رہی ہوں۔ اب تو ایک ہی قسم کی ای میلز سے بور بلکہ زچ ہو... ہوں، پتا نہیں لوگ ہر بات میں "اتنی سی عمر میں ناول کیسے لکھ لیا؟" کیوں کہتے ہیں؟ خود...

اس عمر میں فیڈر پیتے اور روٹی کو چوچی کہتے تھے؟ میری عمر کے بارے میں ایسے رشک کرتے ہیں یہ نظر لگا دیں گے اور شاید میں لکھنا ہی بند کردوں۔" وہ سخت بھری بیٹھی تھی۔ "اور ہر میل میں مجھے کہتے ہیں، کیا آپ مجھ سے دوستی کریں گی؟ خدایا میں نے قلمی دوستی کا اشتہار تو نہیں دیا تھا جو مجھے ہر بندہ ہی کہتا ہے اور میرے پاکستانی مداحوں کی تو مت پوچھیں۔ چوں کہ میں عمر میں ان سے چھوٹی ہوں سو "تم" اور "یار" کہہ کر خود ہی فری ہونے لگتے ہیں۔ پتا نہیں لوگوں کو اپنے اردگرد فرینڈز نہیں ملتے جو......"

"اچھا ہٹو نا۔ مجھے کمپیوٹر چاہیے۔" اس نے پیار سے ارسہ کے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔

"بیٹھ جائیں اور کبھی لطیفے پڑھنے کا شوق ہو تو میری فین میل کھول کر پڑھنا۔" وہ کہہ کر باہر چلی گئی۔

پریشے نے میل کھولی۔ سیف کی تین ای میلز تھیں، جو اس نے پڑھے بغیر مٹا دیں۔ پاپا کی ایک ہی تھی۔ وہ کچھ دنوں کے لیے کام سے برسلز جا رہے تھے۔ کام کچھ لمبا تھا۔ شکر تھا کہ وہ مصروف تھے۔

"بیٹھ جاؤں مادام؟ اگر کچھ پرسنل نہیں ہے تو؟" افق اندر داخل ہوا۔

"ہوں، تم سے کیا پرسنل؟ اور ہوگئی جمعداری؟" وہ ای میل لکھ کر بھیج رہی تھی۔ افق نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔ وہ بہت خاموشی سے اس کے دائیں جانب کرسی پر بیٹھا سوچتی نگاہوں سے لیپ ٹاپ کی چمکتی اسکرین کو دیکھتا رہا۔

"سنو پری، تمہیں سائیکک لوگوں پر یقین ہے؟"

"تھوڑا بہت۔ کیوں؟"

براؤزر کلوز مت کرو۔ تمہیں کچھ دکھاتا ہوں۔ ایڈریس بار میں لکھو۔

"www.peteranswers.com"

پریشے نے ٹائپ کیا۔ فوراً ایک صفحہ کھل گیا۔ افق نے لیپ ٹاپ اپنی جانب کھسکا لیا۔

"یہ ایک سائیکک ہے پیٹر! تمہیں تمہارے ہر سوال، ہر پریشانی کا حل بتائے گا۔ کوئی سوال پوچھنا ہے تو پوچھو۔ ہاں ٹائپ میں کرتا ہوں، کیوں کہ میری اس سے تھوڑی جان پہچان ہے۔"

"اُفوہ! مجھے ان چیزوں کا کوئی یقین نہیں ہے۔ خیر تم پوچھو۔ میرا نام کیا ہے؟"

افق کی انگلیاں لیپ ٹاپ کے کی پیڈ پر متحرک تھیں۔ وہ بہت تیز ٹائپ کرتا تھا۔ وہاں دو

خانے سے تھے۔ پہلے میں اس نے لکھا۔
''پیٹر پلیز آنسر۔''
اور دوسرے میں لکھا، ''میرے ساتھ بیٹھی لڑکی کا نام کیا ہے؟''
''پریشے جہاں زیب۔'' سکرین پر سفید رنگ کے دو الفاظ ابھرے۔ افق نے فخر سے دیکھا، جو کچھ حیران، کچھ بے یقین سی تھی۔
''اچھا پوچھو، میری عمر کیا ہے؟''
افق نے ٹائپ کیا۔ ''پیٹر پلیز آنسر۔ پریشے کی عمر کیا ہے؟''
''پچیس سال۔'' اسکرین پر لکھا آیا۔
''اسے کیسے پتا؟'' وہ بے یقینی سے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔
''یہ سائیکک ہے اور دماغ پڑھ سکتا ہے۔''
پھر پریشے نے اپنے متعلق کئی سوالات کیے۔ تمام کے جوابات درست نکلے۔ اسے خوف محسوس ہونے لگا۔ پیٹر واقعی کوئی عامل تھا۔
''اچھا پوچھو کہ...... کہ کیا میں کسی کو پسند کرتی ہوں؟''
''اس کا جواب مجھ سے پوچھ لو۔ تم راکاپوشی کو پسند کرتی ہو۔'' وہ ہنستے ہوئے لکھنے لگا۔
''پیٹر پلیز آنسر۔ کیا پریشے کسی کو پسند کرتی ہے؟''
''تم بار بار پیٹر پلیز آنسر کیوں لکھتے ہو؟'' وہ بار بار کی تکرار سے جھنجھلائی۔
''اس دنیا میں کام نکلوانے کے لیے منت کرنا شرط ہے۔''
پیٹر کا جواب اسکرین پر جگمگا رہا تھا۔
''ہاں، اور اس کا نام "K" پر ختم ہوتا ہے۔''
اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی دوڑ گئی۔ اس نے گھبرا کر افق کو دیکھا۔
''K پر؟ لیکن راکاپوشی تو "K" پر نہیں ختم ہوتا۔'' وہ شاید سمجھا نہیں تھا، یا پھر بن رہا تھا۔
پریشے نے خشک لبوں پر زبان پھیری۔ ''کیا وہ مجھے ملے گا؟''
''ہاں۔ اگر وہ کوشش کرے تو!'' جواب آیا۔
وہ بے حد خوف زدہ نگاہوں سے اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔ ''اچھا اب...... اب پوچھو

مجھ سے محبت کرتا ہے؟''
افق نے فوراً پوچھ دیا۔ جواب بھی فوراً آیا۔
''محبت؟ وہ تو عشق کرتا ہے۔''
وہ سانس روکے سکرین کو دیکھ رہی تھی۔ یہ آدمی کون تھا اور کیسے اتنا کچھ جانتا تھا؟
''افق...... افق...... سوز......'' احمت خیمے کا دروازہ کھول کر تیزی سے اندر داخل ہوا اور افق سے ترکی میں کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ پریشے کو دیکھنے پر فوراً پیچھے ہٹا۔ اس کے چہرے پر معذرت خواہانہ تاثرات در آئے تھے۔
وہ پیٹر کے سحر میں ایسے بری طرح جکڑی ہوئی تھی کہ یہ مداخلت اسے بری طرح کھلی۔ افق نے بھی قدرے اکتا کر اسے دیکھا۔ پھر دونوں کچھ دیر ترک میں بات کرتے رہے۔ تب وہ اٹھا اور جیکٹ کی آستین اوپر چڑھاتے ہوئے بڑبڑاتے ہوئے خیمے سے باہر چلا گیا۔ ''ذرا ان پورٹرز کا جھگڑا نمٹا لوں...... پتا نہیں کیا مسئلہ ہے ان کو؟''
اس کے جانے کے بعد احمت نے پھر پریشے سے معذرت کی۔
''معاف کرنا ڈاکٹر، وہ پورٹرز میں جھگڑا ہو گیا تھا، افق اسے ہی نمٹانے گیا ہے۔ دراصل......''
دفعتاً اس کی نگاہ سکرین پر پڑی۔ وہ قدرے قریب آیا اور جس کرسی پر افق بیٹھا تھا، اس کی پشت کو پکڑ کر قدرے جھک کر بغور اسکرین کو دیکھا۔ ''اچھا۔ تم Peter Answer کھیل رہی ہو۔''
''کھیل رہی ہوں؟'' وہ بری طرح چونکی۔
''ہاں۔ اٹ از اے گریٹ گیم۔'' وہ سادہ انداز میں بولا۔
''گیم؟'' پریشے کے ذہن میں الارم سا بجا۔ ''احمت ادھر میرے پاس آ کر بیٹھو اور مجھے شروع سے بتاؤ کہ یہ کیسے کھیلتے ہیں۔''
''یہ تو بہت آسان ہے۔'' وہ کھڑے کھڑے بتانے لگا۔ ''یہ دیکھو اسکرین پر دو خانے بنے ہیں۔ پہلے خانے میں......''
''مجھے پتا ہے، اس میں ''پیٹر پلیز آنسر'' لکھنا ہے۔''
''نہیں، یہ ہی تو نہیں لکھنا۔ اس میں تم نے فل سٹاپ دبا کر اصل ''جواب'' لکھنا ہے۔ فل سٹاپ دبا کر تم جو بھی لکھو گی، اس جگہ اسکرین پر پیٹر پلیز آنسر ہی لکھا آئے گا۔ پھر دوسرے خانے میں تم سوال لکھو اور اینٹر کرو۔ اب جو تم نے اوپر والے باکس میں چھپا کر لکھا تھا، وہ پیٹر کے جواب

کے طور پر لکھا آئے گا۔''

''تو......تو پھر پیٹر کون ہے؟''

''وہی جو بیٹھا ٹائپ کررہا ہے۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ جواب، ٹائپ کرنے والا خود لکھتا ہے اور پیٹر کوئی نہیں ہے'' آہستہ سے بولی اب اسے سمجھ آرہا تھا۔

''ہاں۔ اس سے بڑے بڑے لوگ بے وقوف بن جاتے ہیں۔'' احمت کا انداز معصومیت بھری بے وقوفی سے لبریز تھا۔ ''ویسے تم کسے بنارہی تھیں؟''

''میں بن رہی تھی۔''

''اچھا'' اس نے شانے جھٹکے۔ ''افق اور جینیک کا یہ مشغلہ ہے۔ جب بھی میرے آتے ہیں، ڈاکٹرز اور نرسوں کو گھیر گھار کر بے وقوف بناتے رہتے ہیں۔ انہیں ٹائپ نہیں دیتے، اور کہتے ہیں ''ہماری پیٹر سے تھوڑی......''

''تھوڑی جان پہچان ہے۔'' پریشے نے فقرہ مکمل کیا۔

''ہاں۔ بڑے عرصے تک ڈاکٹرز بے وقوف بنتے رہے۔''

''پھر انہیں پتا کیسے چلا؟''

''میں نے بتادیا تھا۔ اب مجھے کیا پتا تھا کہ افق انہیں بے وقوف بنارہا ہے۔ وہ تو میں ڈاکٹر کو یہ ویب سائٹ کھولتے دیکھا تو سمجھا دیا کہ پیٹر آنسرز کو کیسے کھیلتے ہیں۔ میری آنے کوئی کام کی بات ہو تو سب کو بتادیا کرتے ہیں۔ میں نے اس ڈاکٹر کو بتایا، اس نے باقی دیا اور پھر......'' وہ جھینپ سا گیا۔ ''پھر افق اور جینیک نے سخت سردی میں مجھے پول میں اور مارا بھی بہت۔''

پریشے ہنس دی۔ ''چلو آج تمہارا بدلہ لیتے ہیں۔ تم بس افق کو مت بتانا کہ تم دیا ہے۔''

''نو پرابلم۔'' وہ شانے جھٹکتے ہوئے چلا گیا۔

افق تھوڑی دیر بعد آیا۔ اس کی ٹوپی اور جیکٹ پر برف کے ذرات پڑے تھے جھاڑتے ہوئے کرسی سنبھال کر بیٹھ گیا۔

''یہ پورٹرز بھی نا، خیر ہم کہاں تھے؟'' اس نے اسکرین کو دیکھا، ''ہوں تو وہ تم

''کون ہے وہ؟'' وہ بڑے لاپرواہ سے انداز میں بولا۔

''ابھی پتا چل جاتا ہے۔ تم اس سے اس کی ہائٹ اور آنکھوں کا رنگ پوچھو۔'' اب وہ افق کے چہرے کی حرکت کو دیکھ رہی تھی۔

''سکس ون ہائٹ اور ہنی کلرڈ آئز۔'' پیٹر کا جواب آیا۔

''ہیں میں سمجھ گئی یہ کس کی بات کررہا ہے۔ سکس ون ہائٹ ہنی کلر آئز، اور "K" پر نام ختم ہوتا ہے بالکل ٹھیک۔'' وہ خوشی سے بولی۔

''اچھا'' وہ ہولے سے مسکرایا، ''پھر کون ہے؟''

''سیف الملوک اور کون۔''

افق کے لبوں سے مسکراہٹ غائب ہوگئی۔ اس نے قدرے الجھ کر سکرین اور پھر پریشے کو دیکھا۔

''نہیں۔ سیف نہیں...... یہ تو......''

''سیف ہی ہے۔ مجھے پتا تھا وہ مجھ سے محبت کرتا ہے مگر اتنی زیادہ کرتا ہے، یہ نہیں علم تھا۔ اوہ میں کتنی لکی ہوں نا افق!''

''نہیں ناں۔'' وہ جھنجلایا، ''ضروری تو نہیں یہ سیف کی بات کررہا ہو۔ کسی اور کا نام بھی تو ''کے'' پر ختم ہوسکتا ہے۔''

''اور کسی کا نہیں ہوتا۔''

''ہوتا ہے۔'' اس نے جھلا کر کی بورڈ پر ہاتھ مارا۔

''کس کا؟''

''میرا! اور یہ سب میں لکھ رہا تھا، سمجھیں تم!'' وہ غصے سے بولا۔

''اچھا مجھے تو نہیں پتا تھا۔'' پریشے نے تھوڑی تلے مٹھی جما کر معصومیت سے اسے دیکھا۔ ''اگر مجھے پتا ہوتا کہ تم سیف کے نام سے اتنے جیلس ہوگے تو بہت پہلے اس کا نام لے دیتی۔ ویسے میں نہیں اتنی اچھی لگتی ہوں کیا؟''

اس کا انداز افق کو بتانے کے لیے کافی تھا کہ وہ تمام ڈرامہ جان گئی تھی، سو وہ ناراضی سے کھڑا ہوا اور کرسی کے پیچھے سے نکل کر خیمے کے دروازے کی جانب بڑھا، پھر پلٹ کر ایک خفگی بھری نگاہ اس پر ڈالی۔

''ہاں۔ لگتی ہوناں!'' کچھ نروٹھے پن، کچھ محبت سے اس نے جیسے بہت ناراضی سے

اعتراف کیا۔ وہ ہنس دی۔

”تم اس وقت اتنے کیوٹ لگ رہے ہو، مگر میں تعریف کر کے تمہارا دماغ
چاہتی۔“

وہ اسی طرح برا سا منہ بنا کر سر جھٹکتے ہوئے جانے لگا، پھر رک کر پوچھا۔ ”تمہیں
کے سیکرٹ کا پہلے سے پتا تھا؟“

”نہیں، یہ تو ابھی احمت نے......“ بے اختیار اس نے زبان دانتوں تلے دبالی۔

”واٹ؟ احمت نے بتایا ہے؟ میں آج اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ اس گدھے
مجھے ڈاکٹروں اور نرسوں سے پٹوایا تھا۔ کدھر گیا یہ......“

وہ غصے سے بولتا خیمے سے باہر نکل گیا اور وہ، جسے احمت پر بے انتہا ترس بھی آ
جا رہی تھی۔

☆......☆......☆

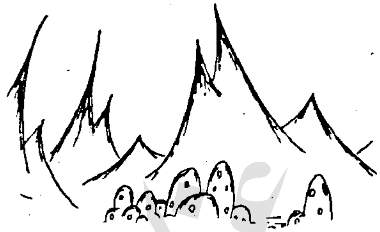

آٹھویں چوٹی

جمعرات، 11 اگست 2005ء

اس نے میس ٹینٹ کی میز پر رکھے کئی پاور بارز اور انرجی بارز اٹھا کر اپنے رک سیک میں بھر لیے اور جوتوں کے نیچے crampons چڑھا کر باہر نکل آئی۔ وہاں ارسہ، فرید اور افق اپنے بیک پیکس کمر پر چڑھائے، بوٹس، کریمپنز، ٹوپیاں اور گلاسز پہنے تیار کھڑے تھے۔

شیڈیول کے مطابق کیمپ فور تک دو پورٹرز ساتھ لے کر جانا تھے، مگر شیر خان نے صبح سویرے سورج نکلنے کے وقت بغیر گلاسز لگائے راکاپوشی کا نظارہ کیا تھا اور اب وہ سنو بلائنڈ ہو کر اپنے گھر پڑا تھا۔

ان کے پاس اتنا گیئر اور فیول نہیں تھا کہ وہ ایک دن بھی تاخیر کر سکیں۔ فرید خان جانے کے

لیے تیار تھا۔ وہ بنیادی طور پر ہنزہ کا باشندہ تھا اور ہنزہ پورٹرز بلتی پورٹرز سے جسمانی
دونوں لحاظ سے مختلف ہوتے تھے۔ بلتورو کے بلتی پورٹرز کو غیر ملکیوں خصوصاً یورپین
زیادہ تجربہ ہوتا تھا۔ افق انہیں "شرپاز کا قراقرم ورژن" کہتا تھا۔ پورٹرز کو گلہریوں کی
کے لیے بہت کچھ محفوظ کرنا پڑتا ہے، جس کے باعث یہ نہ چاہتے ہوئے بھی کوہ پیمائی
ان بلندیوں پر جاتے ہیں۔ کوہ پیمائی بعض لوگ پیسہ کمانے کے لیے کرتے ہیں اور بعض
کرنے کے لیے۔

جب ان چاروں نے بیس کیمپ کو الوداع کہا تو افق، احمت سے گلے ملا، پھر اس کے
پر ہاتھ رکھے، اسے سنجیدگی سے اپنی زبان میں کچھ سمجھاتا رہا۔ احمت پہاڑ پر تقریباً تین
ان کے ہمراہ آیا تھا۔ اس دوران افق مسلسل اسے کسی لیڈر کی طرح ہدایات دیتا رہا اور احمت
ازلی معصوم انداز میں تابعداری سے سر ہلاتا رہا۔

پھر احمت چلا گیا تو افق اسے نیچے اترتے دیکھتا رہا۔ یہاں تک کہ وہ نگاہوں سے اوجھل ہو
گیا۔ پریشے اس کے ساتھ ہی کھڑی تھی۔ احمت غائب ہو گیا تو افق نے ایک آخری الوداعی
دور چھوٹے سے دکھائی دینے والے بیس کیمپ پر ڈالی۔

"میری خواہش ہے کہ ہم سب ان خیموں کو دیکھنے کے لیے زندہ رہیں۔" وہ بڑبڑایا۔
نے بے حد خوف سے اوپر "برو" کے گلیشیئر کو دیکھا اور دل میں دعا کی کہ خدا کرے برو
کوئی دبے قدموں اس کی راجدھانی میں داخل ہو رہا ہے۔ کاش برو سوتا رہے، وہ کبھی نہ
وہ اس کے تخت پر قدم رکھ کر زندہ سلامت واپس آ جائیں۔

اس کی ہراساں صورت دیکھ کر وہ مسکرایا، "فکر نہیں کرو۔ ہم راکاپوشی کو سر کر لیں تو
کے لوگ ہمیں گرینڈ دعوت دیں گے۔"

پریشے نے ایک نظر برف میں پیوست نوکدار بیضوی سے کریمپنز کو دیکھا جو اس کے
کے نیچے لگے تھے اور جس سے وہ برف پر پھسل نہیں سکتی تھی اور سر جھٹک کر مسکرائی۔
قدرے کم ہوا۔

"ہاں میں نے دیکھا تھا، دعوت کا سن کر تم نے بڑے حریصانہ انداز میں پوری آنکھیں
انہیں دیکھا تھا۔"

"میری آنکھوں کو کچھ مت کہو۔ ترک لڑکیاں ان آنکھوں پر مرتی ہیں۔"

"ترک لڑکیوں کا ٹیسٹ اتنا خراب ہے؟ چچ چچ، مجھے ان سے ہمدردی ہے۔"

"اچھا ابھی لڑو نہیں۔ ابھی لمبا سفر ساتھ کرنا ہے۔" افق نے اپنا بھاری دستانے والا ہاتھ بڑھایا، پریشے نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اب اس نے خود کو قدرے محفوظ تصور کیا۔ وہ گرنے لگے گی تو وہ اسے تھام لے گا اور گرنے نہیں دے گا۔

وہاں برف گدلی اور بے حد نرم تھی۔ سورج ذرا تیز چمکتا تو برف پگھلنے اور ٹپکنے لگتی۔ راکاپوشی سر کرنے کا بہترین وقت جولائی ہوتا ہے اور وہ ایک مہینہ لیٹ ہو چکے تھے۔ اگست میں برف خراب حالت میں تھی۔ ایسی ہی برف کھد کر ایک برفیلے میدان میں کیمپ ون نصب تھا جس میں تین ٹینٹ لگائے گئے تھے۔ یہ کوہ پیمائی کا نظم و ضبط ہوتا ہے۔ کیمپ ون تک وہ دوپہر تک پہنچ گئے تھے۔ پہلی رات انہوں نے وہیں گزاری۔

دوسری صبح افق، فرید اور ارسہ کیمپ ٹو تک کے راستے پر رسیاں لگانے چلے گئے۔ افق کا ارادہ اوپر بارہ سو میٹر تک راستہ متعین کرنے کا تھا اور آگے کیمپ ٹو کے لیے کہیں مناسب جگہ ڈھونڈ کر وہاں خیمے بھی لگانے تھے۔ وہ سیمی الپائن سٹائل سے چڑھ رہے تھے یعنی بعض جگہ رسیاں لگانی تھیں اور بعض جگہ نہیں۔ پریشے اس روز خیمے میں ہی رک گئی۔ اس کی ایلٹی ٹیوڈ سک نیس کم ہو رہی تھی اور بہت جلدی اوپر جانے سے وہ بڑھ سکتی تھی۔ سو اپنی Acclimatization کو بالکل پرفیکٹ کرنے کے لیے اس نے وہیں رک کر ان کے لیے کھانا بنانے کی ذمہ داری لے لی۔

کچھ دور تک وہ ان کے ساتھ گئی۔ ارسہ کے کندھے پر رسیوں کا گچھا تھا اور ہاتھ میں چند آئس سکریوز اور پی ٹونز (pitons) تھے۔ افق نے زمین پر بیٹھ کر ایک پی ٹون ٹھونکا، پھر رسی کو اس سے اینکر کیا..... یہ تمام کارروائی دیکھنا خاصا غیر دلچسپ تھا، سو وہ واپس خیمے میں آ کر کھانے کی تیاری کرنے لگی۔

پریشے کو اپنی کُکنگ پر ناز تھا۔ اس کے ہاتھ میں ذائقہ بھی بہت تھا، سو ان تمام چیزوں سے جو وہ بطور خاص بریانی بنانے کے لیے لائی تھی، اس نے بڑے پیار اور محنت سے سندھی بریانی بنائی۔ شام تک وہ اس کام سے فارغ ہوئی۔ آگے تمام دن Add- some- hot- water ٹائپ کی چیزیں ہی کھانی تھیں، سو آج بریانی کھا کر یقیناً افق کو اچھا لگے گا، یہی سوچ کر اس نے یہ بنائی تھی۔

کھانا ڈھک کر وہ باہر چلی آئی۔ وہاں ہر طرف سخت برف کے اوپر پاؤڈر سنو کی تہ چڑھی ہوئی

تھی۔ دو تین دن سے نئی برف نہیں گری تھی، اس لیے یہ برف پیلی سی تھی۔ وہاں خیموں سے دور ایک بڑے گرینائٹ کے پتھر پر بیٹھ کر وہ اس بے حد خوش گوار موسم کو انجوائے کرنے لگی۔

راکاپوشی پر شام اتر رہی تھی۔ ہر سو ٹھنڈی میٹھی سی چھایا تھی۔ وہ پہاڑ کی جانب پیٹھ کر کے کہنیاں گھٹنوں پر جمائے ہتھیلی ٹھوڑی تلے رکھے خاموشی سے ان خوب صورت مناظر کو اپنے میں جذب کرتے ہوئے ڈھلتی شام کے سحر میں ڈوبنے لگی۔

خیموں کے باہر اس بے حد تنہا اور خاموش برفیلے میدان میں اس حد تک خاموشی تھی کہ گرنے سے بھی گونج پیدا ہوتی۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اردگرد موجود تمام دیوہیکل سیاہ پہاڑ بالکل خاموشی سے اسے دیکھ رہے تھے۔ شام کے اس پہر وہ دنیا کا حسین ترین پہاڑ راجدھانی تھا۔ سارے کا سارا ڈومانی اس کا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے پاپا، پھوپھو، سیف، نتاشہ دوسری دنیا میں رہتے تھے، جہاں بلند و بانگ عمارتیں تھیں، جہاں ٹریفک کا شور اور موسیقی کی آواز گونجتی تھی۔ یہ کوئی اور دنیا تھی۔ جب اس دوسری دنیا کی رات شروع نہیں ہوتی تھی کی صبح ہو جاتی تھی۔ منہ اندھیرے کوہ پیما برف پر اپنے کلہاڑے مارتے ہوئے آٹھ کلومیٹر شروع کر دیتے تھے، جس کی بلندیوں تک جانے کو ان کی روحیں مچلا کرتی تھیں۔ وہ آٹھ کلو دوسری دنیا میں گاڑی پر آٹھ منٹ میں طے ہو جاتے تھے۔ پہاڑوں پر مہینوں میں ہوتے تھے انسان کی فطرت ہے اور یہی جستجو انسان کو ان آٹھ کلومیٹر کا سفر کرنے پر اکساتی ہے۔

وہ اسی طرح پتھر پر بیٹھی کتنی ہی دیر سوچتی رہی۔ کیا وہ سیف جیسے شخص کے ساتھ رہ سکے انسان نہیں ایک سٹاک ایکسچینج تھا؟ جس کے سینے میں دل کی جگہ کیلکیولیٹر نصب تھا۔ بغاوت کی سرشت میں نہیں تھی مگر صرف ایک دفعہ وہ سیف سے متعلق اپنے تمام تحفظات پاپا کے رکھے گی ضرور، وہ ان کو افق سے ملوائے گی، ان کی آنکھوں سے رشتے داروں کی اندھی پٹی اتارنے کی کوشش ضرور کرے گی۔

وہ بدل رہی تھی۔ پہاڑ اسے تبدیل کر رہے تھے۔ وہ خودکشی نہیں کرنا چاہتی تھی، سو منگنی ختم کرنے کا فیصلہ اس نے کر لیا تھا۔ وہ الجھنوں کے سرے تلاش کر کے ان کو سلجھانا چاہتی تھی۔

اور افق، جس کی طرف سے اسے پہلے بے یقینی سی تھی، اب مکمل نہیں، تو کسی حد تک تھا۔ پیٹر آنسرز کھیلتے کھیلتے اس نے اعتراف کیا تھا۔ ''محبت؟ وہ تو عشق کرتا ہے۔'' اور یہ

بھرا اظہار ''ہاں، لگتی ہو نا!'' وہ ایک فقرہ اس کے اوپر نرم پھوار برسانے لگا۔ کتنا مان، اپنائیت اور محبت تھی اس ایک فقرے میں۔ ہاں ایک بے کلی بھی تھی کہ وہ براہ راست اظہار کیوں نہیں کرتا تھا۔ تین لفظ کیوں نہیں کہہ سکتا تھا؟ شاید کبھی اس نے حنادے کو یہ بات کہی ہو۔ پتا نہیں ان کی محبت کی شادی تھی بھی یا...... یہ بات وہ افق سے نہیں پوچھ سکتی تھی، پھر......

اسے ایک دم ایک خیال آیا۔ اس نے جھٹ اپنی پاکٹ سے ٹرانسیور نکالا۔ اس کا میکنزم بس دو بٹن کا تھا۔ اس نے ٹرانسمٹ بٹن دبایا۔ تھوڑی دیر بعد احمت لائن پر تھا۔

''گڈ آفٹرنون فرام بیس کیمپ ڈاکٹر! کیسی ہو؟'' احمت اس کی آواز سن کر خوش ہوا تھا۔

''کیمپ ون کے باہر برف پر بیٹھی ہوں۔ باقی سب روٹ فکس کرنے گئے ہیں۔ میں نے چاول بنائے ہیں۔ تم سناؤ بیس کیمپ کیسا ہے؟''

''تمہیں یاد کر رہا ہے اور خاصا اداس ہے۔ سب ٹریکرز اور پورٹرز سوائے شفالی کے، جا چکے ہیں۔ میں بور ہو رہا تھا۔ اچھا کیا کال کر لیا۔ تمہاری ای میلز آئی ہوئی ہیں۔ تم نے اپنا ای میل اور پاس ورڈ میرے پورٹیبل پر محفوظ کر دیا تھا مگر قسم لے لو، میں نے کوئی ای میل نہیں کھولی۔''

''اوہ۔ کر لو چیک اور میری طرف سے جواب لکھ لو۔'' وہ اسے ای میلز کے جواب لکھوانے لگی۔ پھر قدرے سوچ سوچ کر بولی۔ ''احمت! ایک بات پوچھوں؟''

''ہاں پوچھو ڈاکٹر تمہاری بیماری......''

''اوہو۔ ضروری تو نہیں میں تم سے میڈیکل کے متعلق کچھ پوچھوں۔ میں کچھ اور پوچھنا چاہ رہی تھی۔'' پھر قدرے توقف سے بولی، ''تمہیں حنادے یاد ہے؟''

''کون حنادے؟''

پریشے کو حیرت ہوئی۔ افق نے حنادے کو اپنی بیوی بنایا تھا اور اس کا اتنا اچھا دوست اس بات سے لاعلم تھا۔

''افق کی بیوی، حنادے۔''

''اچھا میں سمجھا تم ''حوا'' کی بات کر رہی ہو۔ حضرت حوا کی، جن کو انگلش میں Eve اور ترک میں حنادے کہتے ہیں۔''

پریشے کا دل سر پیٹ لینے کو چاہا۔ اپنا نہیں، احمت کا۔

''ہاں وہی، تمہیں یاد ہے؟ کیسی تھی وہ؟''

''خوب صورت تھی۔''

''اور......؟''

''تم کیوں پوچھ رہی ہو؟''

پریشے سٹپٹا گئی۔ وہ اتنا سیدھا نہیں تھا، جتنا وہ سمجھ رہی تھی۔

''وہ یونہی، افق اس کو یاد کر کے اداس ہو جاتا ہے ناں۔''

''یہ تم سے کس نے کہا؟'' احمت کے لہجے میں حیرت تھی۔

''افق نے۔''

''وہ مذاق کر رہا ہوگا۔ وہ تو اس سے شادی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔''

''مگر کیوں؟'' اسے کرید ہوئی۔

''اسے کسی اور سے محبت تھی۔''

پریشے کا دل ڈوب کر ابھرا ''کس سے؟''

''کیا واقعی قراقرم اور ہمالیہ کے پہاڑوں پر پریاں اترتی ہیں؟ افق کو جانے کتنے برسوں ان پریوں کی تلاش تھی۔ وہ کے ٹو کے روپل فیس کے بیس کیمپ کا ٹریک بہت یاد کیا کرتا تھا۔''

''کے ٹو کا نہیں، نانگا پربت کا روپل فیس ہوگا......'' اس نے بمشکل ''سٹوپڈ'' کہنے کو روکا۔

''ہاں وہی، وہاں بیال کیمپ سے فیری میڈوز کے درمیان، اس نے سن رکھا تھا کہ اُترتی ہیں اور رات کو سیاحوں کے پاس آ کر انہیں گیت سناتی ہیں۔ وہ ہر مرتبہ پاکستان آ روپل فیس کا ٹریک ضرور کرتا تھا۔ حالاں کہ میں نے کہا بھی تھا کہ سٹوپڈ آدمی، یہ پریاں کچھ نہیں ہوتیں، ایویں سیاحوں کو بے وقوف بناتے ہیں مگر افق اور جینیک تو پاگل ہیں پریوں کو ڈھونڈنے ہر گرما میں پہاڑوں میں نکل جاتا تھا اور افق جینیک کے بغیر کہیں جا ہو نہیں سکتا۔''

''پھر اب جینیک کیوں نہیں آیا؟''

''اس کو تو ماز کے باس نے کام میں پھنسا رکھا ہے۔ جینیک بڑا خبیث آدمی ہے،'' کہہ رہا احمت دعا کرو کہیں زلزلہ، طوفان یا سیلاب آ جائے میں ریلیف ایکٹویٹی کے بہانے ہی نکلوں۔'' احمت زور سے ہنسا۔

''اور وہ حنا دے...... اس سے شادی نہیں کرنا چاہتا تھا تو اب اس کے بارے میں اتنا حساس کیوں ہے؟'' اس کے ذہن کی سوئی وہیں تھی۔

''اس کی بیوی تھی ناں۔ جیسی بھی تھی، مرے ہوؤں کو کچھ نہیں کہا کرتے۔ ویسے بڑی عجیب سائیکو کیس تھی۔ بہت میک اپ کرتی تھی۔ سلمٰی کہتی تھی، افق نے لگتا ہے کسی پیسٹری سے شادی کی ہے۔''

''اچھا۔'' کچھ سوچتے ہوئے اس نے ریڈیو کو دیکھا۔ پھر الوداعی کلمات کہہ کر سلسلہ منقطع کر دیا اور احمت کی باتوں پر ازسرِ نو غور کرنے لگی۔

اس کے سامنے آسمان پر سرخ و سرمئی بادلوں کے درمیان خالی جگہوں سے، ڈھلتے سورج کی آخری نارنجی شعاعیں جھانک رہی تھیں۔ دور نانگا پربت کو بادلوں نے ڈھانپ لیا تھا اور وہ بادل اب یقیناً قراقرم کی جانب بڑھنے لگے تھے۔

''خدا کرے یہ ہمیں بائی پاس کر کے گزر جائیں اور موسم نہ خراب ہو۔'' وہ دعا کرتے ہوئے اور اوپر پہاڑ پر بار بار نگاہیں دوڑاتی ان تینوں کا انتظار کر رہی تھی۔

شام ڈھلنے کے ساتھ ساتھ درجۂ حرارت گر رہا تھا۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر رات کا اندھیرا پوری طرح پھیل گیا تو اسے تھکے تھکے قدموں کی آہٹ اور باتوں کی آواز سنائی دی۔ وہ تینوں آگے پیچھے برف پر چلتے اس کی جانب آ رہے تھے۔ افق کے کندھے پر رسیوں کا آخری گچھا اور ہاتھ میں سنو اسٹک تھی۔

''کدھر رہ گئے تھے؟ اتنی دیر سے انتظار کر رہی تھی۔''

اس کے غصے کے جواب میں اس کے چہرے پر تھکن زدہ مسکراہٹ ابھری۔

''اچھی لگ رہی ہو اتنی فکر کرتے ہوئے اور بھی اچھی لگو گی اگر جلدی کھانا کھلا دو تو۔'' وہ اس کے پاس سے گزر کر خیمے میں چلا گیا۔ ارسہ نے بھی اس کی تقلید کی۔ دونوں خاصے تھک چکے تھے۔

''میں نے بریانی پکائی ہے۔'' اس کے پاس اندر آ کر اس نے دبے دبے جوش سے بتایا۔

''لائیں آپ کی ہیلپ کرواؤں۔'' ارسہ اس کے ساتھ کھانا نکالنے لگی۔ پریشے نے بریانی والا برتن کھولا۔ افق نے جھک کر چاولوں کی شکل دیکھی اور ایک سیکنڈ کو چپ سا ہو گیا۔

''چلو ذائقہ اچھا ہوگا۔'' افق کا مطلب تھا کہ شکل اچھی نہیں ہے۔

''میری کُکنگ پوری فیملی میں مشہور ہے۔ بے شک نشاء سے پوچھ لو۔'' اس نے جتایا۔

''ہمارے ہاں یہ اعزاز احمت کی بیوی سلمیٰ کو حاصل ہے۔'' افق نے بریانی اپنے برتن میں نکالی اور پہلا چمچہ منہ میں ڈالا، پھر اسے چبا کر نگلا۔ اس کے بعد مرغی کی بوٹی توڑنے کی کوشش کی جو ٹھیک سے گلی نہیں تھی اور کچھ سردی کا اثر بھی تھا۔ اس نے ایک ٹکڑا توڑ کر منہ میں رکھا اور چیونگم کی طرح چبایا۔ ارسہ سے بھی نہیں بوٹی نہیں چبائی جا رہی تھی۔ پریشے بغور دونوں کے تاثرات دیکھ رہی تھی۔

''تمہیں پتا ہے پری، ترکی یورپ میں ہے۔''

''اور میں بھی یورپ سے آئی ہوں۔'' ارسہ نے پلیٹ رکھ دی۔

''مطلب؟'' پریشے نے سنجیدگی سے دونوں کو دیکھا۔

''مطلب یہ کہ یورپ سے آئے ہیں، افریقا سے نہیں۔ کچا گوشت تو صرف افریقی کھا سکتے ہیں۔''

''افق بھائی کا مطلب ہے کہ...... مچھلی پڑی ہے؟'' ارسہ نے اس کے چہرے کو دیکھ کر وضاحت کی۔

''ہاں پڑی ہے، تمہارے پیچھے سیرینہ ہوٹل کے شیف دے کر گئے تھے نا۔'' وہ اپنے بریانی لے کر وہاں سے چلی آئی تھی۔ مطلب تھا کہ ''خود پکا لو مچھلی۔''

''اگر 4800 میٹر بلندی پر کوکب خواجہ بھی بنائیں گی تو اس سے اچھی نہیں بنا سکتیں۔ سارا دن لگ کر میں ان کے لیے کھانا بناتی رہی، کیا تھا اگر جھوٹے منہ ہی تعریف کر دیتا افق؟ اتنی بری نہیں تھی کہ اسے کچا گوشت کہا جاتا۔'' اسے سچ مچ رونا آیا تھا۔ ''ٹھیک ہے، مصالحے تیز، بلکہ خاصے تیز اور گوشت ٹھیک سے گلا نہ تھا، مگر چپ کر کے کھاتے رہتے میرا دل رکھنے کو۔ اتنی فارورڈنیس کی کیا ضرورت تھی؟ میں کوئی پورٹر تو نہیں ہوں جو کھانے پکاؤں۔ ٹھیک ہے نہیں پکاؤں گی۔''

رات وہ اپنے خیمے سے باہر اسی پتھر پر بیٹھی اپنے جوگرز کے نیچے کریمپنز سے برف پر لکیریں سی بنا رہی تھی۔ گردن اس نے اٹھا رکھی تھی اور نگاہیں اوپر ساتویں کے چاند پر تھیں، جس کی روشنی سے برو کا گلیشیئر چمک اٹھا تھا۔ راکاپوشی پر چاند خاصا بڑا اور واضح دکھائی دیتا تھا۔ شاید اسے دھند سے ڈھکی اس حسین چوٹی سے عشق ہو گیا تھا اور وہ اس کو دیکھنے بہت قریب اتر آیا تھا۔ دفعتاً اس نے افق کو اپنے خیمے سے نکلتے دیکھا تو چہرے کا رخ جھٹکے سے موڑ لیا۔ چند لمحوں بعد اسے کسی کے اپنے ساتھ پتھر پر بیٹھنے کی آہٹ محسوس ہوئی۔

''آہم۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے۔ بریانی پڑی ہو گی؟'' گلا کھنکھارتے ہوئے بہت معصومیت سے پوچھا گیا۔

پریشے نے رخ قدرے مزید پھیر لیا۔

''یقین کرو بریانی بہت مزے دار بنی تھی۔ اتنی لذیذ بریانی تو میں نے زندگی بھر نہیں کھائی۔ یہ ممبئی کے شیف تو جھک مار رہے ہیں۔ ان کو تو تم سے سیکھنا چاہیے۔''

وہ جواباً کچھ بولے بنا چہرے کا رخ اس کی جانب سے موڑے دائیں طرف سیدھی پتھروں کی دیوار کو دیکھتی رہی جس پر چاندی کا چھڑکاؤ ہوا تھا۔

''اچھا پلیز! دیکھو ناراض تو مت ہو۔ میں نے تو تعریف کی ہے۔''

پریشے نے گردن گھما کر قہر آلود نگاہوں سے اسے دیکھا۔ ''نہیں، تم تو افریقا سے نہیں آئے اور تم تو کچا گوشت نہیں کھاتے۔''

''اب کچے گوشت کو میں پکا گوشت کہنے سے تو رہا۔''

''ہاں خود تو اوپر چلے گئے تھے۔ میں نے سارا دن اتنی محنت سے بریانی تیار کی اور پھر اتنی دیر تمہارا اتنی پریشانی سے انتظار کیا اور تم؟''

''کاش قراقرم کی پری! تم نے اتنی دیر گوشت گلانے پر لگائی ہوتی تو......''

''افق۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''اچھا پلیز رونا مت۔ میں تو مذاق کر رہا تھا۔ دیکھو تمہارے لیے اتنا گرم سلیپنگ بیگ چھوڑ کر آیا ہوں۔''

''تو نہ آتے۔''

''کیوں نہ آتا؟ مجھے پتا ہے تم نے کھانا نہیں کھایا۔ میں تمہارے لیے خود پکا کر مچھلی لایا ہوں۔'' افق نے پیکٹ اسے تھمایا۔ پریشے نے حیران نظروں سے اسے دیکھا۔

''تمہیں کیسے پتا میں نے بریانی نہیں کھائی؟''

''لو۔ وہ کوئی کھانے والی چیز تھی؟'' وہ ہنسا۔

پریشے نے روہانسی ہو کر وہ پیکٹ زور سے اس کے کندھے پر مارا۔

''ویسے پری! نشاء کہہ رہی تھی، تم سیف سے منگنی سے انکار نہیں کر سکتیں۔ تم واپس جا کر ایک

کام کرنا۔ سیف کو اپنی بنائی گئی بریانی کھلا دینا، وہ خود ہی رشتہ توڑ جائے گا، لکھ کر رکھ لو۔'' وہ بڑ
رہا تھا۔

''میری بریانی کے بارے میں تم نے ایک لفظ اور کہا، تو میں تمہیں یہاں سے دھکا دے دوں گی اور رہا منگنی کا سوال، تو وہ میں ویسے ہی ختم کر دوں گی۔''

وہ ہنستے ہنستے رک گیا اور خوش گوار حیرت سے اسے دیکھا، ''وہ کیوں؟''

''مجھے ٹام کروز نے پرپوز کیا ہے، اس لیے۔'' وہ جل کر بولی۔

وہ پھر سے ہنس دیا، ''ہاں، اچھا آدمی ہے، کر لو شادی۔''

''ہاں، تمہیں قتل کر کے اس سے ہی شادی کروں گی۔'' وہ غصے سے کہہ کر تیزی سے اپنے خیمے میں چلی گئی۔

☆......☆......☆

ہفتہ، 13 اگست 2005ء

خیمے کی گور ٹیکس کی دیوار سے ٹیک لگائے، گھٹنوں پر کتاب رکھے وہ مطالعے میں منہمک تھی۔ قدرے فاصلے پر ارسہ اسی انداز میں بیٹھی کاغذوں کا پلندہ گود میں رکھے تیز تیز قلم چلا رہی تھی۔ خیمے کی کپڑے کی دیوار میں شفاف چوکور چھوٹی سی کھڑکی تھی، جس پر برف کے ذرات گر رہے تھے۔ دوپہر ہونے کے باوجود باہر اندھیرا سا تھا۔

بادل راکاپوشی پر چھا چکے تھے۔ موسم سخت خراب تھا۔ برف کا طوفان خاصی دیر تک چنگھاڑتا رہا تھا اور اب برف باری ہو رہی تھی۔ احمت نے بتایا تھا کہ بیس کیمپ میں آج بارش ہو رہی تھی۔ رات برفانی جھکڑ چلنے کے باعث بیس کیمپ کا کچن ٹینٹ اڑ کر قریبی گلیشیر پر جا گرا تھا۔

افق اپنے خیمے سے نکل کر دھند میں چلتے ہوئے ان کے خیمے میں داخل ہوا۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' اس کے آنے سے خیمے کی خاموش فضا میں ارتعاش پیدا ہوا۔ پریشے نے کتاب پر سے نظر ہٹا کر اسے دیکھا، جو نیچے میٹرس بچھا کر رک سیک کا تکیہ بنا کر نیم دراز ہو چکا تھا۔ وہ پھر کتاب کی طرف متوجہ ہو گئی۔

''لائبریری میں بولنا منع ہے۔'' صفحے پر نگاہیں جمائے پریشے نے اطلاع دی۔

''میں اتنے خراب موسم میں پورے پیچھے قدم چل کر تمہارے خیمے میں آیا ہوں اور تم بے مروت ہو؟''

ارسہ نے قدرے اُکتا کر سر اٹھایا اور پھر بڑبڑاتی ہوئی کاغذ پر جھک گئی۔

''میں سوچ رہا ہوں اگلے سال بطور گائیڈ کسی ایکسپیڈیشن کے ساتھ ایورسٹ جاؤں۔ بندے کو اس فیلڈ میں کچھ کمانا بھی چاہیے۔ انجینئرنگ میں میرا دل نہیں لگتا۔ وہ تو ماز کا باس مجھے برداشت بھی اسی لیے کرتا ہے کہ میرے باپ کا دوست ہے۔''

''افوہ، افق بھائی! کتنا بولتے ہیں آپ۔ کوئی کام نہیں کرنے دیتے۔'' ارسہ نے جھنجھلا کر اپنے کاغذ سمیٹے اور بڑبڑاتی ہوئی خیمے سے باہر نکل گئی۔ پریشے نے کتاب پر سے نگاہیں ہٹا کر حیرت سے اسے جاتے دیکھا۔ افق مسکرا دیا۔

سکاٹ فشر سے معذرت کے ساتھ۔

"Its not attitude. Its altitude."

اس الٹی ٹیوڈ پر بندہ تھوڑا بہت چڑچڑا تو ہو ہی جاتا ہے۔ میں مائنڈ نہیں کرتا۔ ہاں تو میں بات کر رہا تھا اگلے مارچ کی، جب میں ایورسٹ ایکسپیڈیشن لیڈ کروں گا۔ تم سن رہی ہو؟''

''نہیں۔'' وہ کتاب پڑھتی رہی۔

''تو پھر سنو، وہ بریانی پھر سے کھلاؤ ناں۔''

''زہر نہ کھلاؤں؟'' اس نے پڑھتے پڑھتے ایک طنزیہ نگاہ سامنے بیٹھے افق پر ڈالی۔

''تمہارے ہاتھ سے زہر بھی کھا لوں گا۔ تم کھلاؤ تو۔''

''کیا پاکستانی فلمیں بہت دیکھنے لگے ہو؟''

''پشاور میں ایک پشتو فلم دیکھی تھی۔ سمجھ میں تو نہیں آئی مگر اس کی ہیروئن کنگ فو بہت اچھی کرتی تھی۔''

''کنگ فو؟ جیسے تمہیں پتا ہی نہیں کہ وہ ڈانس تھا۔ بنومت۔'' وہ پھر سے مطالعے میں منہمک ہو گئی۔ وہ جھنجھلا گیا۔

''یہ کتاب مجھ سے زیادہ اچھی ہے کیا؟''

''ہاں بالکل۔'' اس نے سنجیدگی سے کہا پھر افق کے خفا تاثرات دیکھ کر ہنس دی۔ ''خفا ہو گئے کیا؟'' پریشے نے کتاب ایک طرف ڈالی۔

''پری!'' وہ ایک دم سچ مچ اداس نظر آنے لگا۔ ''مجھے آنے بہت یاد آ رہی ہے۔''

ترک اپنی ماں کو ''آنے'' بولتے ہیں۔

"ہوں۔ مجھے بھی پاپا اور نشاء لوگ بہت یاد آ رہے ہیں۔ پتا نہیں پہاڑوں پر پیچھے والے لوگ کیوں اتنے یاد آتے ہیں۔"

افق اٹھ کر بیٹھ گیا اور پریشے کے مقابل خیمے کی دیوار سے ٹیک لگا لی۔ کھڑکی سے سرمئی آسمان نظر آ رہا تھا۔

"کبھی کبھی میرا دل کرتا ہے میں کوہ پیمائی ترک کر دوں۔ آنے کو یہ سب اچھا نہیں لگ کھڑکی پر گرتی، جمتی برف کو دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "میرے تین بھائی پہاڑوں میں ہلاک تھے۔ ان کے بعد میری ماں بہت اکیلی اور دکھی ہو گئی ہے۔ وہ اکثر مجھے کہتی ہے۔ افق پہاڑ نہ جایا کرو۔ میرے بیٹے پہاڑوں سے لوٹ کر نہیں آتے۔ تب میں سوچتا ہوں کہ صرف ا لیے یہ تمام کام ترک کر دوں، آرام سے جاب کروں، پرکشش تنخواہ ہاتھ میں ہو اور اپنے ما کے ساتھ رہوں۔ تب میرا دل یہ سب کچھ چھوڑ دینے کو چاہتا ہے۔" کچھ دیر پہلے کی شوخی اب اس کے چہرے سے مفقود تھی۔

"تو پھر چھوڑتے کیوں نہیں ہو یہ سب؟"

وہ پژمردگی سے مسکرایا۔ "جنون ہے یہ پری۔ ایڈکشن ہے پہاڑوں کی۔ کوہ پیمائی چھوڑ مشکل ہوتا ہے۔ مجھے ہمالیہ سے عشق ہے۔ مجھے بچپن سے ہی شوق تھا۔ "بگ فائیو" سر کر ایورسٹ، کے ٹو، Lhotese. Kang Chenjunga اور Makalu میں گھنٹوں تصو کہ وہ لمحہ کیسا ہو گا جب میں ان سب کو سر کر لوں گا۔ وہ لمحہ جب تمام خواب پورے ہو جائیں جب دو سال پہلے میں نے کے ٹو کی چوٹی پر قدم رکھا تو جانتی ہو کیا ہوا؟ میرے خواب اچا خالی ہو گئے۔ سارے خواب، خواہشات سب ختم ہو گیا۔ ہر خواب پورا نہیں ہونا چاہیے پر زندگی میں ایک عجب خالی پن در آتا ہے۔ کچھ ادھورا بھی رہنا چاہیے۔ میری اک آخری آرز دنیا کے حسین ترین پہاڑ پر کھڑے ہو کر کنکورڈیا اور بلتورو کی چوٹیاں دیکھنے کی، پھر میں پہاڑوں میں نہیں آؤں گا۔"

"اگر یہ آرزو تشنہ رہ گئی پھر بھی؟"

وہ دھیرے سے مسکرایا۔ "ہاں پھر بھی کیوں کہ جس کی جستجو تھی وہ مل گئی ہے۔" پریشے کا دل سے دھڑکا۔

"میں نے سن رکھا تھا کہ ہمالیہ اور قراقرم کے پہاڑوں پر پریاں اترتی ہیں۔" وہ

مسکراتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ "میں نانگا پربت بیس کیمپ کے ٹریک میں بیال کیمپ سے......"

"بیال کیمپ سے فیری میڈوز تک کا سفر بہت یاد کرتے تھے، کیوں کہ ان دو جگہوں کے درمیان شام ڈھلے پریاں مدھر نغمے گاتی ہوئی اڑتی پھرتی ہیں اور تمہیں ان کو دیکھنے کی آرزو تھی۔ ہے نا؟" اس نے فقرہ مکمل کیا۔

شہد رنگ آنکھوں میں حیرت در آئی۔ "تمہیں کیسے پتا؟"

پریشے نے مسکراتے ہوئے شانے اچکا دیئے اور کتاب اٹھا لی۔ "جس کی جستجو کی جائے اسے ازل سے علم ہوتا ہے، بے وقوف کوہ پیما۔ کھوجنے والا تو در بدر کی ٹھوکریں کھاتا ہے، مگر جنہیں کھوجا جاتا ہے ناں، وہ ایک ہی راستے پر صدیوں نگاہیں جمائے انتظار کر رہے ہوتے ہیں۔" اپنا مطلوبہ صفحہ پلٹتے ہوئے وہ کتاب پر سر جھکائے کہہ رہی تھی۔ ایک دل نشین مسکراہٹ اس کے لبوں پر بکھری تھی۔

کتنی ہی دیر تک تو وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ بہت کچھ کہہ کر بھی وہ کچھ نہ کہہ سکا تھا اور پریشے نے دو فقروں میں دشتِ آرزو سمیٹ کر رکھ دیا تھا پھر وہ جیسے کھل کر مسکرا دیا۔

"یہاں سے جا کر تمہارے فادر کے پاس چلیں گے، ٹھیک؟"

اس کی جھکی پلکوں میں ارتعاش پیدا ہوا۔ اس کے سامنے بیٹھا شخص بہت کچھ کہہ گیا تھا، مگر تین لفظ، جذبوں کی شدت، کوئی اظہار، کوئی اعتراف نہیں کرتا تھا۔ پریشے نے پلکیں اٹھا کر قدم یونانی دیو مالا کے اس کردار کو دیکھا جو جانے اس کی قسمت میں لکھا بھی تھا یا نہیں۔

"یہاں سے جا کر؟ تمہیں یقین ہے ہم یہاں سے زندہ واپس جائیں گے؟" وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی، مگر لبوں سے یہی پھسل پڑا۔

افق نے شانے اچکا دیئے۔ "راکاپوشی بہت خوب صورت ہے اور جو خوب صورت ہوتے ہیں، ان سے زیادہ ظالم بھی کوئی نہیں ہوتا۔"

"مگر میں مرنا نہیں چاہتی۔ اب...... اب زندہ رہنے کو دل کرتا ہے افق! زندگی اب بہت حسین لگتی ہے۔" وہ کہیں کھو سی گئی۔ افق اٹھ کر اس کے قریب آیا۔

"تم فکر کیوں کرتی ہو پری! تم اکیلی نہیں ہو، میں ہوں ناں تمہارے ساتھ۔"

پری نے ممنون نگاہوں سے اسے دیکھا۔ "میں تین ہفتے پہلے تک تمہیں جانتی بھی نہیں تھی اور اب یوں لگتا ہے کہ جیسے تم سے بڑھ کر اپنا اور کوئی نہیں ہے۔ جانے کیوں اب یقین سا ہے کہ اگر

میں گری تو تم مجھے تھام لو گے۔"

افق نے بہت عجیب نظروں سے اسے دیکھا، "اور اگر میں گرا تو؟ تو تم بھی حنا دے مجھے چھوڑ جاؤ گی؟"

وہ سناٹے میں رہ گئی۔ وہ اس پل اتنا اجنبی اور سرد مہر لگا تھا کہ وہ چند لمحوں تک تو بول نہیں سکی۔ پھر افق اس کے پاس سے اٹھ کر تیزی سے خیمے سے نکل گیا، مگر وہ اسی طرح اس جگہ کو دیکھتی رہی، جہاں تھوڑی دیر قبل وہ بیٹھا تھا۔

کھڑکی پر برف ابھی تک گر رہی تھی۔

☆......☆......☆

اتوار، 14 اگست 2005ء

پریشے نے آہستگی سے خیمے کا پردہ سرکایا اور اندر جھانکا۔ وہ اپنے سلیپنگ بیگ میں سو رہا دبے قدموں اندر آ گئی۔ خیمے کے فرش پر اس کے قدموں سے آہٹ ہوئی، مگر وہ بے سدھ سوتا رہا۔

رات ارسہ نے اسے بتایا تھا کہ افق نے صبح دو بجے اٹھانے کی تاکید کی تھی۔ پریشے الارم لگا کر سو گئی تھی۔ نیند بمشکل ہی آئی تھی۔ ساری رات ارسہ کی کھانسی سنتے گزری تھی۔ اب میں دس منٹ پہلے ہی وہ اسے جگانے آئی تھی مگر وہ سوتے ہوئے اتنا اچھا لگ رہا تھا کہ وہ سے اس کے سرہانے دوزانو بیٹھ گئی۔ "راکاپوشی 2005ء" کی سرمئی ٹوپی نے اس کے بھورے کو ڈھانپ رکھا تھا۔ اب اس کی ہیل ٹو طیب اردگان والی کیپ اسے نظر نہیں آتی تھی۔

وہ کچھ دیر بیٹھی رہی، اس میں اس کی نیند میں خلل ڈالنے کی ہمت نہیں تھی، سوائے بغیر وہ خاموشی سے اس کے خیمے سے نکل آئی۔

باہر آسمان سیاہ، مگر صاف تھا۔ برف باری گھنٹوں ہوئے رک چکی تھی۔ خیمے کے چند انچ برف جمی تھی۔ دور سیاہ آسمان پر تا حد نگاہ جھلملاتے تارے بکھرے تھے، جو ایک کھلے کھلے دن کی پیشین گوئی کر رہے تھے۔ ہمالیہ کا آسمان پل پل رنگ بدلتا تھا۔

اپنے خیمے میں آ کر وہ افق کی جگہ خود ناشتہ بنانے لگی۔ یوں لگتا تھا اس گھرے اندھیرے وہ سحری کی تیاری کر رہی ہو اور وہ رمضان کے دن ہوں۔

دروازے پر آہٹ ہوئی، پری نے بے اختیار اس طرف دیکھا۔ وہ عجلت میں اندر داخل ہوا تھا۔ آنکھیں سرخ اور بوجھل سی تھیں۔

"مجھے اٹھایا کیوں نہیں؟" اس کے قریب بیٹھے ہوئے افق نے ماچس اس کے ہاتھ سے لے لی۔ پریشے نے بغور اسے دیکھا۔ اب وہ شناسا سا لگ رہا تھا۔ (کبھی کبھی اتنے اجنبی کیوں ہو جاتے ہو افق؟ کیوں اس کو بھلا نہیں دیتے؟ کیوں وہ ہر پل میرے اور تمہارے درمیان کسی دیوار کی طرح آ جاتی ہے؟ کیوں خواب میں آ کر بھی ستاتی ہے، حالاں کہ وہ تو تمہارے خوابوں میں کبھی بھی نہیں آتی) اسے افق سے پچھلی شام کے متعلق کوئی سوال نہیں کرنا تھا۔ وہ جانتی تھی، وہ اس سے کبھی یہ بات نہیں پوچھے گی۔ ایک دن افق خود بتائے گا۔

وہ اب چولہے کی گیس کھول کر، بڑی لاپروائی سے تیلی جلا کر چولہے میں جھونک رہا تھا۔ آگ تیزی سے بھڑک اٹھی۔

"اتنی بے احتیاطی سے کیوں چولہا جلا رہے ہو؟" اس کی بے احتیاطی دیکھ کر پریشے کو ٹوکنا ہی پڑا۔

"چولہے کو چھوڑو۔ رسیوں کی فکر کرو۔ خدا کرے وہ برف میں دب کر گم نہ ہو گئی ہوں۔"

مگر رسیوں کی خبر ہو گئی۔ ان پر برف گری ضرور تھی، مگر وہ جلد ہی نکل آئیں۔ رات کے اس پہر راکاپوشی بہت خاموش تھا۔ وہ آگے پیچھے فکسڈ روپ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ پریشے اپنے جوگرز کو دیکھ رہی تھی۔ جیسے ہی وہ اگلا قدم برف پر رکھتی برف کی تہ ایک انچ دب جاتی۔ ایک لمحے کو اس کا سانس رک جاتا، مگر یہ احساس کہ اس کے نیچے ٹھوس زمین ہے اور وہ پہاڑوں کی کسی درز (crevasse) کے اوپر نہیں کھڑی بہت فرحت بخش ہوتا تھا۔

اونچے پہاڑوں اور گلیشیئرز میں کئی جگہ دراڑیں ہوتی ہیں، جو اندر سے کئی سوفٹ گہری ہوتی ہیں۔ بعض جگہوں پر یہ واضح ہوتی ہیں مگر عموماً ان کے دہانے پر برف باری کے باعث چند انچ موٹی برف کی تہ جم جاتی ہے۔ ایسے میں یہ دراڑیں برف کا نقاب اوڑھے چھپ جاتی ہیں۔ برف کے نقاب پر پاؤں پڑنے کی صورت میں برف فوراً پھٹتی ہے اور کوہ پیما اندر گر جاتا ہے۔ پہاڑوں کی ان درزوں، دراڑوں، شگاف یا کریوس سے عموماً لاشیں بھی نہیں نکالی جا سکتیں۔

اس وقت بھی فکسڈ روپ پر خود کو "جومر" (ایک ایلومینیم کا بیضوی آلہ جس کو فکسڈ روپ اور کمر کے گرد بندھی کلائمبنگ ہارنس سے باندھا جاتا ہے) کی مدد سے رسی پر کلپ آن کرتے وقت اسے آس پاس سرمئی برف میں ہلکی ہلکی کریز سے واضح ہوتے شگاف نظر آ رہے تھے۔ وہ جومر کو اوپر چڑھاتے ہوئے اس روز ساری چڑھائی میں گنگناتی رہی تھی۔

''آؤ بچو! سیر کراؤں تم کو پاکستان کی، جس کی خاطر ہم نے دی قربانی لاکھوں
پاکستان زندہ باد......''

افق نے مطلب پوچھا تو اس نے کندھے اچکا کر کہہ دیا۔ ''آج ہمارا انڈیپنڈنس ڈے ہے۔ میں اسے منا رہی ہوں۔ اس لیے تم اپنا منہ بند رکھو۔''

وہ تپانے والے انداز میں مسکرایا۔

''ٹھیک ہے، مگر اب تو سنا ہے بھارت سے دوستی ہو رہی ہے۔ امن معاہدے ہو رہے ہیں۔''

''سانپوں سے امن معاہدے نہیں کیے جاتے۔'' اس کی حب الوطنی اچھی خاصی تھی۔ کیمپ ٹو تک وہ نظریۂ پاکستان کے متعلق اس طرح کے کئی ارشادات سناتی آئی۔ خاصی مشکل اور بے حد عمودی تھی۔ برف کی حالت خراب تھی۔ وہ بے حد نرم اور پکڑنے پر ٹسکنے لگتی تھی۔

کیمپ ٹو پر برف کھود کر خیمے نصب کرنے کا سارا کام فرید اور افق نے کیا تھا۔ پریشے۔ لگ جانے کے بعد ان تمام کے اندر چند جھنڈیاں لگائی تھیں۔ جو وہ اسلام آباد سے اپنے تھی۔ وہ تو بڑا جھنڈا بھی لگانا چاہتی تھی، مگر شام ڈھلنے کے ساتھ ساتھ ہوا میں تیزی آ گئی۔ گورٹیکس کے ہیٹ لائنرز نے خیموں کے اندرونی ماحول کو خاصا گرم رکھا ہوا تھا، اس کے تیز چلتی برفیلی ہوا اتنی سرد تھی کہ خون منجمد ہونے لگا تھا۔ اوپر ویسے بھی آکسیجن بے حد کم تھی۔ تقریباً 6200 میٹر پر نصب تھا اور اس بلندی اور موسم میں وہ باہر جا کر بڑا جھنڈا لگا نہیں مول لے سکتی تھی، سو رات کا کھانا کھائے بغیر، بس چائے پی کر سو گئی۔ سطح سمندر بلندی پر ویسے بھی بھوک مر جاتی ہے۔

☆......☆......☆

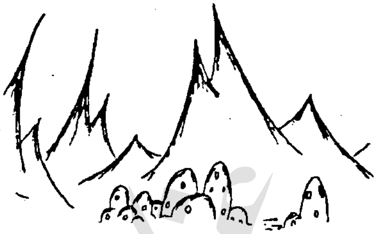

نویں چوٹی

پیر، 15 اگست 2005ء

وہ دونوں لاؤنج میں آمنے سامنے بیٹھے تھے۔ سیف کچھ دیر خاموش رہا، پھر بغیر کسی تمہید کے کہنے لگا۔ ''پری! میں جانتا ہوں تمہیں یہ سن کر دکھ ہوگا، مگر میں تم سے شادی نہیں کر سکتا۔ میں اپنے دوست کی بہن کو پسند کرتا ہوں اور یہ منگنی میں نے اپنی ماں کی خواہش پر کی تھی۔ اب بہت ہو چکا، میں یہ منگنی توڑنا چاہتا ہوں۔ تم بتاؤ، تم کیا کہتی ہو؟''

اور وہ کیا کہتی؟ اس کی تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

''بتاؤ پری! میں ماموں سے بات کروں؟'' وہ اس کے جواب کا منتظر تھا۔ پریشے کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

"سیف تم پلیز، یہ منگنی توڑ دو۔ تمہارا مجھ پر بہت بڑا احسان ہوگا۔" وہ کہنا چاہتی تھی
کیوں حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

"اٹھ بھی جائیں پری آپی! کب تک سوتی رہیں گی؟" کسی نے اسے جھنجھوڑا۔ وہ ہڑ
بیٹھی اور ارد گرد دیکھا۔

اس کا لاؤنج اور سیف، سب کچھ ہوا میں تحلیل ہو گیا تھا۔ وہ ان سے ہزاروں میل دور
کے برفیلے میدان میں نصب ایک خیمے کے اندر لیٹی تھی۔

"خدایا!" اس نے اپنی کنپٹی سہلائی۔ خواہشات اب خواب بن کر ستانے لگی تھیں۔

پھر وہ خاموشی سے تیار ہونے لگی۔ تیار ہو کر اس نے ناشتہ کیا، اور پھر آخر میں اپنے
نیچے کریمپنز چڑھائے اور گلیشئر گاگلز لگالیں۔ ارسہ قریب ہی بیٹھی کاغذوں کا پلندہ اپنے
میں ٹھونسنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔

"میرے پیک میں رسی ہے۔ اس لیے یہ پورے نہیں آرہے۔ آپ یہ اپنے والے
لیں۔" اس نے ارسہ کے ہاتھ سے کاغذ لے لیے۔ سامان سمیٹ کر کھڑی ہوئی تو گود سے
کی دو بیٹریاں گریں۔ وہ انہیں مٹھی میں دبوچے باہر نکل آئی۔

آسمان ابھی تک سیاہ تھا۔ رات تمام نہیں ہوئی تھی۔ پچھلی پوری شام سونے کے با
خاصی تازہ دم تھی، آسمان بھی صاف اور تارے دور دور تک جگمگا رہے تھے۔ آج بھی
صاف دن ہونا تھا۔

خیمے کے باہر برف پر افق اور فرید تیار کھڑے تھے۔ افق جھک کر جوتوں کے تسمے بند کر ر
اس کے عقب میں آئی اور اس کی پشت پر بندھے رک سیک کے ایک خانے میں دونوں بیٹر
کر زپ بند کر دی۔ صرف بیٹری رکھنے کو اس میں دوبارہ اپنا بیگ کھولنے کی ہمت نہیں تھی۔

"صاب! ایک بات کہوں؟" سر پر ٹوپی درست کرتے ہوئے فرید نے افق کو مخا

"صاب میری بات مانو تو آگے نہ جاؤ۔ یہ شمال مغربی رج آج تک کوئی سر نہیں کر سکا۔"

"افق ارسلان کر لے گا۔ تم فکر مت کرو۔" اس نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔
نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ حد سے زیادہ خود اعتماد اور ہٹ دھرم تھا۔

"صاب موسم خراب ہو جائے گا۔"

"آسمان تو صاف ہے۔"

"صاب وہ شمال میں ستاروں کا جھنڈ دیکھ رہے ہو؟ یہ ستارے میں نے کبھی اس مہینے میں
ی کے آسمان پر نہیں دیکھے، یہ اچھی پیشین گوئی نہیں کرتے۔ آپ ڈمانی کو ہم ہنزہ و کشر سے زیادہ
ں جانتے۔"

"ہمارے پاس اتنا فیول اور گیئر نہیں ہے کہ ہم بیٹھ کر انتظار کرتے رہیں۔" پینٹ جھاڑتے
ئے وہ سیدھا ہو گیا۔ فرید بھی چپ ہو گیا۔

وہ اسی طرح خاموشی سے سر جھکائے کھڑی تھی۔ اچانک اس کے سر کے پیچھے کوئی نوکدار چیز
رے لگی۔ وہ گھبرا کر پلٹی، تین پہاڑی کوؤں (raven) نے اس پر حملہ کر دیا تھا۔ اس نے زور
سے سر پر ہاتھ مارا، وہ اڑ گئے۔ اس نے ان کو دیکھتے ہوئے سر کا پچھلا حصہ سہلایا، جہاں انہوں نے
چونچیں ماری تھیں۔

"کیا ہوا؟ تم ٹھیک ہو؟" افق قدرے فکر مندی سے اس کے قریب آیا۔ وہ اسی طرح عجیب
نگاہوں سے دور سیاہ آسمان پر اڑتے کوؤں کو دیکھتی رہی۔

"پریشے! کیا ہوا؟" اس نے دوبارہ پوچھا۔

اس نے چونک کر سر جھٹکا۔ "کچھ نہیں۔ یونہی کچھ یاد آ گیا تھا۔"

اس نے دوبارہ سر جھٹکا اور بھلانے کی کوشش کی جو یاد آیا تھا۔ ٹھیک چھ سال پہلے جس دن
اس کی مما کی وفات ہوئی تھی، اس روز بھی صبح جاگنگ کے دوران اس پر یونہی کوؤں نے حملہ کر دیا
تھا۔ وہ بھی ایسے ہی پہاڑی کوے تھے۔ پتا نہیں کیوں، اس کو عجیب سی گھبراہٹ ہونے لگی۔

ارسہ کان پر فون لگائے بولتے ہوئے خیمے سے باہر آئی۔ "جی جی بالکل، میں کیمپ تھری پہنچ
کر پاپا سے بات کر لوں گی۔ جی شیور۔ او کے ٹیک کیئر۔ لو یو مام۔ بائے۔" اس نے سیٹلائٹ فون
بند کر کے پری کو تھمایا اور خود سر پر ہیلمٹ جوڑنے لگی۔ اس وقت پریشے کا دل چاہا کہ وہ بھی پاپا سے
بات کرلے، مگر اس کے پاس ان کا کوئی نمبر نہیں تھا۔ اس نے خاموشی سے فون بیگ میں رکھ دیا۔

"ہمیں جلد از جلد کیمپ تھری پہنچنا ہے۔ آج رسیاں آپس میں نہیں باندھیں گے، کیوں کہ
ایسے ہماری رفتار سست ہو جائے گی۔ چلو نا پری! تم کیا سوچ رہی ہو؟" اسے کلائمنگ ہیلمٹ ہاتھ
میں پکڑے گم صم کھڑے دیکھ کر وہ جاتے جاتے پلٹا۔ اس نے قدرے سوچتی، متذبذب نگاہوں
سے اسے دیکھا۔

"افق...... فرید ٹھیک کہہ رہا ہے۔ آسمان پر ستاروں کا جھنڈ اور یہ کوؤں کا حملہ، یہ بری

علامتیں ہیں۔"

"کیا ہیری پوٹر بہت پڑھنے لگی ہو؟" وہ مسکرایا۔

"افق میں سیریس ہوں۔ یہ اَن کلائمبڈ رج ہے۔ موسم کو دیکھو، چند گھنٹوں تک برف شروع ہوگئی تو......؟"

"میں انفرہ سے ہنزہ اس لیے نہیں آیا تھا کہ برف باری سے ڈر کر بیس کیمپ میں چھپ جا

"پتا نہیں کیوں، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ میری چھٹی حس ہے یا کچھ اور، میرا خیال ہے ہمیں نہیں کرنا چاہیے۔ آج کے دن کا آغاز ہی بدشگونی سے ہوا ہے۔" جانے کیوں اس کا دل گھبرا رہا

وہ چند لمحے بے حد سنجیدگی سے اس کا چہرہ دیکھتا رہا، پھر بولا "بدھ مت کے بھکشو نیپال والے سیاحوں کے متعلق کہا کرتے تھے۔ صاحبوں کو جانے دو جہاں ان کا دل کرے، مگر نہیں کہ وہ بدھا کا مسکن ہوتی ہیں۔ بدھا کے پیروکار ایورسٹ کو (Chomolungma) یعنی Mothergoddess of the world اور "ساگر ماتا" کہا کرتے تھے اور آج کہتے ہیں۔ چھ نسلوں پہلے کے شرپا، ساگر ماتا کی چوٹی پر قدم رکھنا گناہ سمجھتے تھے۔ ان خیالات تب بدلے جب تینزنگ نے سر ایڈمنڈ ہیلری کے ساتھ ایورسٹ سر کیا۔ یقین کر وقت اتنی توہم پرست باتیں کرتی تم مجھے بدھ مت کی کسی مٹھ میں رہنے والی راہبہ لگ رہی

اس کا انداز اتنا قطعی اور منطقی تھا کہ وہ کچھ کہہ ہی نہ سکی۔ حالاں کہ کہنا چاہتی تھی کہ مجھے توہم کہو یا جو بھی، میں اور آگے نہیں جانا چاہتی۔

"پری آپی! اگر ہم یہ رج سر لیں تو ہمارا نام گینز بک آف ورلڈ ریکارڈز میں لکھا جائے گا"

ان دونوں نے کسی بات کی گنجائش نہیں چھوڑی تھی۔ اب اگر وہ ان کے ساتھ نہ چلتی تو اس کی بزدلی شمار کرتے۔ وہ کسی ریکارڈ بک میں نام نہیں لکھوانا چاہتی تھی، وہ ادھر راکاپو کرنے بھی نہیں آئی تھی، وہ تو خود تسخیر ہو کر اپنے فاتح کو لینے آئی تھی اور اس وقت جس طرح دل کسی انہونی کے باعث گھبرا رہا تھا، وہ بالکل بھی جانا نہیں چاہتی تھی، مگر...... ٹھہرنا اس کی خلاف تھا۔

وہ ان کے آگے چل رہا تھا۔ اس کے قدموں سے بننے والے نشانات پر قدم رکھتی جھکائے خاموشی سے اس کے پیچھے آرہی تھی۔ اس کا تنفس تیز تیز چل رہا تھا اور قدموں موجود گلیشیئر کے اندر سے سلائیڈنگ کی آوازیں بخوبی سنائی دے رہی تھیں۔

اس کی مسلسل خاموشی محسوس کر کے وہ کہنے لگا، "ارسہ! تمہارے ناول کا نام کیا ہوگا؟ دی راکاپوشی کلائمب؟ یا پھر راکاپوشی دی اَن کلائمبڈ رج یا پھر ان ٹوتھن ائیر آف راکاپوشی۔"

وہ مشہور کتابوں کے نام بگاڑ رہا تھا۔ ارسہ ہنس دی۔

"خیر، میرے ناول کا نام خاصا مختلف ہے۔"

"کیا ہے؟"

"جب چھپ جائے تو پڑھ لیجیے گا۔" ارسہ اپنے ناولوں کے متعلق خاصی شرمیلی تھی۔

وہ ہنوز خاموشی سے جھک کر برف پر آئس ایکس مارتے ہوئے چل رہی تھی۔ وہ جانتا تھا کہ اس نے پری کی بات نہیں مانی، سو اس کا موڈ ٹھیک کرنے کو پوچھنے لگا۔

"کھانسی ٹھیک ہے تمہاری؟ تم کل شام نیند میں کھانس رہی تھیں۔"

"ہاں۔ اب ٹھیک ہے۔" وہ مختصراً کہہ کر چپ ہوگئی۔

"موسم صاف ہو تو راکاپوشی کی چوٹی سے میلوں دور تک پھیلے پہاڑ سلسلے نظر آتے ہیں۔" وہ اپنے تئیں اسے summit کرنے کی ترغیب دلا رہا تھا۔

"اچھا۔"

"میں تو یہاں اس کی چوٹی پر کھڑے ہو کر کنکورڈیا اور بلتورو کی چوٹیاں دیکھنے ہی آیا ہوں۔"

وہ اسے کیا بتاتی کہ جس پہاڑ کے حسن کی وہ دیوانی تھی، آج پہلی بار اسے اس سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ (خدا کرے "برو" سوتا رہے اور اسے علم نہ ہو کہ کوئی دبے قدموں اس کی اقلیم میں داخل ہو رہا ہے)۔

وہ نیچے برف کو بغور دیکھتی احتیاط سے قدم رکھ رہی تھی۔ برف کے ایک قطعے پر وہ پاؤں رکھنے والی تھی کہ ایک دم اس نے قدم چند فٹ آگے رکھتے ہوئے اس ٹکڑے کو پھلانگا، پھر مڑ کر بغور اس جگہ کو دیکھا۔ یونہی اسے شک سا ہوا تھا کہ اس کے اندر پہاڑوں کی کوئی درز (crevasse) چھپی تھی۔

"کیا ہوا؟" وہ اس سے چند قدم آگے تھا، اسے رکتے دیکھ کر خود بھی رک گیا۔

"کچھ نہیں۔ تم ایک بات تو بتاؤ۔" وہ سر جھٹک کر دوبارہ چلنے لگی۔ ہوا قدرے تیز ہوگئی تھی اور ہلکی ہلکی برف گرنے لگی تھی۔ اس نے ہیڈ لیمپ آن کر لیا۔ "راکاپوشی کی چوٹی سے کون کون سے پہاڑ نظر آتے ہیں؟"

"بہت سے۔" افق نے شانے اچکائے۔

"مثلاً؟"

"مثلاً کے ٹو یا شاہگوری۔" شاہگوری بلتی زبان میں پہاڑوں کے بادشاہ کو کہتے تھے۔

"اور؟"

"اور میشر بروم اور گیشر بروم کی چوٹیاں۔"

"اور؟"

"اور براڈ پیک اور کنکورڈیا کے دوسرے پہاڑ۔"

"اور؟"

"راکاپوشی سلسلے کے دوسرے پہاڑ، ہراموش اور دُمانی۔"

"اور؟"

"اور نانگا پربت۔"

"اور؟"

"فکر نہیں کرو۔ تمہارا گھر نہیں نظر آتا۔" اس کی مسلسل "اور۔ اور" کی تکرار پر وہ چڑ کر بولا۔ وہ بدمزہ سی ہو گئی۔ "ہر وقت سڑے رہا کرو تم۔"

"اچھا" وہ مسکراتے ہوئے پلٹا، پھر دستانے والا ہاتھ اس کی جانب بڑھایا، جسے پریشے نے آگے بڑھ کر تھام لیا۔ افق نے اس کا ہاتھ قدرے کھینچ کر اپنے قریب کیا۔ "یہ اس لیے کہ اگر گریں تو اکٹھے گریں۔" وہ اتنی سنجیدگی سے بولا کہ پریشے کی ہنسی چھوٹ گئی۔ ہنستے ہنستے اس نے سر کو جنبش دی۔ قریباً تیس میٹر کے فاصلے پر ارسہ آ رہی تھی۔ اس کا ہیڈ لیمپ آف تھا۔ اس کے عقب میں فرید تھا۔ اس نے گردن واپس موڑ لی۔ وہ اور افق ہاتھ تھامے چاندنی میں نہائے راکاپوشی پر قدم بڑھانے لگے۔

اسی اثناء میں اس کے عقب میں دھماکا ہوا۔ وہ دونوں گھبرا کر پلٹے۔ پیچھے میلوں دور تک چاندنی سے چمکتی برف پھیلی تھی اور چند میٹر دور ایک لمبا سا گڑھا تھا۔ پہلے تو اسے سمجھ میں نہیں آیا کہ ایک لمحے میں کیا ہوا ہے اور جب سمجھ میں آیا تو......

"اوہ میرے خدا...... ارسہ پہاڑوں کی کسی درز میں گر گئی ہے۔" وہ بوکھلا کر واپس بھاگی۔

"ارسہ...... ارسہ!" وہ دوڑتے ہوئے گڑھے کے قریب آئی۔ گڑھے کے اندر گہرا اندھیرا

"ارسہ...... تم ٹھیک ہو؟" گڑھے کے قریب دوزانو ہو کر اس نے اندر جھانکا۔ وہاں مہیب اندھیرا اور تاریکی تھی۔ اس کو اپنا دل بند ہوتا محسوس ہوا۔

افق بھاگتا ہوا اس تک آیا۔ فرید چند قدم دور تھا۔

"افق کچھ کرو۔ پلیز افق۔ وہ گر گئی ہے...... اسے باہر نکالو۔" افق کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے اس کے لبوں سے بے ربط فقرے ادا ہو رہے تھے۔

"میں کرتا ہوں کچھ۔" اس نے اپنی ہیلمٹ پر لگے سرچ بلب سے گڑھے میں روشنی ڈالی۔ فرید بھی اندر روشنی کرنے لگا۔ اب وہ دونوں اسے آوازیں دے رہے تھے۔ "ارسہ...... تم ادھر ہو؟ ارسہ جواب دو۔" وہ اسے پکارتے رہے۔ ہیڈ لیمپ کی روشنی شگاف میں ڈالتے رہے، مگر اندر چند میٹر برف کے علاوہ کچھ نظر نہ آتا تھا۔ پریشے کے جسم سے جان نکل رہی تھی۔ وہ جواب کیوں نہیں دے رہی۔ وہ بولتی کیوں نہیں ہے؟ شاید اس سے بولا نہ جا رہا ہو۔ وہ ٹھیک ہو گی۔ اسے کچھ نہیں ہوا ہو گا۔ ابھی افق اسے باہر نکال لائے گا۔ وہ خود کو تسلیاں دے رہی تھی، مگر اس کا دل گھبرا رہا تھا۔

"ارسہ پلیز جواب دو۔ تم ٹھیک ہو؟" وہ کتنی ہی دیر اسے آوازیں دیتا رہا۔ اس کا گلا بیٹھ گیا تھا اور آواز پھٹ رہی تھی، مگر پہاڑ کی تاریک، عمیق درز (crevasse) بالکل خاموش تھی۔ ہلکی سی کراہ، کمزوری کھانسی، زندگی کی کوئی رمق اس درز (crevasse) میں نہیں تھی۔

برف گرنے لگی۔ ہوا کا زور زیادہ ہو گیا۔ افق اور فرید جھک کر ارسہ کو آوازیں دیتے رہے۔ دونوں کے ہیلمٹ اور چہروں پر برف کے ذرات لگے تھے۔ مگر درز (crevasse) سے کوئی جواب نہ آیا۔ پریشے کا دل ڈوب رہا تھا۔

"افق کچھ کرو پلیز۔" اس کا جیسے سانس رک رہا تھا۔ ارسہ کتنی دیر سے اس عمیق درز (crevasse) میں منوں برف تلے دبی ہو گی، اس کا سانس بھی ایسے ہی بند ہو رہا ہو گا۔ اس تصور سے ہی اس کی روح تک کانپ گئی۔

افق اور فرید تھک ہار کر خاموشی سے گڑھے کے کنارے بیٹھ گئے۔ ان کی خاموش صورتیں پریشے کو ہولا رہی تھیں۔

"تم دونوں ایسے کیوں بیٹھے ہو؟ اسے نکالتے کیوں نہیں ہو؟ افق جواب دو، میں تم سے کچھ پوچھ رہی ہوں۔" اس نے اس کا کندھا زور سے ہلایا۔

افق نے سر اٹھایا۔ وہ گلیشیئر گاگلز اتار چکا تھا۔ اس کے سر، ناک، آنکھوں اور چھوٹی چھوٹی

بڑھی شیو میں برف کے ذرّات پھنسے تھے...... اس نے دھیرے سے نفی میں گردن ہلائی۔ نہیں خیال۔ اب کوئی امید ہے۔ وہ اب تک مر چکی ہو گی۔"

کرنٹ کھا کر پریشے نے اس کے کندھے سے ہاتھ ہٹایا۔

"نہیں ...... تم ...... تم غلط کہہ رہے ہو۔ وہ کیسے ......؟ نہیں ......" وہ بے یقینی سے نفی میں رہی تھی۔ "تم، تم دیکھو تو سہی افق! وہ اندر ہی ہو گی۔ اس کا سانس گھٹ رہا ہو گا۔ وہ مدد کے لیے رہی ہو گی۔ ہواؤں کے شور سے اس کی آواز یہاں تک نہیں پہنچ رہی ہو گی۔ تم ...... تم تو سہی ......" کسی موہوم امید کے تحت اس نے کہا۔

"وہ نہیں ہے پریشے ......" کسی تھکے ہارے شکست خوردہ سپاہی کی مانند اس نے مایوسی سے ہلایا۔ "وہ ہوتی تو جواب دیتی۔ اوہ خدایا۔" وہ سر دونوں ہاتھوں میں لیے خود بھی بے یقین سا تھا۔

پریشے نے استعجاب اور خوف سے نفی میں گردن کو جنبش دی۔

"نہیں افق ...... تم ......" اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔ افق کیا کہہ رہا تھا، اسے سمجھ میں نہیں تھا۔ اس کا ذہن ماؤف ہو چکا تھا۔ بھلا ارسہ کیسے مر سکتی تھی؟

"ابھی ...... ابھی تو وہ ہمارے ساتھ چل رہی تھی ...... بالکل ابھی میں نے اسے برف کھڑے دیکھا تھا ...... وہ بالکل ٹھیک تھی ...... تم ...... تم ایسے کیوں؟ وہ ...... نہیں ......" اس کا رہا تھا۔ چاندنی میں نہائی ہراموش اور دُمانی کی چوٹیاں اسے گھومتی دکھائی دے رہی تھیں۔ آوازیں آنا بند ہو گئی تھیں۔ سب کچھ خواب سا لگ رہا تھا۔

پھر اس نے افق کو اُٹھتے دیکھا۔ فرید اسے منع کر رہا تھا، مگر وہ پھر بھی اپنی ہارنس کے گرد باندھ کر اس گہرے شگاف میں اُتر رہا تھا۔ رسی کا ایک سرا فرید کے ہاتھ میں تھا، وہ آہستہ آہستہ چھوڑ رہا تھا۔ شاید رسی کہیں سے اینکر بھی کر رکھی تھی۔ وہ اب نیچے اتر چکا تھا۔

"پانچ میٹر کھودا ہے۔ وہ نہیں ہے۔" گڑھے میں سے آواز آئی۔ وہ آواز اسے بہت اجنبی تھی۔ اس کا ذہن مکمل طور پر مفلوج ہو چکا تھا۔

بھلا ارسہ کیسے مر سکتی تھی؟ ابھی ایک منٹ پہلے تو اس نے ارسہ کو اپنے عقب میں آتے تھا۔ بس ایک لمحے میں اس کا پاؤں درز (crevasse) کے اوپر برف کی تہ پر پڑا گلیشیر نیچے گری، ہزاروں من برف اس کے اوپر گرتی چلی گئی، اس کا سانس رک گیا اور وہ دم گھٹنے سے برف میں دفن ہونے سے مر گئی۔ بس ایک لمحے کا عمل تھا اس کے دل کے اندر کہیں بہت زور

درد ہوا تھا۔ درد کی شدت بڑھی تو اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ آسمان مسلسل برف کے ننھے ننھے گالے برسا رہا تھا۔

چوٹی اس جگہ سے نظر نہیں آتی تھی، مگر یقیناً وہ بادلوں کے ہالے میں چمک رہی ہو گی۔ رات کے اس پہر "برو" جاگ اٹھا تھا اور اسے علم ہو چکا تھا کہ کوئی دبے قدموں اس کی راجدھانی میں داخل ہو رہا تھا۔

افق واپس آ چکا تھا۔ اس کے قریب کھڑے ہوتے ہوئے وہ سردی میں ٹھٹھر رہا تھا، تیز تیز سانسوں کے درمیان وہ کچھ کہہ بھی رہا تھا۔

"تم ...... تم افق!" وہ جھٹکے سے کھڑی ہوئی اور اس کی جیکٹ کا کالر زور سے پکڑ کر کھینچا۔ "میں نے کہا تھا تم سے کہ واپس چلتے ہیں، مگر تم نہیں مانے۔ تمہیں اوپر جانا تھا، ہر قیمت پر اور وہ ...... وہ مر گئی افق ...... ارسہ مر گئی ......! کر لی تم نے summit؟ بنا لیا تم نے ورلڈ ریکارڈ، ہاں؟ بولو ...... بالکل ابھی تو اس نے اپنی ماں سے بات کی تھی۔ باپ سے اس نے کیمپ تھری جا کر بات کرنی تھی۔ اس کا باپ اس کی کال کا انتظار کر رہا ہو گا ...... اسے نکالو افق، اسے باہر نکالو ...... تمہیں اللہ کا واسطہ افق! اس کا باپ اس کی کال کا انتظار کر رہا ہو گا ......" اس کا گریبان پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے غم و غصے سے اس پر چلاتے ہوئے اسے پتا بھی نہیں چلا اور کب وہ اس کے کندھے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔

وہ خاموشی سے سر جھکائے کھڑا رہا۔ اتنا بھی نہیں کہا کہ ارسہ خود اوپر جانا چاہتی تھی۔

"وہ ...... وہ میری چھوٹی بہن تھی افق ...... اتنی ٹیلنٹڈ، اتنی ذہین۔ اور ...... اور اس ظالم پہاڑ نے اسے مجھ سے چھین لیا؟" وہ اس کے کندھے پر سر رکھے بچوں کی طرح بلک بلک کر رو رہی تھی۔

افق نے اس کے شانوں کے گرد بازو رکھ کر ہولے سے اس کا سر تھپکا۔

"ریلیکس پریشے، ریلیکس!"

مگر وہ ریلیکس نہیں ہو سکتی تھی۔ اس نے زندگی میں پہلی دفعہ ایک دوست کو اپنے سامنے پہاڑ میں دفن ہوتے دیکھا تھا۔ وہ مسلسل روئے جا رہی تھی۔ برف ان دونوں پر گر رہی تھی۔ فرید کچھ ہی دور خاموشی سے گردن جھکائے بیٹھا تھا۔

"افق! اسے باہر نکالو، مجھے اسے دیکھنا ہے۔ خدا کے لیے افق! ہم ارسہ کے ساتھ آئے تھے، ہمیں اس کے ساتھ ہی واپس جانا ہے۔"

"ریلیکس پری ...... اب کچھ نہیں ہو سکتا ...... میں اس کی باڈی لینے گیا تھا ابھی، مگر وہ کہیں

بہت نیچے ہے۔" وہ اسے چپ کرانے کی کوشش کر رہا تھا، مگر وہ خود پرسکون نہیں تھا۔ اس کا ٹوٹا ہوا تھا، مگر جانے وہ کیسے ضبط کر رہا تھا۔

"کم ان بیس کیمپ۔" اپنے کندھے کے پیچھے ہاتھ بڑھا کر اس نے ریڈیو نکالا اور بٹن دبایا۔ دوسرا بازو ابھی تک پریشے کے شانوں کے گرد تھا۔

ریڈیو میں شور سا سنائی دیا، پھر ترک میں کچھ اکتاہٹ بھرے الفاظ......

"میری بات غور سے سنو احمت! ارسہ بخاری از ڈیڈ۔ میں دہراتا ہوں، ارسہ بخاری وہ ایک شگاف میں گر گئی ہے۔ اس کی موت کنفرم ہے، مگر باڈی ریکور کرنا بہت مشکل ہے۔ ہمیں جلد از جلد کیمپ تھری تک جانا ہے۔ یہاں برف پڑ رہی ہے، ہم رک نہیں سکتے۔ ڈو یو

"اوہ گاڈ......یس آئی کاپی!"

افق نے ٹرانسیور بند کر کے بیگ میں رکھ دیا۔ پریشے ابھی تک اسی طرح رو رہی تھی۔ اس نے افق کا بازو سختی سے یوں پکڑ رکھا تھا، جیسے کوئی چھوٹا بچہ بھرے میلے میں گم ہو جانے کے ڈر سے انگلی پکڑتا ہے۔ وہ بہت خوف زدہ تھی۔ افق نے آہستگی سے اس کا سر تھپکا۔

"شش۔ اب رونا نہیں ہے۔ اپنے آپ کو سنبھالو۔ ہمیں کیمپ تھری جانا ہے۔"

"نہیں افق!" اس کی آنکھوں سے آنسو پھر سے گرنے لگے۔ "میں ارسہ کو چھوڑ کر......"

"پریشے پاگل مت بنو......ہم یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔"

"مگر اس کی ڈیڈ باڈی......" یہ لفظ کہنا بھی دشوار تھا۔

"وہ ری کور کرنا مشکل ہے۔ زیادہ رسی بھی نہیں ہے میرے پاس......ساری رسی تو ار پاس تھی۔ باڈی ہم واپسی پر ری کور کر لیں گے۔" اس نے اپنے بھاری دستانے والے ہا پریشے کے چہرے پر گرتے آنسو اور برف صاف کیے۔

"تم......تم بعد میں نکالو گے ناں اسے؟" اس کی بھیگی آنکھوں میں موہوم سی امید چمکی۔

"ہاں......واپسی پر......ٹھیک؟ اب چلو......"

"مجھ میں ہمت نہیں ہے۔" اس کی ٹانگیں بے جان ہو رہی تھیں۔

"ہمت کرو پری! بہادر بنو۔ اپنے لیے نہیں تو میرے لیے۔" افق نے اسے سہارا دے دونوں کندھوں سے ابھی تک تھام رکھا تھا۔ پریشے نے بھی مضبوطی سے اس کا بازو پکڑ رکھا نے اپنا وزن افق پر ڈال رکھا تھا اور پھر بہت نڈھال سی وہ اس کے ہمراہ قدم بڑھانے لگی۔

کی آنکھوں سے نکل کر گردن پر لڑھک رہے تھے۔

اس نے زندگی میں کبھی یہ تصور نہیں کیا تھا کہ ایک لمحہ ایسا بھی آئے گا جب اسے اپنی بہت اچھی دوست کو برف میں چھوڑ کر جانا پڑے گا۔ اس شگاف کے دہانے سے پلٹنا اور آہستہ آہستہ برستی برف باری میں کیمپ تھری کی طرف قدم بڑھانا بہت کٹھن تھا، اس کے قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ افق نے اسے سہارا دیا ہوا تھا۔ اگر وہ نہ ہوتا تو شاید وہ اسی شگاف کے آس پاس راستہ بھٹک کر برف پر گر چکی ہوتی یا شاید کسی شگاف میں گر کر مر چکی ہوتی۔

☆......☆......☆

اس رات کیمپ تھری میں وہ دونوں گھنٹوں خاموشی سے بیٹھے رہے اور پھر جب رات تاریک ہوتی چلی گئی تو وہ باتیں کرنے لگے۔ طیب اردگان کی باتیں، عراق جنگ کی باتیں، ترک ملٹری کی باتیں، نیٹو اور SCO بلاکس کی باتیں، انہوں نے بلاتکان صرف ایک "بات" سے بچنے کے لیے دنیا کے ہر موضوع پر بات کی کہ شاید دکھ کم ہو، شاید ڈپریشن اور نفسیاتی اثر قدرے زائل ہو، مگر سب کچھ ویسا ہی تھا۔

احمت کی بیوی سلمٰی نے ارسہ کے والدین کو انگلینڈ میں اطلاع کر دی تھی۔ پریشے رات بھر ان والدین کے متعلق سوچتی آئی تھی، جانے کیا گزری ہوگی ان پر؟ کیسے سنا ہوگا انہوں نے اس خبر کو؟

رات کو اس کے سلیپنگ بیگ کے قریب جگہ بہت خالی تھی۔ افق اپنے خیمے میں سونے جا چکا تھا۔ وہ ارسہ اور ارسہ کی باتوں کو یاد کر کے پھر سے رونے لگی۔ وہ کتنی اکیلی رہ گئی تھی اور شاید اس اندھے شگاف میں گری ارسہ اس سے زیادہ اکیلی ہوگی۔ وہ محسوس نہیں کر سکتی تھی۔

تب اس نے اپنے بیگ سے ارسہ کے کاغذات نکالے اور انہیں ترتیب سے جوڑا۔ سیاہ روشنائی سے انگریزی میں لکھے صفحے بھرے ہوئے تھے۔ لکھائی خاصی رف تھی اور جگہ جگہ سے کاٹا گیا تھا مگر پڑھ سکتی تھی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ کہانی ادھوری تھی۔

اس نے پہلے صفحے پر نگاہ ڈالی۔ "قراقرم کا تاج محل" موٹے مارکر سے انگریزی میں لکھا تھا۔

ہنزہ کے باسی راکاپوشی کو "ہنزو کشر تاج محل" یا "قراقرم کا تاج محل" کہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ برف سے ڈھکی راکاپوشی کی "چمکتی دیوار" آگرہ کے تاج محل جیسی سفید اور حسین دکھائی دیتی تھی۔ پریشے کو ان سے اختلاف تھا۔ اس کا خیال تھا، راکاپوشی کی چمکتی دیوار آگرہ کے تاج محل سے زیادہ سفید اور حسین دکھتی تھی۔

اس نے پڑھنا شروع کیا۔ وہ اس ادھورے ناول کے رف لکھے گئے مسودے کو بغیر رُکے پڑھ سکتی تھی۔

☆......☆......☆

منگل، 16 اگست 2005ء

"صاب، اوپر سارا اسنو فیلڈ ہے۔"

وہ دونوں خاموشی سے خیموں کے آگے بیٹھے تھے، جب فرید ان کی طرف آیا۔ وہ آج کو کے لیے نہیں گئے تھے۔ ان کے ذہنوں کو کل کے واقعے کو وقتی طور پر بھلانا تھا، جس کے لیے ایک دن کا ریسٹ چاہیے تھا۔ فرید البتہ کچھ مخصوص مقامات پر رسیاں لگا آیا تھا۔

"پھر؟" افق نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"تم مانو یا نہ مانو، اوپر سارا اسنو فیلڈ ہے اور برف تازہ گری ہے۔ اس کا گلیشیر کسی بھی پھٹ سکتا ہے اور جب برف گرے گی تو تم بھی مرے گا اور ہم بھی۔ سو ہم تم کو ابھی سے بتا رہا ہم سویرے واپس چلا جائے گا۔"

"مگر فرید تم نے تو کیمپ فور تک ہمارے ساتھ جانا تھا۔"

"صاحب تم کل خود کیمپ فور تک چلے جانا۔ ہم نہیں جائے گا۔ بس ہم نے تم کو بتا دیا"

وہ کسی اڑیل گھوڑے کی طرح ضد پر اڑ چکا تھا۔

"فرید، دیکھو ہم بھی تو اوپر جا رہے ہیں۔" پریشے نے اسے سمجھانے کی کوشش کی، "ہم رہے ہیں؟"

"باجی تم پاگل ہو، ام ابھی پاگل نہیں ہوا۔ تمہارے دونوں کے باپ کے پاس بہت ہے، تم اُدر مر بھی جاؤ تو تمہارا بچہ بھوکا نہیں مرے گا جب کہ اُدر ہمارا باپ کریم آباد میں ا زمین بھی نہیں چھوڑ کر گیا ہمارے لیے۔ ہمارے حال پر رحم کرو باجی، تمہیں اوپر جا کر کچھ نہیں ملے گا۔ میری مانو تو تم بھی واپس چلو۔" پریشے اور افق نے نگاہوں کا تبادلہ کیا، پھر شانے اچکا دیے۔

"تمہاری مرضی!" وہ سر جھٹک کر دوسری جانب دیکھنے لگا۔ ماتھے پر ناگواری کی لکیریں آئی تھیں۔ "میں نے نانگا پربت کا سولو کلائمب کیا تھا۔ مر نہیں گیا تھا میں پورٹر کے بغیر صرف لڑکیوں کے لیے...... ٹھیک کہتی تھی وہ عورت تم پورٹرز کے بارے میں۔" وہ بڑبڑایا۔

...رہا تھا۔

"صاب، وہ عورت جھوٹ کہتی تھی۔" پھر پریشے کی کنفیوز شکل دیکھ کر بولا، "باجی ادھر ایک ...ین عورت گیشر بروم ٹو سر کرنے آئی تھی۔ ہمارے ماموں کا لڑکا ادھر بلتستان میں رہتا ہے۔ وہ ...کے ساتھ پورٹر بن کر اس اکیلی کو گیشر بروم ٹو کی چوٹی تک لے کر گیا تھا۔ بعد میں جب وہ نیچے ...تو اخبار والوں کو بولی کہ میں نے سولو کلائمب کیا، میرا پورٹر تو مجھے کیمپ تو میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ...ہمارے ماموں کا لڑکا، بے چارہ غریب آدمی ہے، چپ کر کے بیٹھ گیا۔ پر صاب، وہ عورت جھوٹ بولتی تھی، اس کو سچا خیال مت کرنا۔ اس کا فیصلہ گیشر بروم ٹو نے کیا تھا۔ پہاڑوں کا اپنا عدالت ہوتا ہے۔ وہ عورت اگلے سال پھر گیشر بروم ٹو سر کرنے آئی، پہاڑ نے واپس جانے نہیں دیا۔ اس کی تو لاش بھی نہیں ملی۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔ تم جاؤ پھر۔" افق اپنے سابقہ لہجے میں بولا۔

"صاب، ہم نے کیمپ فور پہنچانے کے پیسے لیے تھے۔ رسیاں وسیاں سب لگا دیا ہے۔ آگے تم جانو، تمہارا کام۔"

افق جواب میں کچھ بڑبڑا کر رہ گیا۔ وجہ یہ نہیں تھی کہ فرید انہیں چھوڑ کر جا رہا تھا، وجہ یہ تھی کہ وہ صرف خفا خفا سا تھا یا شاید حد سے زیادہ دباؤ میں۔

☆......☆......☆

دسویں چوٹی

بدھ، 17 اگست 2005ء

آج صبح سے موسم شدید خراب تھا اور موسم سے زیادہ افق کا موڈ خراب تھا۔ وہ کتنی
پریشے کے سامنے میٹ پر چت لیٹا، ایک بازو ماتھے پر رکھے خیمے کی چھت کو گھور رہا تھا۔ شیڈول کے
مطابق آج انہیں کیمپ فور میں ہونا تھا مگر قراقرم کا اپنا شیڈول تھا۔

خیمے کے باہر طوفانی جھکڑ چل رہے تھے جن سے خیمے کا گورٹیکس پھڑ پھڑا رہا تھا۔
جگہوں سے سرد ہوا اندر داخل ہو کر ان کو ٹھٹھرا رہی تھی۔ برف کی مسلسل اوپر سے نیچے سلائیڈ
خیمے کی دیواریں کمپریس ہو رہی تھیں۔

''فرید صبح منہ اندھیرے ہی بغیر بتائے چلا گیا۔'' اس نے یونہی بولنے کی غرض سے کہا۔

''بتا بھی دیتا تو میں نہ روکتا۔'' وہ اسی طرح چت لیٹا اوپر دیکھتا رہا۔

''وہ ٹھیک کہتا تھا افق! ہم دونوں پاگل ہیں۔ سب کوہ پیما پاگل ہوتے ہیں۔ گھروں کا سکون
چھوڑ کر یہ فانی وادیوں میں نکل جاتے ہیں اور آخر میں مرجاتے ہیں۔''

''لوگ ویسے بھی تو مرجاتے ہیں۔ روڈ ایکسیڈنٹ میں، لفٹ میں پھنس کر دم گھٹنے سے کسی
بم دھماکے یا بم بلاسٹ میں۔ تم مسلمان نہیں ہو؟ تمہارا ایمان نہیں ہے کہ جہاں موت آنی ہے،
وہاں آجائے گی، کبھی موت بھی ٹلی ہے کیا؟''

پریشے نے ایک اچٹتی نظر اس پر ڈالی جو بغیر پلکیں جھپکائے چھت کو گھور رہا تھا اور پھر تھک کر
خیمے کی دیوار سے سر ٹکا دیا۔ سامنے والی دیوار کے دوسری طرف برف اکٹھی ہو رہی تھی۔

''پھر بھی افق! کیا مل جاتا ہے پہاڑوں پر جا کر؟ اتنی مشقت کر کے؟''

''یہ بات ہمیشہ وہ کاہل ترین لوگ کہا کرتے ہیں، جن سے روز ایک گھنٹہ لان میں واک بھی
نہیں ہوتی۔ یہ ''بھلا کیا رکھا ہے پہاڑوں میں'' والا فقرہ ان لوگوں کے منہ سے نکلتا ہے، جن کے
لیے انگور ہمیشہ کھٹے ہوتے ہیں۔'' وہ تلخی سے بولا۔

''پھر بھی، زندگی نارمل طریقے سے بھی گزاری جا سکتی ہے۔'' وہ شاید بحث کے موڈ میں تھی۔

''نارمل طریقہ کیا ہے؟ گھنٹوں فون پر رشتے داروں کی برائیاں کرنا، نت نئے بے ہودہ فیشن
اپنانا، غیر حقیقی فلموں کے غیر حقیقی ہیروز کو دیوتا تسلیم کر کے ان کی پرستش کرنا، راتوں کو جاگ جاگ
کر گھٹیا قسم کے عشقیہ ناول پڑھنا، باس سے کولیگز کی چغلیاں کرنا، اگر یہ نارمل لائف ہے تو پھر کوہ
پیماؤں کی ابنارمل لائف اس سے بہت بہتر ہے مادام!''

''جانتے ہو افق! مجھے نہیں پتا لوگ پہاڑ کیوں سر کرتے ہیں مگر میں پہاڑوں میں خوش رہتی
ہوں۔ مجھے ادھر سکون ملتا ہے لیکن نشاء، پاپا، سیف ان سب کو بہت حیرت ہوتی ہے کہ لوگ پہاڑ
کیوں سر کرتے ہیں۔'' برف قطروں کی شکل میں بہہ رہی تھی اور قطرے راستے میں آنے والے ہر
ذرے کے ساتھ مل کر بڑے ہوتے جا رہے تھے۔

''یہ تو وہی بات ہے کہ ''لوگ کتابیں کیوں پڑھتے ہیں؟'' علم حاصل کرنے کے لیے؟ تو جتنا
ہم اپنے اور نیچر کے بارے میں پہاڑوں میں جا کر ملتا ہے، وہ دنیا کی کسی درس گاہ میں نہیں ملتا۔
جب آپ پہاڑ کو ایکسپیرینس کرتے ہو اور یقین کرو، نان کلائمبرز حیران ہوتے ہیں جب وہ سنتے ہیں کہ

ہم کوہ پیما پربتوں کا احترام کرتے ہیں۔ ان کی جانب تمیز اور ادب سے دیکھتے ہیں۔ چڑ
بھی احترام سے رکھتے ہیں۔ پہاڑ عظیم ہوتے ہیں۔"

"اور ظالم بھی!" پریشے نے استہزائیہ انداز میں سر جھٹکا۔ وہ دیوار کے اس پار نظر
قطروں کو دیکھ رہی تھی، جو دیوار کے نیچے خالی درز سے ہر ممکن طور پر خیمے میں داخل ہو
کر رہے تھے۔ ان کا تمام سامان گیلا ہو چکا تھا۔

"بے شک ظالم ہوں مگر میں ہمالیہ سے تعلق رکھتا ہوں۔ میں انقرہ اور اپنے گھر
پہاڑوں سے تعلق رکھتا ہوں پری۔"

"تمہیں لگتا ہے ہم بچ کر چلے جائیں گے؟"

"کوہ پیمائی تو نام ہی بلندیوں سے زندہ بچ کر واپس آنے کا ہے۔ یہ summit تو
بونس ہوتی ہے۔"

"پھر بھی تم واپس نہیں پلٹنا چاہتے؟"

"تمہیں جانا ہے تو جاؤ میں چوٹی فتح کیے بغیر نہیں جاؤں گا۔" برف کے قطرے
چھوٹی گیندیں بن کر دیوار کے اس پار اکٹھے ہو رہے تھے۔

"افق پلیز...... واپس چلو۔ اس رج کو ناقابلِ تسخیر ہی رہنے دو۔"

"میں ذرا برف صاف کر آؤں۔" وہ چھوٹا سا بیلچہ اٹھا کر باہر نکل گیا۔

وہ چوٹی پر کھڑے ہو کر کنکورڈیا اور بلتورو کے پربت دیکھے بغیر واپس نہیں پلٹے گا، وہ جانتی
کے ساتھ وہاں تک جانا چاہتی تھی، نہ اسے چھوڑ کر نیچے اُترنا چاہتی تھی۔ دنیا میں کوئی بھی انسان "
بہترین" نہیں ہوتا۔ افق ارسلان میں بھی ایک خامی تھی۔ ہٹ دھرمی، ضد اور حد سے بڑھی خود اع

کوہ پیماؤں کی اکثریت انہی خصوصیات کی حامل ہوتی ہے۔ وہ عموماً موسم کی خرابی
اپنے ہدف کے انتہائی قریب پہنچ کر واپس نہیں پلٹنا چاہتے۔ وہ اتنا کچھ صرف کر کے ا
تک پہنچے ہوتے ہیں کہ واپس پلٹ جانا ان کے لیے مشکل ہوتا ہے۔ ابھی صبح ہی تو افق
تھری سے واپس جانے کے متعلق کہا تھا کہ "یہ تو ایسے ہے کہ تم ایک سو میٹر دوڑ کے ایک
نوے میٹر پر رُک کر مڑ جانے کو کہو۔"

افق کی سب سے بڑی خامی یہی تھی کہ اُس نے سو میٹر دوڑ اور کوہ پیمائی میں فرق کو بھ

☆......☆......☆

جمعرات، 18 اگست 2005ء

کیمپ فور 7500 میٹر پر تھا، کیمپ تھری سے تقریباً سات سو میٹر اوپر۔ آج برفانی جھکڑ نہیں چل
رہے تھے، موسم ٹھیک تھا، مگر برف باری ہنوز جاری تھی۔ وہ اتنی ہلکی اور کم تھی کہ حدِ بصارت خاصی
تھی۔ ان کے پاس اتنا گیئر اور فیول نہیں تھا کہ وہ بیٹھ کر ایک دن بھی مزید انتظار کرتے۔

گزشتہ روز کے سخت طوفان کے باعث رسیاں اور کورڈز بری طرح اُلجھ چکی تھیں۔ ان کو
سلجھانے میں خاصا وقت ضائع ہوا۔ رسیاں ویسے بھی کیمپ تھری سے کئی سو میٹر اوپر، کیمپ فور سے
ذرا نیچے سے لگائی گئی تھیں۔ رسیوں کے آغاز تک کا سفر انہوں نے خاموشی سے کیا۔ پھر ان کو
…کار جب پریشے نے جومر کرنے کے بعد رسی کھینچی تو وہ جام رہی۔ اس نے گلیشیئر گوگلز اتار کر
…ٹ پر چڑھائے اور نیچے اتری۔ اس نے گرہ ڈھونڈی جو رسی میں بن کر اسے جام کیے ایک
…یک میں پھنسی تھی، اس نے گرہ کھولی اور دوبارہ اوپر چڑھنے لگی۔ اس کی ایک غلطی کی وجہ سے
بیس منٹ ضائع ہوئے مگر افق نے کچھ نہ کہا۔ وہ خاموشی سے تمام کارروائی دیکھتا رہا۔

وہ دونوں اس وقت "ڈیتھ زون" میں تھے۔ سطح سمندر سے چھ ہزار میٹر سے زائد بلندی کا
…ہ "ڈیتھ زون" یا "ورٹیکل لمٹ" (vertical limit) کہلاتا ہے۔ اس بلندی پر ہوا بے حد
…ب اور آکسیجن ان کے جسموں کے لیے ناکافی تھی۔ سانس لینے کے لیے پریشے کے پھیپھڑوں کو
…را زور لگانا پڑتا تھا اور وہ اس وقت پورا منہ کھول کر سانس لے رہی تھی۔

وہ کیمپ فور سے قدرے نیچے تھے۔ ان سے تقریباً تین سو میٹر اوپر پہاڑ کی ڈھلان جمے
ہوئے ندی نالوں سے مزین تھی۔ یہ وہ جگہ تھی، جہاں سے چوٹی بالکل سامنے دکھائی دیتی کہ یوں
…تھا، وہ ہاتھ بڑھا کر اسے چھو لے گی، مگر اس کے لیے بہت لمبا ہاتھ چاہیے تھا۔

وہ رک رک کر آئس ایکس برف میں مار کر آہستہ آہستہ چڑھ رہی تھی۔ اس کی طاقت اتنی کم رہ
گئی تھی کہ یوں لگتا تھا ابھی کسی وقت تھک کر نیچے لڑھک جائے گی۔ دفعتاً وہ ذرا ستانے کو ایک
…برف تلے چھپے شگافوں کے دہانوں پر موجود ایک برفانی تودے (serac) کے پیچھے کھڑی ہوئی اور
سانس درست کرنے لگی۔ برفانی تودے جب گرتے ہیں تو خوب تباہی مچاتے ہیں مگر اس وقت
…دیتا وہ برفانی تودہ جس کے عقب میں وہ محفوظ سی جھکی کھڑی تھی، اسے بہت اچھا لگ رہا
…افق اس سے سو میٹر دائیں جانب تھا۔

دفعتاً اسے برف کے ٹوٹنے اور چٹخنے کی آواز سنائی دی۔ اس نے گھبرا کر سر اٹھایا۔

اس کے سر سے کئی میٹر اوپر، قدرے دائیں طرف برف میں ایک لمبا سا شگاف پیدا ہوا، یوں جیسے ہینگر سے لٹکے سفید کپڑے کو اوپر سے قینچی سے کاٹ دیا جائے۔ برف کی پلیٹوں پر ہوتا وہ شگاف بے حد خوب صورت مگر بے حد مہلک ثابت ہوا، کیوں کہ اگلے ہی پل، اس شگاف نیچے کی برف کے بڑے بڑے ٹکڑے نیچے گرتے اور سفید بے حد گہری دھول پیدا کرتے تیزی گرتے آ رہے تھے۔

پریشے کا سانس رک گیا۔ برفشار (avalanche) نیچے کی طرف آ رہا تھا، مگر وہ ایک تودے کے پیچھے محفوظ تھی، لیکن افق......

''افق!'' وہ بے اختیار چلائی ''برفشار (avalanche) آ رہا ہے۔ خود کو بچاؤ۔''

افق نے بوکھلا کر اوپر دیکھا جہاں تیزی سے گرتی برف اس کی جانب بڑھ رہی تھی اور پہلے کہ خود کو محفوظ کر پاتا، برف کی سفید دھول ہر طرف پھیل گئی اور اس دبیز دھول کے پیچھے وہ ہو گیا۔

اپنی آئس ایکس کو برف میں گاڑے، خوف کے مارے اسے مضبوطی سے پکڑے، دونوں بند کیے دیوار سے چپکی کھڑی تھی۔ اس کا پورا جسم لرز رہا تھا۔ دل زور زور سے دھڑک رہا تھا۔

پھر دھول آہستہ آہستہ چھٹنے لگی۔ اس نے ڈرتے ڈرتے آنکھیں کھول کر سر اونچا کیا۔

دودھیا سفید برف راکاپوشی کے جسم سے بالکل ویسے ہی چمٹی ہوئی تھی جیسے چند لمحوں پہلے تھی۔ اس نے گردن گھما کر ادھر ادھر دیکھا۔ راکاپوشی کے پہاڑی سلسلے پر سکوت تھا۔ واحد آسمان سے گرتی برف کی تھی، باقی پورا پہاڑ خاموش اور پرسکون تھا جیسے وہ بھیانک برفشار کبھی نہ ہو۔ میلوں دور تک پھیلی برف ویسی ہی حسین نظر آ رہی تھی، بس ایک فرق تھا۔ اس کے دائیں جانب افق ارسلان نہیں تھا۔

''افق!'' وہ بلند آواز سے چلائی ''تم کہاں ہو؟'' اس کی آواز اردگرد کے پہاڑی سلسلے ٹکرا کر ہنزہ کے آسمان میں تحلیل ہو گئی۔ برف سے کوئی جواب نہیں آیا تھا۔

پریشے نے گردن ترچھی کر کے اپنے عقب میں دیکھا۔ گرتی برف کے اس پار ہزا دُمانی کی چوٹیاں تھیں۔ دور بہت دور شاہ گوری کا سرمئی اہرام برفیلی چادر کی بکل مارے دائیں طرف میلوں دور نانگا پربت کی خونی / قاتل چوٹی تھی۔ ہمالیہ کے تمام پہاڑ اس کو تھے، اس پر ہنس رہے تھے، اس کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہہ رہے تھے، ''بے وقوف لڑکی، تم

وہ واقعی اکیلی تھی۔ اس کے اطراف میں ان دیوہیکل پہاڑوں کے سوا کوئی نہیں تھا۔ وہ تمام تنے خوف ناک اور اونچے تھے کہ خود آسمان جھک کر ان کی پیشانی چوم رہا تھا۔

''افق تم کہاں ہو؟'' بہت بے بسی سے اس نے پھر پکارا، ''جواب دو...... خدا کے لیے کچھ تو بولو ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا۔'' اس کا دل واقعی پھٹنے کو تھا۔

وہ کدھر تھا؟ وہ جواب کیوں نہیں دے رہا تھا؟ اوپر سے ہزاروں ٹن برف چند لمحوں میں گری اس برف میں وہ اسے کہاں ڈھونڈے؟ برف اسے اڑا کر گلیشیئر کے قدموں میں پٹخ چکی تھی یا کہیں اپنی آئس ایکس سے چمٹے ہوئے کھڑا تھا؟

پریشے نے اس جگہ دیکھا جہاں چند لمحوں قبل وہ کھڑا تھا۔ وہاں اب دودھیا سفید برف تھی۔ وہ رسی جو اس نے لگائی تھی، اس برف کے اندر گم ہو گئی تھی۔ البتہ غور سے دیکھنے پر اس کا ایک سرا واضح ٹوٹ چکا تھا، یعنی اب افق اس رسی پر نہیں تھا اور نیچے برف میں دب چکا تھا؟ پریشے کا دل ڈوبنے لگا۔

''نہیں۔ وہ ادھر ہی ہو گا۔ میں ڈھونڈتی ہوں اسے، میں اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔'' اس نے کلائی کی اور نیچے اترنے لگی۔ رسی سے نیچے اُترنا بالکل ایسے تھا، جیسے کسی عمارت کی دسویں منزل کی کھڑکی تک پہنچنے کے لیے عمارت کے باہر سے لکڑی کی سیڑھی رکھی جائے اور پھر جیسے اس سیڑھی سے نیچے اُترا جاتا ہے، مضبوطی سے اسے پکڑے، سنبھل کر پیچھے اور نیچے دیکھتے ہوئے ایک ایک قدم نیچے رکھنا، وہ ایسے ہی اُتری تھی۔

اسے علم نہیں تھا کہ وہ برف میں کہاں تھا، مگر اسے یہ علم تھا کہ اگر افق کو ڈھونڈنے کے لیے اسے راکاپوشی کی تمام برف بھی کھودنی پڑی تو وہ کھود ڈالے گی۔

وہ بمشکل بیس میٹر نیچے اُتری۔ اس کا تنفس تیز تیز چل رہا تھا اور وہ باقاعدہ ہانپ رہی تھی۔ اس کے گھٹنوں میں جان نہیں تھی مگر پھر بھی وہ اردگرد برف میں افق کو کھوج رہی تھی۔

دفعتاً اسے قریب برف میں سرمئی رنگ کی جھلک دکھائی دی۔ وہ خود کو رسی سے ان کلپ کر کے تیزی سے اس طرف بھاگی برف گھٹنے گھٹنے گہری تھی۔ وہ اس میں گھٹنوں تک دھنسی، خود کو گھسیٹتی ہوئی اس چیز کے قریب آئی اور دستانوں سے تیزی سے برف ہٹانے لگی۔

وہ ایک سرمئی رنگ کا پتھر تھا۔

اس کا دل بیٹھنے لگا۔ اس نے گردن جھکا کر نیچے دیکھا اور ایک دفعہ پھر پوری قوت سے آواز دی، ''افق ...... تم کہاں ہو؟''

اگر وہ اس جگہ سے نیچے تھا تو یقیناً آواز اس تک گئی ہو گی، اگر اوپر ہوتا تو ہوا کے رخ سے آواز نیچے سے اوپر نہ جاتی، یعنی اب اگر وہ جواب میں کچھ کہتا بھی تو وہ پریشے کو نہ سنائی دیتا۔ ہوا اس کی دشمن بنی اوپر سے نیچے کی جانب چل رہی تھی۔ شدتِ بے بسی سے اسے رونا آ گیا۔

''نہیں، وہ ادھر ہی ہو گا۔ میں ڈھونڈتی ہوں اسے۔ میں اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔''

دوبارہ رسی پر Clip on کر کے، بڑبڑاتے ہوئے نیچے اترنے لگی۔

ہمالیہ کے عظیم پربتوں نے اس کی بڑبڑاہٹ سن لی تھی اور وہ استہزائیہ ہنسے تھے۔ بے بسی سے اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

''میں اسے ڈھونڈ نکالوں گی۔ تم دیکھتے رہنا، ظالم پہاڑو! میں اسے برف میں دفن نہیں دوں گی، میں اسے قراقرم کے قاتل پہاڑوں اور ہمالیہ کے ظالم آسمان سے دور لے جاؤں گی۔ دیکھتے رہنا۔''

وہ زور زور سے روتے اور چلاتے ہوئے نیچے اتر رہی تھی۔ ان بلند چوٹیوں نے پھر وحشیانہ انداز میں قہقہہ لگایا تھا، مگر اب وہ انہیں نہیں سن رہی تھی۔ وہ افق کو تلاش کر رہی تھی۔ اسے ہر حال میں افق کو برف سے باہر نکالنا تھا۔

تقریباً چالیس میٹر نیچے اتر کر اس نے خود کو رسی سے آزاد کیا، چالیس میٹر اوپر اس کے دائیں طرف افق چند لمحے پہلے موجود تھا۔ وہ یقیناً وہیں کہیں گرا ہو گا۔ اسے اب سو میٹر اس طرف جانا تھا۔

وہ گھٹنوں تک برف میں دھنسی خود کو گھسیٹتی ہوئی دائیں طرف جانے لگی۔ اس کی ٹانگیں اکڑ کر لکڑی بن چکی تھیں۔ اس سے چلا نہیں جا رہا تھا، مگر وہ کتنی ہی دیر چلتی رہی، پھر بالآخر تھک کر وہیں برف میں گھٹنوں کے بل گر گئی۔

اس میں مزید چلنے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ تیز تیز سانس لیتے ہوئے وہ باقاعدہ ہانپ رہی تھی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی، مگر جسم پر طاری تھکاوٹ اور عجیب سی نقاہت کے باعث اٹھا ہی نہیں گیا۔

''افق۔'' وہ پھر سے حلق کے بل چلا کر اسے پکارنے لگی، ''تم کہاں ہو؟''

برد کا گلیشیئر خاموش رہا۔

آسمان سے بہت خاموشی سے برف باری ہوتی رہی۔ گھٹنوں کے بل برف میں گھسٹتے ہوئے، آئس ایکس برف میں مارتی وہ آگے بڑھنے لگی۔

یہاں ہر سو دودھیا سفید برف کی چادر بچھی تھی۔ کہیں کہیں سے جھلکتے سیاہی مائل سرمئی پتھر اور [illegible] بھی اب برف باری کے باعث چاندی سے ڈھک گئی تھیں۔ دور دور تک برف کا ایک نہ ختم ہونے والا صحرا پھیلا تھا اور اسے افق کو تلاش کرنے کے لیے وہ صحرا پار کرنا تھا۔

وہ گھٹنوں کے بل چلتے ہوئے، ادھر ادھر برف پر بیلچہ مارتی، اسے توڑتی آگے بڑھ رہی تھی۔ یہ اترائی یا چڑھائی کا سفر نہیں تھا، وہ دراصل پہاڑ کی ڈھلان پر شمال کی جانب بڑھ رہی تھی۔ وہ برفیلا میدان تھا۔ جانے سو میٹر ہوئے تھے یا نہیں کہ وہ ایک جگہ برف میں گر سی گئی۔ اب اس میں مزید حرکت کرنے کی ہمت نہیں رہی تھی۔ وہ ذرا دیر کو ستانے کے لیے تنفس درست کرنے لگی۔

پھر اس نے گردن ادھر ادھر گھما کر دیکھا۔ افق کو اندازاً اسی جگہ کے قریب ہونا چاہیے تھا، کیوں کہ برفشار کا زور بہت شدید نہیں تھا کہ وہ بہت نیچے جا گرتا۔ اسے یقین تھا کہ وہ اس کے آس پاس ہی کہیں برف میں دبا سانس لے رہا ہو گا مگر وہ اسے کہاں ڈھونڈے؟

پریشے اپنے قریب برف میں ایکس مارتے ہوئے اسے توڑنے لگی کہ شاید وہ اس کے قریب ہی کہیں ہو۔ اس نے بہت سی برف کھود ڈالی مگر وہ کہیں نہیں تھا۔

وہ پھر سے برف پر تقریباً جھک کر، گھٹنوں کے بل چلتی ہوئی آگے بڑھنے لگی، ساتھ ساتھ وہ اسے آوازیں بھی دے رہی تھی مگر وہ جواب نہیں دے رہا تھا۔ پریشے کو جہاں جہاں کسی سیاہ سرمئی شے کی جھلک دکھائی دی، اس نے وہاں کی برف کھود ڈالی، مگر ہر جگہ برف کے نیچے سے وہی سیاہ پتھر نکلتے تھے، جنہیں لوگ ترک زبان میں قراقرم کہتے تھے۔

برف باری تیز ہوتی جا رہی تھی۔ وہ تھک کر حوصلہ ہارنے ہی والی تھی کہ اس جگہ جہاں سے وہ غائب ہوا تھا، سے ٹھیک چالیس پینتالیس میٹر نیچے دوبارہ سرمئی رنگ کی جھلک دکھائی دی۔ وہ اس کی طرف لپکی۔ اس کا رواں رواں دعا گو تھا کہ وہ افق ہی ہو۔ اس نے زور سے وہ سرمئی چیز کھینچی...... وہ افق ہی تھا۔

''افق...... افق۔'' پاگلوں کی طرح اسے پکارتے ہوئے وہ اس پر سے برف ہٹانے لگی۔ وہ

اوندھے منہ برف میں پڑا تھا۔ ہونٹ بالکل جامنی پڑ چکے تھے اور آنکھیں بند تھیں۔ اس کے برف سے اٹے کپڑوں اور اردگرد برف پر لگے خون کے دھبوں کے علاوہ کوئی بھی شے کسی قیامت کی مانند گزر جانے والے برفشار کا پتا نہیں دیتی تھی۔

"افق.....افق تم ٹھیک ہو؟ آنکھیں کھولو افق!" اس کو جھنجھوڑتے ہوئے اس کا نیلا پڑتا چہرہ تھپتھپاتے ہوئے وہ رو پڑی تھی۔ وہ آنکھیں کیوں نہیں کھول رہا تھا؟ وہ بول کیوں نہیں رہا تھا؟

"افق! خدا کے لیے آنکھیں کھولو۔ پلیز اُٹھو....." اس کے چہرے سے برف صاف کرتے ہوئے اس نے اس کا منجمد ہوتا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا اور اسے مسلنے لگی۔

وہ ہلکا سا کھانسا منہ سے برف کے ذرات باہر نکلے۔ پریشے نے طمانیت بھری گہری سانس اندر کو کھینچی.....وہ زندہ تھا۔ اسے کچھ نہیں ہوا تھا۔ وہ ان ظالم پہاڑوں کے درمیان تنہا نہیں تھی۔

اب وہ آنکھیں نیم وا کر کے بمشکل سانس لینے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی سانس اکھڑی اکھڑی سی آ رہی تھی۔ پریشے نے اسے کندھوں سے تھام کر بٹھانے کی کوشش کی، تب اسے محسوس ہوا کہ وہ زخمی تھا۔ اس کے چہرے، ناک اور گردن پر گہری خراشیں تھیں، جن پر خون جما تھا۔

اس کو بمشکل سہارا دے کر اس نے وہیں برف میں بٹھایا تو وہ گہرے گہرے سانس لینے لگا۔ اس کے چہرے کی رنگت واپس آنے لگی مگر وہ آنکھیں پوری نہیں کھول پا رہا تھا۔

"اٹھو.....کھڑے ہو، طوفان زور پکڑ رہا ہے۔ ہمیں جلد ہی کسی محفوظ جگہ پر پہنچنا ہوگا۔" برف باری کی تیز ہوتی رفتار اور سرد ہواؤں کے جھکڑوں کی خوف ناک آواز سے وہ پریشان سی ہو کر اسے سہارا دے کر کھڑا کرنے لگی، مگر زخمی ہونے کے باعث وہ اٹھ نہیں پا رہا تھا۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں رہا تھا، اس سے تو کچھ بولا بھی نہیں جا رہا تھا، آنکھیں بھی اسی طرح ادھ کھلی تھیں۔ وہ نڈھال سا، نیم بے ہوشی کے عالم میں تھا۔

وہ اس کو کھڑا نہیں کر سکتی تھی، یہ ادراک ہوتے ہی اس نے اپنی کمر کے گرد بندھی کلائمبنگ ہارنس سے چھوٹی سی رسی باندھی۔ اسے افق کی ہارنس سے کیربنر کی مدد سے منسلک کیا، پھر دونوں ہاتھوں سے اس کے بازوؤں اور کندھوں کو پکڑے اسے برف میں گھسیٹنے لگی۔

تب اسے علم ہوا کہ اس کی دائیں ٹانگ سے خون بہہ رہا تھا اور اس کا بیک پیک غائب تھا۔

برف باری اب شدید قسم کی ژالہ باری میں تبدیل ہو رہی تھی۔ سرد ہواؤں کی رفتار تیز ہو گئی تھی۔ آسمان کا رنگ یکایک سرمئی سے سفید ہو چکا تھا۔ حدِ بصارت جو کچھ دیر پہلے اتنی زیادہ تھی کہ وہ

پربت بھی دیکھ سکتی تھی، اب محض دو سو فٹ رہ گئی تھی۔ رسیوں سے بنایا گیا راستہ چند میٹر اوپر تک ہی واضح تھا اور آگے دُھند میں گم ہو جاتا تھا۔ تیز چلتی برفیلی ہوائیں اسے ادھر ادھر لڑھکانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ وہ بہ دقت اپنے قدموں پر کھڑی، اسے کسی لاش کی مانند کھینچ رہی تھی۔ سخت پتھروں کی طرح کے اولے اس کے سر پر پڑ رہے تھے۔ ہمالیہ کے پہاڑ اگر اس پر ہنس بھی رہے تھے تو اب وہ نہیں دیکھ سکتی تھی۔

وہ افق کو گھسیٹتی نو دس میٹر نیچے لائی، پھر نڈھال سی ہو کر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گئی۔ اس کی باقاعدہ سانس چڑھ گئی تھی اور اس میں مزید ہمت نہیں تھی کہ وہ ایک چھ فٹ کے اونچے پورے مرد کو اس کے بھاری بھرکم کپڑوں سمیت کھینچ کر چند قدم بھی نیچے لے جا سکے۔ اسے یہ بھی علم نہیں تھا کہ اسے نیچے جانا تھا یا اوپر۔ دونوں جانب جانے والے راستے دھند اور بادلوں میں گم ہو رہے تھے۔ کیمپ فور چند میٹر ہی اوپر تھا، مگر اوپر چڑھنا خودکشی تھا۔ کیمپ تھری خاصا نیچے تھا اور وہ افق کو اتنا نیچے نہیں لے جا سکتی تھی۔ برستی ژالہ باری اور چنگھاڑتے طوفان میں وہ ایک زخمی شخص کے ساتھ تنہا برف میں بیٹھی تھی۔

اس کا دماغ سن ہو چکا تھا، کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس ظالم طوفان میں وہ کس پتھر سے پناہ مانگے، کس برفانی دیوار کے پیچھے جا چھپے؟

سب کچھ جیسے خواب کی سی کیفیت میں ہو رہا تھا۔ ذہن ماؤف تھا، ٹانگوں سے قوت سلب تھی، بصارت چند میٹر تک محدود تھی۔ یا خدا، وہ کیا کرے؟

اس نے سر اٹھا کر اوپر دیکھا۔ آسمان مکمل طور پر سفید تھا اور سفید سفید سے پتھر نیچے برسا رہا تھا۔ تیز ہوائیں ڈراؤنی آواز کے ساتھ چل رہی تھیں۔ اس نے گردن ادھر ادھر گھما کر اپنے اطراف میں دیکھا۔ وہ برف میں جس جگہ بیٹھی تھی، اس سے تھوڑی دور تک ہی اس کی بصارت کام کر رہی تھی، آگے سب کچھ دھند اور دبیز برف میں غائب ہو جاتا تھا۔ جہاں تک وہ دیکھ سکتی تھی، وہاں تک برف کا میدان تھا، ہر طرف سفید برف تھی۔ وہ کسی برف کے صحرا میں بیٹھی تھی جس کی کوئی حدیں نہیں تھیں۔ دنیا جیسے ختم ہو چکی تھی۔ سب برف تھا، سفید اجلی برف۔

اس کے اعصاب اب اس کا ساتھ چھوڑنے لگے تھے۔ دماغ مفلوج ہو چکا تھا۔

پھر اس نے افق کو دیکھا۔ وہ اس کے قریب برف پر پڑا کراہ رہا تھا۔ اس کی آنکھیں ادھ کھلی تھیں، جیسے وہ نیم بے ہوش ہو۔ پریشے کچھ بھی سن یا سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ شدید سردی اس کی ہڈیوں

میں گھس کر انہیں کھا رہی تھی۔ انتہائی بلندی کے باعث اس کا ذہن اور جسم آپس میں مربوط نہ تھے۔ وہ بس متلاشی نگاہوں سے اردگرد دیکھ رہی تھی۔ اسے آسمان سے پتھروں کی طرح گرتی برف سے بچاؤ کے لیے کچھ کرنا تھا۔ اس کی یادداشت اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت گو کہ اس کا ساتھ چھوڑ چکی تھی، مگر لاشعوری قوتِ مدافعت بیدار تھی۔

اس بلندی پر ذہن کو ایک نقطے پر مرکوز کرنا، کچھ سوچنا بہت کٹھن تھا۔ اس نے بدقت تمام بیگ کھولا، آئس ایکس، (بیلچہ) snow shovel، آئس اسکریوز اور کچھ رسی نکالی اور پھر اسے وہیں برف میں رسی سے باندھنے لگی۔ اس کی کمر کے گرد رسی باندھ کر دائیں اور بائیں رسی کو اسکریوز سے برف میں ٹھونک دیا یوں کہ اب وہ حرکت نہیں کر سکتا تھا۔ پھر اس نے ایک دفعہ اپنی حفاظتی رسیوں کی مضبوطی چیک کی اور تسلی کر کے وہ نیچے اترنے لگی۔

طوفانی جھکڑوں اور شدید قسم کی برف باری کے دوران اسے بمشکل تیس میٹر نیچے ایک چھوٹا پلیٹ فارم ملا جہاں وہ برف کھود کر خیمہ لگا سکتی تھی۔ پھر جانے کتنی دیر وہ برف میں پھاوڑا مارتے ہوئے برف کھودتی رہی، برف کا پاؤڈر سا اس کے چہرے اور کپڑوں پر گرتا رہا، ٹانگیں منجمد ہونے لگیں۔ افق وہیں اوپر سخت سردی میں زخمی پڑا رہا، پریشے کے ہاتھوں سے جان نکلنے لگی مگر خیمہ لگ کے نہیں دے رہا تھا۔ طوفانی، ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے چلتی ہوا اسے ہر چند سیکنڈ بعد گرا دیتی اور وہ پھر سے کھڑی ہوتی۔ ایک چھوٹا سا دو آدمیوں کا ٹینٹ اس نے کتنی مشکل سے اس ہوا میں لگایا، یہ صرف وہی جانتی تھی۔

پھر وہ واپس گرتی پڑتی اوپر آئی۔ وہ اسی طرح برف اور پتھروں سے بندھا پڑا تھا۔ اس کی آنکھیں بند اور لب جامنی تھے۔ ''افق'' اسے پکارنے کے باوجود اس کے وجود میں جنبش نہ ہوئی۔ وہ تیزی سے اس کے قریب آئی تیز ہوا اسے کھڑا بھی نہیں ہونے دے رہی تھی۔

''افق! اٹھو اور اندر چلو۔'' اس کے کان کے قریب چیخنے پر اس نے آنکھیں کھولیں۔ پریشے نے اس کی رسیاں کھولیں، اسے دوبارہ خود سے باندھا اور سہارا دے کر نیچے لائی۔ وہ چلنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ غالباً اس کی ٹانگ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی اور ٹانگ میں آنے والا زخم اتنا گہرا اور اذیت رساں تھا کہ خیمے کے فرش پر گرتے ہی وہ پھر سے کراہنے لگا تھا۔ وہ کبھی بھی درد سے کراہتا نہیں تھا، اب اگر کراہ رہا تھا تو یقیناً شدید زخمی تھا۔

پریشے وہیں اس کے قریب دوزانو بیٹھ گئی۔ خیمے کی گول چھت پر برف مسلسل گر رہی تھی۔

ٹینٹ میں لگے دو ہیٹ لائٹرز کے باعث اندر اور باہر کے درجۂ حرارت میں خاصا فرق پڑتا جا رہا تھا۔ اندر گرمائش تھی، پھر بھی اس کے دانت بج رہے تھے اور ٹانگیں لکڑی کی طرح سخت ہو رہی تھیں۔ وہ بیٹھے بیٹھے گھسٹ کر اس کے قریب آئی اور اپنا بیگ کھول کر فرش پر الٹ دیا پھر فرش پر بکھرے سامان میں سے دستانے نکال کر افق کے ہاتھوں میں پہنائے۔ سلیپنگ بیگ میں اسے ڈالا کہ وہ اپنا سلیپنگ بیگ اپنے بیگ سمیت گم کر چکا تھا اور پھر میڈیکل کٹ سے ضروری سامان نکال کر اس کا زخم دیکھنے لگی۔

اس وقت اس کا تھکاوٹ اور سردی کے مارے برا حال تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ فوراً کمبل اوڑھ کر سو جائے، مگر سامنے وہ شخص لیٹا تھا جس سے اس کی سانسوں کی ڈور بندھی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جس کے لیے وہ دو دن پیدل برف زاروں کو عبور کر کے آئی تھی، جو اگر درد سے کراہتا تھا تو وہ درد اور گھاؤ پریشے کو اپنی روح میں لگتے محسوس ہوتے تھے۔ وہ سو نہیں سکتی تھی۔ جب تک وہ پرسکون نہ ہو جاتا، اسے چین نہیں آ سکتا تھا۔

اس کا زخم گہرا تھا۔ شاید ہڈی فریکچر ہو گئی تھی، خون بھی بہہ رہا تھا۔ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت میں کسی حد تک کمی کے باعث وہ ٹھیک سے سمجھ نہ پا رہی تھی اور بمشکل پٹی کر رہی تھی۔ اس کی اپنی سانس بھی اکھڑ اکھڑ کر آ رہی تھی۔ وہ ''ڈیتھ زون'' میں تھی اور اس کے جسم کے خلیوں کو اس بات کا علم ہو چکا تھا۔ اس کے تمام خلیوں کو آکسیجن ٹھیک سے نہیں مل رہی تھی اور وہ اسے اس بات کا بخوبی احساس دلا رہے تھے، چوں کہ دماغ کو بھی آکسیجن نہیں مل رہی تھی، سو اس کا ذہن ماؤف سا ہو رہا تھا۔ اس کے پاس تو آکسیجن کینسٹر بھی نہیں تھے۔ بیس کیمپ میں جب اس نے افق سے آکسیجن رکھنے کی بات کی تو اس نے لاپروائی سے انکار کر دیا تھا۔ ''میں نے بگ فائیو بغیر آکسیجن کے سر کیے ہیں کبھی کبھی دل کرتا ہے، دیکھوں تو سہی کہ میرے پھیپھڑے کتنا حوصلہ رکھتے ہیں۔''

اس کے پھیپھڑے جیسے بھی ہوں، وہ بہرحال کم آکسیجن کے عادی تھے مگر پریشے عادی نہیں تھی۔ اس نے اپنے طور پر کچھ آکسیجن ایمرجنسی صورت حال کے لیے رکھی بھی تھی، مگر وہ لانا بھول گئی تھی۔ افق کے پاس ایک کینسٹر تو لازمی ہونا تھا، مگر وہ اپنا بیگ کھو چکا تھا۔ یہ چھوٹی چھوٹی غلطیاں بہت بڑی ٹریجڈی بنتی جا رہی تھیں۔

زخم صاف کر کے اس کی پٹی تو کر دی مگر فریکچر کے بارے میں وہ کچھ بھی کرنے سے قاصر تھی۔ اسے افق کو لازماً بیس کیمپ لے کر جانا تھا۔ فریکچر ایسا تھا کہ سرجری ناگزیر تھی مگر وہ نیچے کیسے جائے؟

وہاں جانے کے تو تمام راستے مسدود تھے۔

افق کو اس نے دوبارہ سلیپنگ بیگ پہنا دیا۔ زپ بند ہوتے ہی اس کے یخ جسم کو گر ملنے لگی اور اس کی نیم وا آنکھیں پوری بند ہو گئیں۔ وہ اسی پوزیشن میں آدھا بیٹھا، آدھا لیٹا سو گیا۔

پریشے کے پاس اب کوئی سلیپنگ بیگ نہیں تھا، صرف دو لائینرز تھے جنہیں اپنے گرد لپیٹ بھی وہ ٹھٹھر رہی تھی۔

ٹوٹی ٹانگ اور گہرے زخم کے باوجود وہ کیسے پرسکون سو رہا تھا، وہ اس کے قریب دیوار ٹیک لگائے بوجھل ہوتی آنکھوں سے اسے دیکھے گئی۔ اس میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ افق کو کرے یا خود سیدھی ہو کر لیٹ جائے۔ وہ وہیں بیٹھے بیٹھے سو گئی۔

نیند میں اسے عجیب عجیب خواب آتے رہے۔ آخری جو خواب آیا، اس میں اس نے دیکھا وہ خود، احمت، افق، ارسہ، حبیب، نشاء، مصعب، جاپانی ٹورسٹ، پاک فوج کے پائلٹس، کیمپ فور میں ایک ہی خیمے میں دبکے بیٹھے خوش گپیاں کر رہے ہیں۔ خشک میوے، گرم چا ہاٹ چاکلیٹ سرو کی جا رہی ہے۔ شفالی بھی وہیں تھا اور اس کا اپنا ملازم وحید بھی۔ شفالی اور شکلیں بہت مل رہی تھیں۔

کوئی اس کا گھٹنا جھنجھوڑ کر اسے اٹھانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس نے جھٹکے سے آنکھیں دیں۔

وہاں شفالی تھا، نہ وحید، نہ آرمی کے پائلٹس، سب کچھ راکاپوشی کی لطیف ہوا میں تحلیل تھا۔ وہ اپنے خیمے میں تھی اور اس کا گھٹنا ہلانے والا افق تھا۔

''ہاں...... کیا؟'' پریشے کا ذہن آہستہ آہستہ بیدار ہونے لگا۔ باہر طوفان کا شور جاری تھا۔ وہ کتنے گھنٹے بے خبر سوتی رہی، اسے اندازہ نہ تھا۔

''پانی دو...... گرم پانی۔'' بہت دِقت سے وہ آہستہ آہستہ یوں بولا جیسے بولنے سے تکلیف ہوتی ہو۔ وہ خیمے کی دیوار سے ٹیک لگائے ٹانگیں سیدھی پھیلائے بیٹھا تھا۔ درمیان پریشے کے رک سیک سے نکلنے والی اشیا کا ڈھیر تھا۔ وہ اس کی بات پر سر ہلاتے پر سے چیزیں سمیٹنے لگی۔

برفشار میں افق کے گم ہونے والے بیگ میں کھانے کا زیادہ تر سامان اور رہ گئی تھی کے پاس گیس، آئس اسکریوز (برف میں لگائی جانے والی میخیں) پی ٹونز اور کچھ رسی تھی

نام پر اس کے بیگ میں بس ایک دن کا کھانا تھا جو ڈی ہائیڈریٹڈ تھا اور اس کی برف پگھلانے ری ہائیڈریٹ کر کے اصل حالت میں لانے کے لیے انہیں ایندھن کی بے حد ضرورت تھی، جو اس وقت محض دو سے تین دن کا رہ گیا تھا، وہ بھی صرف پانی بنانے کے لیے۔ دو سے تین رانیہ کم ہو سکتا تھا اگر وہ کھانا بھی گرم کرنے لگتی، سو اب اس کے لیے وہ تمام فوڈ سپلائی بے کار تھی۔ وہ گیس ضائع کرنا افورڈ نہیں کر سکتی تھی، کیوں کہ اس بلندی پر انسان بغیر کچھ کھائے بھی ہفتہ بھر زندہ رہ سکتا ہے، مگر پانی۔

وہ بے رنگ مائع جو زمین پر صرف آب ہوتا ہے، پہاڑوں پر آبِ حیات ہوتا ہے۔ بغیر کچھ پیے وہ چند گھنٹوں میں ہی مر جاتے۔ البتہ بھوک دونوں کو نہیں لگی تھی، نہ ہی اس بلندی پر لگتی تھی۔

پریشے نے انتہائی بلندی پر کام کرنے والا اپنا سٹو و جلایا۔ چھوٹے سے پین میں برف توڑ کر ڈالی اور اسے پگھلانے لگی۔ خیمے کی چھت پر برف مسلسل پڑ رہی تھی مگر صد شکر کہ وہ اس زاویے سے نصب تھا کہ برفانی طوفان خیمہ اکھاڑ یا گرا نہیں سکتا تھا۔

برف پانی بن گئی تو اس نے آخری چاکلیٹ سے کچھ ہاٹ چاکلیٹ بنائی۔ ہاٹ چاکلیٹ اور گرم چائے افق کو پلائی، خود صرف گرم پانی پر گزارہ کیا۔ اپنے حصے کی چائے بھی وہ افق کو دے چکی تھی۔

جسم کو کچھ گرم مائع ملا تو دماغ کچھ سوچنے کے قابل ہوا۔ افق کی توانائی بھی قدرے بحال ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر شدید درد کے آثار رقم تھے مگر وہ اب کراہ نہیں رہا تھا بلکہ خیمے کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا۔ آنکھیں بند تھیں اور وہ دھیرے دھیرے کچھ گنگنا رہا تھا۔ یہ وہی گانا تھا جو اس نے بیس کیمپ میں ہنزو کٹر لوگوں کو سنا رہا تھا اور کئی دن پہلے برستی بارش میں وائٹ پیلس کے لوگوں کو سنایا تھا۔

we are leyla

we are mecnun

اس کی آواز بے حد دھیمی تھی، مگر اس نے سن لی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ وہ تکلیف اور دکھ میں ہمیشہ گنگنایا کرتا تھا۔

''یہ لیلیٰ کی تو سمجھ آتی ہے، مگر Mecnun کون ہے افق؟''

افق نے آنکھیں کھولیں جو بے حد سرخ ہو رہی تھیں۔

''مجنوں!'' ایک لفظ کہہ کر اس نے دوبارہ سے آنکھیں موند لیں۔

''ارے!'' اسے حیرت ہوئی۔ ''یہ لیلیٰ مجنوں، ترکی میں بھی ہوتے ہیں؟''

''ہاں، مجنوں ترک بھی ہو سکتا ہے۔'' وہ دھیرے سے مسکرایا اور پھر بند آنکھوں سے گنگنانے لگا۔ ''وی آر لیلیٰ، وی آر مجنوں۔'' یہ وہ پہلی نارمل بات تھی، جو دونوں نے طوفان میں پھنس جانے کے بعد کی تھی۔ یہ گرم پانی کا اثر تھا۔ آبِ حیات کا اثر۔

افق کچھ دیر گنگناتا رہا، پھر خاموش ہو گیا، اب اس پر نقاہت طاری ہو رہی تھی۔ پریشے اپنے ذہن کو مجتمع کر کے اس صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی جس سے اس کا زندگی میں بار پالا پڑا تھا اور جب حالات سمجھ میں آنے لگے تو اس کا دل ڈوبنے لگا۔

اس کا میٹرا سے بتا رہا تھا کہ وہ 7437 میٹر بلندی پر سخت برفانی طوفان کے درمیان ایک میں پھنسی بیٹھی ہے۔ اس کے ساتھ ایک ایسا زخمی کوہ پیما ہے، جس کا زخم نہ صرف اسے چند چلنے سے معذور کر چکا ہے بلکہ زخم کے باعث اس کی ٹانگیں کم وقت میں فروسٹ بائٹ کا شکار ہمیشہ کے لیے ختم ہو سکتی ہیں۔ اس کے ایک پاؤں کی انگلیاں پہلے بھی فروسٹ بائٹ ہو چکی تھیں پرانے زخم تو ویسے بھی فروسٹ بائٹ کے عمل کے دوران تیز ترین عامل یا عمل انگیز (catalyst) بن جایا کرتے ہیں۔ فروسٹ بائٹ کو صرف ایک عنصر روک سکتا تھا اور وہ تھا پانی۔ جسم میں پانی کی کمی کا مطلب تھا، فروسٹ بائٹ اور جسم میں پانی کی کمی، سطح سمندر سے انتہائی بلندی کا مطلب سیریبرل ایڈیما یا پلمنری ایڈیما۔

اس وقت حالت یہ تھی کہ اسے جلد از جلد افق کو وہاں سے نکالنا تھا۔ اس کے پاس 80 میٹر رسی تھی اور اسے کئی ہزار میٹر نیچے اترنا تھا۔ (بیس کیمپ 3400 میٹر پر تھا) اگر وہ جلد کو وہاں سے نہیں نکالتی تو وہ مر بھی سکتا تھا۔ اسے جلد کچھ سوچنا تھا، کچھ کرنا تھا۔

اوپر جانے اور چوٹی سر کرنے کا تو اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ افق کی مخصوص کوہ پیماؤں والی ضد کے باعث وہ turn around time کا انتخاب وہ کھو چکے تھے۔

کوہ پیمائی میں ایک ٹرن اراؤنڈ ٹائم ہوتا ہے، پیچھے مڑنے کا وقت۔ پہاڑوں پر موسم بدلتا ہے۔ کوہ پیما تعین کرتے ہیں کہ اگر آج اتنے بجے تک ہم نے چوٹی سر کر لی تو ٹھیک ورنہ بجے تک ہم جہاں بھی ہوئے، واپس مڑ جائیں گے۔ کوہ پیما عموماً نہ پلٹنے کی غلطی کرتے ہیں غلطی افق ارسلان نے بھی کی کہ وہ بہر حال کوئی افسانوی کردار نہیں، ایک جیتا جاگتا انسان تھا۔

اب انہیں راکاپوشی کے ناقابلِ تسخیر رج کو ناقابلِ تسخیر ہی چھوڑ کر واپس جانا تھا اور واپس جانے کے لیے طوفان کا رکنا ضروری تھا جو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ وہ اوپر جا سکتے تھے، نہ نیچے اور نہ ہی بیٹھے رہ سکتے تھے۔ خدایا! وہ کیا کرے؟

بڑی دیر بعد کہیں جا کر وہ ایک نتیجے پر پہنچی۔ اس نے ٹرانسیور نکال کر احمت سے رابطہ کیا اور بنا تمہید کے کہنے لگی۔ ''احمت...... احمت، افق زخمی ہے، ہم کیمپ فور اور کیمپ تھری کے درمیان پھنسے ہوئے ہیں۔ باہر سخت طوفان ہے، ہمیں ہر حال میں نیچے اترنا ہے۔ بتاؤ میں کیا کروں؟''

''افق زخمی ہے؟ اسے کیا ہوا؟'' حسبِ توقع وہ پریشان ہو گیا۔

''صبح برفشار آیا تھا۔ افق کی رسی ٹوٹ گئی اور وہ 40 میٹر نیچے گرا۔ ٹانگ کی ہڈی فریکچر ہوئی اور چوٹیں بھی شدید ہیں۔'' سخت سردی کے باعث اس کے بجتے دانت اسے بولنے نہیں دے رہے تھے۔

''اوہ تم یوں کرو، اس کے فریکچر کو......''

''فار گاڈ سیک احمت! میں ڈاکٹر ہوں۔ مجھے پتا ہے مجھے اس کے فریکچر کے ساتھ کیا کرنا ہے۔ تم اپنے مشورے اپنے پاس رکھو۔ مجھے ان کی ضرورت نہیں ہے۔'' اس نے ایک دم غصے سے ٹوکا۔ پل بھر کو احمت خاموش سا رہ گیا۔ اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا۔

''آئی ایم سوری احمت...... میں بہت پریشان ہوں...... پلیز ناراض مت ہونا۔'' وہ روہانسی ہو گئی۔

''ریلیکس پریشے! جب طوفان رکے تو تم نیچے اتر آنا...... اس طرح پریشان ہونے سے تمہارے اعصاب پر برا اثر پڑے گا۔ خود کو پرسکون رکھو۔''

''میں خود کو پرسکون نہیں رکھ سکتی احمت! ہماری پوزیشن بہت خراب ہے۔ افق شدید زخمی ہے۔ وہ ڈیسنڈ نہیں کر سکتا۔ اسے شدید درد ہو رہا ہے۔'' احمت سے بات کرتے ہوئے اس نے بے قرار سی نگاہ افق پر ڈالی جو آنکھیں موندے شدت ضبط سے لب سختی سے ایک دوسرے میں پیوست کیے بیٹھا تھا۔

''تم اس کو پین کلر دو۔''

''مگر اس کی ٹانگ نہیں کام کر رہی۔ وہ چل نہیں سکتا۔ تم میری بات کیوں نہیں سمجھ رہے؟'' وہ زود پریشان پھر سے غصے میں ڈھلنے لگا۔

دفعتاً افق نے آنکھیں کھولیں اور آہستہ سے ہاتھ بڑھا کر اس کا گھٹنا ہلایا۔ پریشے نے بولتے رک کر اسے دیکھا۔

''انقرہ کال کرو...... جینیک کو...... اس سے ویدر کنڈیشن پوچھو۔'' وہ نقاہت بھرے لہجے میں آہستہ آہستہ، رک رک کر بول رہا تھا۔ پریشے نے سمجھ کر سر ہلایا اور ریڈیو میں بولی۔

''احمت...... !انقرہ کال کرو جینیک کو اور اس سے ویدر کنڈیشن کے بارے میں......''

افق نے جھنجھلا کر نفی میں سر ہلایا، ''احمت نہیں، تم پوچھو، پری!''

''میں؟ میں کیسے پوچھوں؟''

''سیٹلائٹ فون تھا تمہارے پاس۔''

''وہ ہاں...... احمت! میں تم سے پھر بات کرتی ہوں۔ آؤٹ۔'' اس نے ٹرانسیور بند کر کے جھٹ بیگ سے سیٹلائٹ فون نکال کر اسے تھمایا۔

وہ خود ہی کتنی دیر کسی سے بات کرتا رہا۔ تھکا تھکا لہجہ، نقاہت اور پژمردگی سے آنکھیں موندے، وہ یقیناً شدید کرب کے عالم میں تھا۔

''ویدر کلیئرنس کا امکان اگلے اڑتالیس گھنٹے تک کوئی نہیں ہے۔ خدایا۔'' فون بند کر کے اس نے پریشے کو تھمایا۔

وہ دو دن اس سردی اور موسم میں گزارا کر لیتی مگر افق...... اس نے پھر سے احمت سے رابطہ کیا اور اسے تمام حالات سمجھائے۔

''اب کچھ کرو احمت! ہمیں جلد از جلد یہاں سے نکلنا ہے۔''

''میں کچھ کرتا ہوں، تم فکر نہ کرو۔''

''کیسے فکر نہ کروں؟ وہ...... وہ مر جائے گا، احمت...... خدا کے لیے کچھ کرو ورنہ وہ مر جائے گا۔'' شدت بے بسی سے اسے رونا آ گیا۔

''میں کیا کروں؟'' اس کے رونے پر وہ بوکھلا سا گیا، ''یہاں بیس کیمپ میں میرے اور ... کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ بتاؤ میں کیا کروں۔''

''کسی بھی اتھارٹی سے بات کرو کہ وہ ہمیں یہاں سے ریسکیو کریں۔ الپائن کلب پاکستان سے کہو، نذیر صابر سے کہو، منسٹری آف ٹورازم سے کہو، کسی سے بھی کہو خدا کے لیے۔''

''میں کچھ کرتا ہوں۔ تم میری کال کا انتظار کرو۔'' احمت نے کہا اور سلسلہ منقطع ہو گیا۔

پریشے کچھ دیر سوچتی رہی، پھر اس نے دوبارہ احمت کو کال کیا۔

''احمت! سنو، تم پاکستان آرمی سے بات کرو۔ ان سے کہو کہ کلائمبرز کو evacuate کرنے کے لیے ہیلی کاپٹر بھیجیں۔''

دوسری جانب تھوڑی دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

''ڈاکٹر پریشے! کیا سطح سمندر سے انتہائی بلندی پر انسان کا دماغ بھی خراب ہو جاتا ہے؟''

''کیوں؟ کیا غلط کہا ہے میں نے؟''

''میری بات غور سے سنو۔ اس وقت پوری دنیا میں کوئی ایسا پائلٹ پیدا نہیں ہوا، جو تمہیں چھے سات ہزار میٹر بلندی سے ریسکیو کر سکے۔ اس سے پہلے کہ تمہاری انرجی اور ہمت جواب دے، تم نیچے اترنے کی کوشش کرو۔ یہی تمہارے مسئلے کا واحد حل ہے۔''

''میرے استاد مت بنو اور پاکستان آرمی سے بات کرو۔''

اس نے ریڈیو رکھ دیا اور افق کو دیکھا جو سر جھکائے یوں شکست خوردہ سا بیٹھا تھا کہ جیسے سارا حوصلہ اور ہمت ہار چکا ہو۔

''افق!'' پریشے نے دھیرے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ اس نے گردن اٹھائی۔ ''کیا زیادہ درد ہو رہا ہے؟''

اس نے آہستہ سے گردن کو نفی میں جنبش دی۔ ''نہیں، درد تو نہیں ہو رہا۔'' اسے جتنا درد ہو رہا تھا وہ اس کی شہد رنگ آنکھوں میں تحریر تھا۔

''کیا تم نیچے اُتر سکتے ہو؟ کم از کم کیمپ تھری تک؟'' بغور اس کے چہرے اور آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے یوں نرمی سے پوچھا، جیسے کوئی ڈاکٹر سامنے بیٹھے چھوٹے سے بچے سے اس کی طبیعت پوچھ رہا ہو۔

اس نے خاموشی سے گردن کو نفی میں جنبش دی۔

''چند میٹر بھی نہیں؟''

''اس طوفان میں اس ٹانگ کے ساتھ؟ نو نیور!'' اس نے سر نفی میں ہلایا۔ وہ پورے پورے سینٹنس نہیں بول پا رہا تھا، مگر وہ بہرحال مطلب سمجھ سکتی تھی۔

''اچھا دیکھو، اس ٹینٹ میں جتنا ہو سکتا ہے، اپنی ٹانگیں بازو ہلاتے رہو۔ گرم رہو گے اور فراسٹ بائٹ سے بھی بچ جاؤ گے۔'' وہ خود بھی یہی کر رہی تھی مگر افق ویسے ہی خاموشی سے بیٹھا

خیمے کی سامنے والی دیوار پر نگاہیں جمائے جیسے کچھ سوچتا رہا۔

پھر کتنی ہی دیر گزر گئی اور احمت نے کوئی رابطہ نہ کیا۔ طوفان ابھی تک اسی طرح راکاپوشی کو لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔ باہر مسلسل اولے پڑنے کا شور سنائی دے رہا تھا۔ پریشے نے ... کھڑکی سے جھانکا۔ باہر مکمل وائٹ آؤٹ تھا۔ حدِ بصارت محض ایک میٹر رہ گئی تھی۔

رات کٹ کے نہیں دے رہی تھی۔ ایک ایک لمحہ صدیوں سے بھاری تھا۔ وہ دونوں ... بغیر کوئی بات کیے خیمے میں بیٹھے رہے۔ پریشے کو احمت کی کال کا انتظار تھا۔

”وہ یقیناً اتھارٹیز سے رابطہ کر رہا ہوگا جس کے باعث اسے دیر ہو رہی ہے۔“

وہ خود کو تسلی دینے کے ساتھ ساتھ تمام زبانی یاد سورتیں اور آیت الکرسی وغیرہ پڑھ رہی تھی ... طوفان نہ تھما۔ وہ شہروں میں آنے والا طوفان نہیں تھا۔ وہ ہمالیہ کا برفانی طوفان تھا جو بغیر ... دن تک جاری رہ سکتا ہے۔ قاتل برفانی طوفان اور مکمل وائٹ آؤٹ۔

اچانک ریڈیو میں شور سا پیدا ہوا۔ وہ اس کی جانب لپکی۔

”ہیلو احمت؟“ وہ بے تابی سے بولی۔

”ہاں ڈاکٹر...... سنو میں نے ترک گورنمنٹ سے بات کی ہے، انہوں نے تمہارے ... منسٹر سے رابطہ کیا ہے۔“

”پھر؟“

”ہاں وہ کہہ رہا تھا کہ آرمی سے بات کر کے......“

”کب کرے گا وہ آرمی سے بات؟ پلیز احمت، تم خود آرمی سے بات کرو...... مجھے ان ... اہلکاروں پر بھروسا نہیں ہے۔“

”تم میری پوری بات کیوں نہیں سنتیں؟ میں ادھر بیٹھا جھک تو نہیں مار رہا۔ اب اپنا منہ ... اور میری بات سنو۔ میں نے سوئس پائلٹس سے سب سے پہلے رابطہ کیا ہے، جنہوں نے ... ایورسٹ پر ریسکیو آپریشن کیا تھا۔ وہ وولنٹیئر کر رہے ہیں مگر ان کی فلائٹس کا پرابلم ہے۔ انہیں ... سے چار دن لگ سکتے ہیں اور......“

”مگر افق کے پاس تین سے چار دن...... سوری تم بات مکمل کرو۔“

”تم بھی ناں! اچھا سنو۔ سوئس کا آنا مشکل ہے، مگر تمہارے فارن منسٹر نے پاکستان ... سے رابطہ کیا ہے۔ میں اتنی دیر تک آرمی والوں کی کال کا انتظار کرتا رہا تھا۔ ابھی دس منٹ ...

... میری بات ہوئی ہے۔ انہوں نے تمہارے ریڈیو کی فریکوئنسی پوچھی ہے اور تمہارے کپڑوں کا ... وغیرہ اور یہ کہ تم انگریزی بول سکتی ہو یا نہیں۔ میں نے کہا کہ بول سکتی ہو، ٹھیک کہا ناں؟“

”تو میں تم سے فرنچ میں بات کر رہی ہوں کیا؟“

”نہیں میرا مطلب ہے، وہ تمہاری آرمی ہے تم ان سے اپنی زبان میں بھی بات کر سکتی ہو۔“

”اچھا وہ کب آئیں گے؟“ اس نے بے قراری سے پوچھا۔

”آئیں گے کیا مطلب؟ وہ ابھی تم سے رابطہ کریں گے۔ ہر کام آرام سے ہوتا ہے، ڈاکٹر! ... صرف تمہاری طرف سست روی سے گزر رہا ہے۔ زمین پر تو ہمیشہ کی طرح بھاگ رہا ہوگا۔“

پھر چند مزید باتیں کر کے اس نے ریڈیو رکھ دیا اور گہرے گہرے سانس لیتے ہوئے تھکاوٹ ... افق کو دیکھا۔ وہ مسکرا دیا۔ اس کی مسکراہٹ بہت اداس تھی۔

”وہ ابھی آ جائیں گے، تمہیں بس چند قدم چل کر ہیلی کاپٹر میں جانا ہوگا۔ چل لو گے ناں؟“ اس نے ہولے سے افق کا ہاتھ تھپتھپایا۔

”چل لوں گا، اگر وہ آئے تو!“

”کیا مطلب اگر وہ آئے تو؟ وہ ضرور آئیں گے۔ تم مایوس مت ہو۔“ وہ اس سے زیادہ خود کو تسلی دے رہی تھی۔ اس نے ہولے سے سر جھٹک کر پھر سے آنکھیں موند لیں۔

رات قطرہ قطرہ بھیگتی رہی، چنگھاڑتی ہواؤں کی ناقابلِ برداشت حد تک بلند آوازیں مسلسل اس کے کانوں میں گونجتی رہیں۔ وہ بمشکل چند گھنٹے سو سکی۔ صبح کے قریب اس کے ریڈیو نے اسے ... جب اس کی آنکھ کھلی تو اسے علم ہوا کہ تیز برفانی ہوا اسے خیمے کے اندر ہی اندر ادھر ادھر لڑھکاتی رہی ... اور اب وہ نیم دراز سی تھی، ایک پاؤں خیمے سے باہر جا رہا تھا اور یخ ہو چکا تھا۔ اس نے اٹھ کر ... کھینچتے ہوئے پاؤں اندر کیا اور ریڈیو اٹھا کر کان سے لگایا۔

”کم ان ... ایکسپیڈیشن ٹیم، دس از آرمی ایوی ایشن۔“ آواز تھی یا نئی زندگی کی نوید، اس کی جیسے ... اتر گئی۔

”آئی ایم ہیر، سر۔“ اس نے ریڈیو کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔

”ڈاکٹر پریشے جہاں زیب آر افق ارسلان؟“ بھاری، رعب دار آواز میں پوچھا گیا۔

”پریشے جہاں زیب۔“

”دس از کرنل فاروق، ڈاکٹر جہاں زیب!“

''آئی نو، سر!'' وہ خوشی سے بولی۔ وہ یقیناً انہیں بچانے آ رہے تھے اور ہیلی کا پٹر
سے قبل اس کو اپنی آمد سے آگاہ کرنے والے تھے، اس نے سوچا۔

''او کے، گیومی یور اسٹیٹس، پریشے۔''

''ہم نے ایک ٹینٹ پچ کر رکھا ہے جس کا رنگ اورنج ہے، یہ کیمپ تھری سے خاصا اوپر
وہ اب اردو بولنے لگی۔

''اور بیٹا، آپ کے کپڑوں کا رنگ۔''

''میں نے پنک اور لائٹ گرین جیکٹ پہن رکھی ہے۔ میرے ساتھی کی گرے جیکٹ
ریڈیشن براؤن ٹراؤزر ہیں۔ سر پر یلو ہیلمٹ ہے، اور...'' یہ اتنا رنگ برنگا حلیہ صرف برف
واضح نظر آنے کے لیے تھا۔

''او کے اب مجھے اپنی لوکیشن دیں، ٹھیک ٹھیک۔ پہاڑ کی ڈھلان اور فیس کا اینگل بتائیں''

وہ بتانے لگی، پھر وہ بولے، ''او کے، اب آپ میری بات غور سے سنیں، ہم جلد ہی آپ
آ جائیں گے۔''

اسے لگا اس نے غلط سنا ہے، ''آ جائیں گے؟ آپ کا مطلب ہے آپ آ نہیں رہے؟''

''طوفان بہت شدید ہے ڈاکٹر پریشے۔ وزیبلٹی نہیں ہے۔''

''تو جب طوفان رکے گا تب تو آپ آ جائیں گے ناں؟'' وہ کسی امید کا سہارا لینے کی کوشش
رہی تھی۔

''جی بالکل۔ اب آپ بتائیں، تقریباً کیا بلندی ہو گی آپ کی؟'' اس نے فوراً میٹر
''7437 میٹر۔''

دوسری جانب چند لمحوں کی خاموشی چھا گئی پھر ریڈیو سے آواز ابھری۔

''تو پھر آپ یوں کریں کہ کم از کم ساڑھے انیس ہزار تک آ جائیں۔''

''میں ساڑھے سات ہزار پر ہوں، آپ انیس ہزار کی بات کر رہے ہیں۔ میری سمجھ میں نہیں
رہا۔'' اب اسے کوفت ہونے لگی۔

''میڈم! آپ انیس ہزار فٹ تک ڈیسنڈ کر لیں۔''

''فارگاڈ سیک کرنل فاروق مجھے میٹرز میں بتائیں۔'' وہ جھنجھلائی۔

''او کے، آپ تقریباً چھ ہزار میٹر تک نیچے اتر آئیں۔''

پریشے کا دماغ بھک سے اڑ گیا۔

''کرنل صاحب! میرا ساتھی ''شدید'' زخمی ہے۔ اس کی ٹانگ ٹوٹ گئی ہے۔ اس سے ڈیڑھ
قدم نہیں چلا جاتا اور آپ مجھے کہہ رہے ہیں کہ میں ایک زخمی کو لے کر ڈیڑھ ہزار میٹر نیچے اتروں؟
آر یو آؤٹ آف یور مائنڈ؟'' اس کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

''دیکھیں پریشے! چھ سوا چھ ہزار میٹر سے اوپر دنیا کا کوئی ہیلی کا پٹر نہیں آ سکتا۔ ہم آپ کو
اسی صورت ریسکیو کر سکتے ہیں کہ طوفان رک جائے اور آپ ڈیسنڈ کر لیں۔''

''مگر میرا ساتھی زخمی ہے۔ وہ نہیں چل سکتا۔ اوپر آپ نہیں آ سکتے۔ نیچے میں نہیں جا سکتی، میں
یہاں تو کیا کروں؟''

افق نے اس کے ہاتھ پر ہولے سے اپنا ہاتھ رکھ کر اسے اپنا غصہ دبانے کا اشارہ کیا، مگر وہ
شدید پریشان ہو رہی تھی۔

''طوفان تھم جائے تو آپ کوشش کریں۔'' کرنل صاحب کا لہجہ اتنا پرسکون اور ٹھنڈا تھا کہ
پریشے کو لگا وہ اس معاملے میں دلچسپی ہی نہیں لے رہے۔

''انہیں کہو، میں کوشش کرتی ہوں اور ڈیسنڈ کر کے آپ کو بتاتی ہوں۔'' افق کی ہدایت پر اس
نے یہی کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا اور ریڈیو فرش پر رکھ کر اسے دیکھا۔

''عجیب بے حس لوگ ہیں، کوئی اور مر رہا ہے اور انہوں نے رٹ لگا رکھی ہے کہ نہیں آ سکتے،
نہیں آ سکتے۔'' وہ بڑبڑائی۔

''وہ واقعی نہیں آ سکتے، وہ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں جانتا تھا وہ نہیں آئیں گے، میری پوری
زندگی ہمالیہ میں گزری ہے، اس لیے تمہیں کہا تھا اگر وہ آئے تو میں چل لوں گا چھ ہزار میٹر سے
اوپر ہوا اتنی پتلی اور دھند اتنی شدید ہوتی ہے کہ ہیلی کا پٹر وہاں نہیں آ سکتا۔'' وہ آہستگی سے کہتا، اسے
سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا۔

''تو پھر ہم نیچے کیسے اتریں؟ میں کیا کروں؟'' وہ بے حد پریشان تھی۔

وہ کتنی ہی دیر اسے چپ چاپ دیکھتا رہا، پھر بالآخر چند قدم گھسٹ کر اس کے نزدیک آیا اور
اس کے بالکل مقابل بیٹھ کر اس کا دایاں ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس کی آنکھوں میں
دیکھتے ہوئے کہنے لگا، ''میری بات غور سے سنو اور جو میں کہوں، ویسے ہی کرو۔ تمہیں یاد ہے پری!
میں نے تمہیں ایک دفعہ بتایا تھا کہ میری ماں بہت بہادر ہے۔''

وہ سمجھی تھی افق اسے نیچے اُترنے کے کسی منصوبے اور حکمتِ عملی کے متعلق بتائے گا، مگر وہ نہایت غیر متعلقہ بات کر رہا تھا۔

"ہاں مجھے یاد ہے، مگر اس وقت۔"

"میری ماں بہت بہادر ہے پری! اس نے اپنے تین جوان بیٹوں کی موت کا غم سہا ہے۔ اپنے بیٹوں کے بعد ان کے بچے اس کے پاس ہیں اور وہ ان میں بہت خوش اور مگن ہے۔"

"وہ تو ٹھیک ہے افق! مگر کرنل صاحب کہہ رہے ہیں کہ ہمیں......"

"یقین کرو پری! میرے ماں باپ کے پاس دوسری کئی مصروفیات ہیں۔ وہ خود کو ان جھمیلوں میں گم کر سکتے ہیں اور ان کے لیے یہ مشکل نہیں ہوگا۔"

اس نے جیسے پریشے کی بات سنی ہی نہیں تھی اور پتا نہیں کون سے قصے لے کر بیٹھ گیا تھا۔ وہ الجھنے لگی۔ وہ کہہ رہا تھا، "تمہاری نومبر میں شادی ہے۔ تمہیں اس کی تیاری کرنی ہوگی۔ میں نہیں مانتی مگر شاید تمہاری پھپھو تم سے بہت محبت کرتی ہوں اور تمہارے پاپا بھی تو ہیں ناں۔ ان کی زندگی میں ایک واحد رشتہ تم ہو پری! میرے ماں باپ کی اور بات ہے۔" وہ رک رک کر ٹھہر ٹھہر کر اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"میرے ماں باپ عادی ہو چکے ہیں۔ ان کے دو بیٹے اور بھی ہیں، مگر تم اپنے باپ کی اکلوتی بیٹی ہو۔" ایک دم پریشے کے لاشعور میں خطرے کا الارم بجا۔

"تم......تم کھل کر بات کرو افق!"

"پری! یہ سب صرف اور صرف میری وجہ سے ہوا ہے۔ میں تمہیں اس جگہ پھنسانے کا ذمہ دار ہوں، کیوں کہ میں نے جلدی ٹرن اراؤنڈ نہیں کیا۔ ورنہ اس وقت تم بیس کیمپ میں ہوتیں۔" وہ پلک جھپکے بغیر اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

"نہیں افق! میں تو خود......تم، تم کیا کہنا چاہ رہے ہو؟ اس طرح بات کیوں کر رہے ہو؟ کرنل فاروق نے کہا ہے کہ ہم جیسے ہی ڈیڑھ ہزار میٹر ڈیسنڈ کریں گے، وہ ہمیں لینے آ جائیں گے۔ تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ انہیں کہوں کہ میں کوشش کرتی ہوں۔" اس نے اسے یاد دلایا۔

افق نے اثبات میں سر ہلا دیا، "میں نے ٹھیک کہا تھا۔ تم کوشش کر کے ڈیسنڈ کر سکتی ہو۔" اس کے لہجے میں کچھ ایسا تھا، جس پر وہ بری طرح چونکی، "تم؟ کیا مطلب ہے تم..." اب کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگا تھا۔

"پری! تم نیچے جا سکتی ہو۔ تم نیچے چلی جاؤ۔"

"افق!" پریشے نے تڑپ کر اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے چھڑایا۔

"خدا کے لیے پری! جذباتی مت بنو۔ میری وجہ سے خود کو خطرے میں مت ڈالو۔ تم نیچے چلی جاؤ۔ پلیز چلی جاؤ۔"

وہ سناٹے میں رہ گئی۔

"تم، افق! تم یہ چاہتے ہو کہ میں تمہیں اس برفانی طوفان میں چھوڑ کر اکیلا چھوڑ کر، یہاں سے چلی جاؤں؟"

وہ بے یقینی سے پھٹی پھٹی نگاہوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں تم چلی جاؤ۔ پلیز چلی جاؤ۔ وہ اوپر کبھی نہیں آئیں گے۔ وہ چھ ہزار میٹر سے اوپر کبھی نہیں آ سکیں گے۔ تم نیچے اتر جاؤ۔ میری فکر مت کرو۔" وہ تھکے تھکے لہجے میں کہتا پیچھے کو بیٹھ گیا۔

"تمہیں......تمہیں چھوڑ کر؟ اس......اس ٹینٹ میں چھوڑ کر؟" وہ حیران تھی، بے یقین تھی۔

"میں نیچے نہیں جا سکتا پری! میں کبھی بھی نیچے نہیں جا سکوں گا۔ میں جانتا ہوں، میں مر جاؤں گا اور اگر تم میرے لیے ادھر رہیں تو تم بھی مر جاؤ گی۔ تمہارے پیچھے بہت سے لوگ ہیں، جو تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ پائیں گے۔ تمہارے باپ کے اور بچے نہیں ہیں۔ پریشے! میرے لیے اپنی اور خود سے جڑے لوگوں کی زندگیاں خطرے میں مت ڈالو۔ تم بہت سے لوگوں کی زندگی ہو۔ میرا کیا ہے؟ میں تو کوہ پیما ہوں۔ مجھے ازل سے علم تھا کہ میری موت پہاڑوں میں ہی آنی ہے۔ میں نے ہمالیہ میں ہی مرنا ہے۔ میرا کیا ہے پریشے! میرے لیے کوئی نہیں روئے گا۔"

اس نے دوبارہ اس کا ہاتھ پکڑنا چاہا مگر اس نے تیزی سے ہاتھ چھڑا لیا۔

"تم......تم کیا سمجھتے ہو مجھے؟ میں اتنی خود غرض اور بے حس ہوں کہ تمہیں یہاں چھوڑ کر چلی جاؤں گی، ہاں؟ کیا سمجھتے ہو تم مجھے؟ بلکہ تم تو، تم تو افق مجھے کچھ سمجھتے ہی نہیں ہو۔ تم تو مجھے سمجھ ہی نہیں سکے۔" اس کی آواز آنسوؤں سے رندھنے لگی، "کیا سمجھ کر تم نے مجھے یہ سب کہا؟ تمہیں لگتا ہے تمہارے کہنے پر میں تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں گی؟ اتنی بری ہوں میں؟"

"پاگل مت بنو اور چلی جاؤ۔ خدا کے لیے چلی جاؤ ورنہ تمہارے باپ کو تمہاری لاش بھی نہیں ملے گی۔ یہ سب میری غلطی تھی، میں تمہیں ان پہاڑوں میں لایا تھا۔ پھر برفشار کے بعد تم نے میری جان بچائی، میری پٹی کر دی، بہت شکریہ۔ اس سے زیادہ تم میرے لیے کچھ نہیں کر سکتیں۔ میں جانتا

ہوں میں مر جاؤں گا، میں کبھی بھی نیچے نہیں جا سکوں گا۔ میں ہمالیہ سے جڑا ہوں اور مجھے یہیں ہی مرنا ہے۔ میں ادھر ہی خوش ہوں۔" وہ تھک کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

"میں تمہیں چھوڑ کر چلی گئی تو تمہیں لگتا ہے کہ زندہ رہ لوں گی؟" کتنی آسانی سے اس نے اتنا کچھ کہہ ڈالا تھا، جیسے کوئی بات ہی نہ ہو، جیسے دونوں کے درمیان ان کہا تعلق کوئی حیثیت نہ رکھتا ہو۔

"تم رہ لوگی۔ تمہارے پاس بہت رشتے ہیں۔ تم چند ماہ میں ہی مجھے بھلا دو گی۔ آخر کون یاد رکھتا ہے کسی کو؟ بہت سے کلائمبنگ پارٹنرز مہموں کے دوران مر جایا کرتے ہیں، سو واٹ؟"

"کلائمبنگ پارٹنرز؟ بس یہی ہوں میں تمہاری؟" اس کے دل پر گھونسا سا پڑا تھا۔

افق نے نقاہت بھرے انداز میں اسے دیکھا، "تم چلی جاؤ پری! یہاں سے واپس، اسلام آباد، پنجاب، جہاں سے تم آئی ہو وہاں چلی جاؤ۔ ہاں بس ایک بار تم کی ضرور جانا۔ افق ڈاؤن ٹاؤن کے قریب میرا گھر ہے۔ حسن حسین ارسلان کا گھر۔ بس ایک دفعہ جا کر میری ماں سے ضرور ملنا اور...... اور اسے بتانا کہ اس کا بیٹا بزدل نہیں تھا، بس وہ راکاپوشی سے نہیں لڑ سکا۔"

وہ بولتے بولتے تھک کر خاموش ہو گیا۔ اس نے ہار مان لی تھی۔ اس نے راکاپوشی سے مان لی تھی۔

پریشے نے ایک جھٹکے سے سر اٹھایا، "تم کیا سمجھتے ہو، مجھے یہاں سے بھیج کر تم بہادری کی قربانی کی کوئی عظیم مثال قائم کرو گے؟ تمہارے لیے قراقرم میں تاج محل تعمیر کروایا جائے؟ تمہارے مجسمے کی پرستش کی جائے گی؟ تمہاری بہادری کے قصے سنائے جائیں گے؟ ہاں، یہی چاہتے ہو تم...... نہیں افق، نہیں، یہ بہادری نہیں ہے۔ یوں چھپ کر خیمے میں بیٹھ کر بہادری نہیں، بزدلی کی مثال قائم کر رہے ہو۔ یوں چھپ کر تو کوئی کمزور چوہا بیٹھا کرتا ہے۔ تم چوہے سے بھی زیادہ کمزور اور بزدل نکلے...... تم تو۔"

چٹاخ کی آواز کے ساتھ ایک زناٹے دار تھپڑ اس کے چہرے پر پڑا تھا۔ ایک لمحے کو اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔

"شٹ اپ، جسٹ شٹ دی ہیل اپ۔" وہ زور سے دھاڑا، "دفع ہو جاؤ تم ادھر سے۔ مجھے تمہاری صورت سے بھی نفرت ہے۔ نہیں چاہیے مجھے تمہاری ہمدردی اور مدد۔ نکل جاؤ یہاں سے۔ وہ بھی ایسے ہی چلی گئی تھی۔ تم بھی، تم بھی چلی جاؤ۔ تم سب ایک سی ہوتی ہو۔"

وہ زور زور سے چلاتے ہوئے اسے وہاں سے نکل جانے کو کہہ رہا تھا اور اپنے بائیں رخسار پر ہاتھ دھرے وہ سن سی ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔ یقیناً اس کی آنکھوں نے غلط دیکھا تھا، اس کے گال نے غلط محسوس کیا تھا۔

"تم نے...... تم نے مجھے تھپڑ مارا؟" اس نے بے یقینی سے اپنا ہاتھ رخسار سے ہٹا کر دیکھا کہ اس پر افق کے ہاتھ کا نشان ہو اور دوبارہ اسے گال پر رکھا۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔

افق نے اسے تھپڑ مارا؟ افق نے؟ وہ بھی اتنی زور سے۔ اس کا پورا دماغ گھوم گیا؟ وہ اتنا زوردار تھپڑ اسے افق نے مارا؟ واقعی؟

وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور باہر نکل گئی۔

خیمے کے باہر برفانی طوفان اسی طرح جاری تھا۔ سرد طوفانی ہوا اس کے باہر نکلتے ہی اسے ادھر ادھر لڑھکانے کی کوشش کرنے لگی مگر وہ مضبوطی سے خیمے کے دروازے سے دو گز دور، بازو سینے پہ باندھے کھڑی سامنے دیکھتی رہی۔

صبح صادق کا وقت تھا۔ سورج کہیں سے بھی دکھائی نہیں دیتا تھا، کیوں کہ آسمان پر سیاہ بادلوں کا راج تھا اور آسمان سے ذرا نیچے برفانی طوفان کا راج تھا۔ روشنی بس اتنی تھی کہ وہ شدید دھند میں محض پچاس میٹر تک دیکھ سکتی تھی۔ برف ابھی تک گر رہی تھی، مگر رات کی طرح کا شدید وائٹ آؤٹ نہیں تھا۔

کتنی ہی دیر وہ برف میں اسی طرح ہاتھ باندھے، ساکت پتلیوں سے پلکیں جھپکے بغیر سامنے دیکھتی رہی، جیسے دھند، برف باری اور طوفان میں کوئی جیتی جاگتی ممی کھڑی ہو۔ اس کی ٹوپی ہوا کے باعث اڑ کر دو گز دور گر گئی۔ ہر پل گرتی برف اسے سفید کرتی رہی مگر وہ اسی طرح کھڑی دھند میں دیکھتی رہی۔ دفعتاً اس کے عقب میں دھیمی آہٹ ہوئی۔

بہت مشکل اور شدید تکلیف کے عالم میں وہ ski pole کا سہارا لیے چل کر باہر آیا تھا۔ اس سے اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا اور طوفانی ہواؤں کی چنگھاڑتی آواز کے باوجود اسے اس کی ہر قدم رکھنے کے ساتھ لبوں سے نکلنے والی کراہیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ بمشکل چلتا، لنگڑاتا اس کے قریب آیا مگر پریشے گردن کو جنبش دیئے بغیر سامنے دیکھتی رہی۔ اسے گال پر افق کے طمانچے کی حرارت اور درد ابھی تک محسوس ہو رہا تھا۔

چند لمحے وہ کچھ کہے بغیر اسے دیکھتا رہا، پھر اس کی نگاہیں پریشے کے چہرے سے پھسلتی اس کے اڑتے بالوں پر جا ٹھہریں۔ اس نے ارد گرد متلاشی نگاہیں دوڑا کر کچھ ڈھونڈنا چاہا، پھر جس

طرف اس کی ٹوپی گری تھی، وہ اس طرف بڑھنے لگا۔

پریشے نے کن انکھیوں سے اسے دیکھا جو لنگڑاتے ہوئے، بدقت ایک ٹانگ پر زور دے کر چل کر ٹوپی کے قریب گیا۔ اس نے جھک کر ٹوپی اٹھائی، اس پر لگی برف جھاڑی اور واپس پریشے کے قریب آنے لگا۔ تب اس نے محسوس کیا کہ وہ دایاں پاؤں قدرے ٹیڑھا کر کے رکھ رہا تھا جیسے اس میں بھی تکلیف ہو۔

"اسے پہن لو۔" اس نے ٹوپی اس کی جانب بڑھائی۔

اس نے چپ چاپ ٹوپی تھام کر سر پر پہن لی اور پھر گھنی پلکیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ "اگر تمہیں لگتا ہے کہ مجھے تھپڑ مار کر، مجھ پر چیخ چلا کر، مجھے خود سے متنفر کر کے تم مجھے یہاں سے جانے پر مجبور کر دو گے تو تم غلط ہو۔ میں تمہیں کبھی بھی چھوڑ نہیں جاؤں گی۔ میں حنا دے نہیں ہوں افق، پریشے ہوں۔"

افق نے خاموشی سے سر کو اثبات میں ہلایا۔

"اب چلو اندر۔" اس نے ڈپٹا۔ وہ سر جھکائے اس کے آگے چلتا ہوا اندر خیمے میں داخل ہوا۔

"بیٹھو اور اب اپنا جوتا اتار کر مجھے اپنا پاؤں دکھاؤ۔" وہ دیوار سے ٹیک لگا کر ٹانگیں پھیلائے بیٹھ گیا تو وہ تحکم سے بولی۔

"میرا پاؤں ٹھیک ہے۔ اسے کچھ نہیں ہوا۔" افق نے فوراً اپنا دایاں پاؤں دور ہٹایا۔

"میں نے جو کہا ہے، وہ کرو، جوگر اتارو۔"

"مگر میں ٹھیک ہوں ڈاکٹر۔" اس نے جوتے پر یوں ہاتھ رکھ دیا جیسے کوئی چھوٹا بچہ اپنی غلطی چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔

"یہ فیصلہ کرنے والی میں ہوں کہ تم ٹھیک ہو یا غلط۔ مجھ سے بحث مت کرو اور جوگر اتارو۔"

"میں کہہ جو رہا ہوں کہ میرا پاؤں ٹھیک......"

اس کی بات مکمل ہونے کا انتظار کیے بغیر پریشے نے اس کے چہرے پر زور سے تھپڑ مارا۔

"پہلے بھی کہا تھا اور اب بھی کہہ رہی ہوں۔ مجھے اپنے سامنے بڑبڑاتے ہوئے مریض برے لگتے ہیں۔ ڈاکٹر کے سامنے خاموش رہا کرو۔ اب اتارو اپنا جوتا۔"

افق نے حیرت اور بے یقینی سے ہاتھ سے رخسار کو ہولے سے چھوا، جیسے کچھ محسوس کر رہا ہو۔ پھر اس کے تاثرات حیرت سے مدھم مسکراہٹ میں بدل گئے۔ اس نے خاموشی سے مسکراتے ہوئے جوگر کا تسمہ کھولا۔ پریشے نے جیسے کہیں کچھ برابر کر دیا تھا۔

اس کے پاؤں کا انگوٹھا زخمی تھا۔ ناخن ٹوٹ چکا تھا اور خون جما ہوا تھا۔ ناخن کے نیچے والی جگہ نیلی تھی۔ اسے یقیناً اس زخم کا علم تھا مگر صرف اس لیے کہ وہ پریشان ہو گی، افق نے اسے آگاہ نہیں کیا تھا۔

"مجھ سے یہ زخم چھپاتے ہوئے تمہیں شرم تو نہیں آئی ہو گی؟" اس کا زخم صاف کر کے پٹی کرتے ہوئے وہ طنز سے بولی۔

"بالکل نہیں آئی تھی۔" اس نے معصومیت سے جواب دیا۔

"اب پہن لو جرابیں۔" پٹی کر کے اس نے پھر حکم دیا۔ وہ تابع داری سے جرابیں پہن کر بوٹس کے تسمے بند کرنے لگا۔ اس کے لبوں پر اداس مسکان رقصاں تھی۔

"ہمیں ہر حال میں نیچے کا سفر آج ہی شروع کرنا ہے۔ دعا کرو کہ آج طوفان کا زور ٹوٹ جائے اور سورج نکل آئے، پھر برف باری بھی ہو رہی ہو، تب بھی ہم ڈیسنڈ کر لیں گے۔" چولہے پر برف پگھلا کر گرم پانی کا ایک کپ بنا کر اس نے آدھا افق کے برتن میں انڈیلا اور اسے تھمایا۔ "میں جانتی ہوں تمہارا زخم گہرا ہے مگر تمہیں ہمت کرنی پڑے گی اپنے لیے نہیں تو میرے لیے۔ کرو گے نا افق؟"

گھونٹ گھونٹ پانی پیتے افق نے اثبات میں سر ہلایا۔ پریشے نے آخری پاور بار اس کی جانب بڑھایا۔

"کھا لو...... انرجی کے لیے۔" وہ خاموشی سے پاور بار کا ریپر اتار کر کھانے لگا۔

پریشے نے گیس کی مقدار چیک کی۔ بس دو دن کی گیس بچی تھی، وہ بھی صرف پانی بنانے کے لیے۔ انہیں ہر دو گھنٹے بعد آدھی پیالی پانی کی لازماً ضرورت ہوتی تھی، ورنہ فروسٹ بائٹ کی تلوار سر پر لٹک رہی تھی۔ ساڑھے سات ہزار میٹر پر ایک پیالی پانی، دو گھونٹ گرم چائے اور تھوڑی سی گیس زندگی اور موت کے درمیان فرق کرتے تھے۔

پاور بار ختم کر کے جانے کب وہ بیٹھے بیٹھے سو گیا۔ پریشے کو پتا بھی نہیں چلا۔ وہ اپنے خیالات سے چونکی تو اسے اسی پوزیشن میں اونگھتے دیکھا۔ برفشار کو گزرے پورے چوبیس گھنٹے بھی نہیں ہوئے تھے مگر وہ کتنا بیمار، کمزور اور پژمردہ لگ رہا تھا۔ چہرے کی رنگت زردی مائل سفید پڑ رہی تھی۔

اس کا ازلی شگفتہ سنہری پن اور سرخی آج اس کی رنگت میں نظر نہیں آ رہی تھی۔

باہر برفانی طوفان شور مچاتا رہا اور وہ خاموشی سے اسے سوتے دیکھتی رہی۔ نیند میں وہ کبھی ہلکا سا کھانس دیتا۔ اس کے چہرے پر واضح کرب رقم تھا۔

اسے افق پر بے پناہ ترس آیا۔ اس کی ٹانگ یقیناً اتنی دکھ رہی تھی کہ اس کا عزم، حوصلہ ہمت جواب دے گیا تھا۔ اسے علم ہو چکا تھا کہ وہ مر جائے گا، مگر مرتے مرتے بھی وہ اپنی سانسیں اسے دان کرنا چاہتا تھا، اسے وہاں سے بھیجنا چاہتا تھا۔

وہ اسے لفظوں میں نہیں بتا سکتی تھی کہ وہ اس کے ساتھ اس چھوٹے سے خیمے میں محض اپنی زندگی بچانے کے لیے نہیں بیٹھی تھی۔ بلکہ وہ شخص جو سامنے بیٹھے بیٹھے سو چکا تھا، وہ شخص اس کی زندگی تھا۔ بعض لوگوں کی زندگی آپ کے لیے اہم ہوتی ہے، ان کے بغیر رہا جا سکتا ہے، مگر کچھ لوگ آپ کی زندگی ہوتے ہیں، ان کے بغیر صرف مرا جا سکتا ہے۔

اسے افق سے پہلی نظر کی محبت ہوئی تھی۔ وہ تو شاید اندازہ بھی نہیں کر سکتا تھا کہ پری نے اسے کتنا ٹوٹ کر چاہا تھا۔ جب اس نے اسے تھپڑ مارا، تب بھی اس کا ایک لمحے کو بھی دل نہیں چاہا کہ اسے چھوڑ کر چلی جائے۔ وہ جانتی تھی وہ اس کے بغیر نہیں رہ سکتا، اس لیے اس کے باہر نکلتے ہی اس کے پیچھے آ گیا تھا۔ اظہار نہیں کرتا تھا، مگر محبت کرتا تھا۔ کتنی عجیب، خاموش محبت تھی دونوں کی ایک دوسرے کو چاہنا بھی ہے اور بتانا بھی نہیں ہے۔ کیا ایسے بھی کسی نے محبت کی ہوگی؟

برف باری ہنوز جاری تھی۔ سورج ٹھیک سے طلوع نہیں ہو پا رہا تھا۔ جانے کیا وقت ہو گا غالباً صبح کے اوّلین گھنٹے تھے۔ اس نے ریڈیو اٹھا کر سلسلہ بیس کیمپ سے جوڑا۔

''احمت! ہمیں آج رات تک ہر حال میں ڈیڑھ ہزار میٹر ڈیسنڈ کرنا ہے مگر میرے پاس صرف 80 میٹر لمبی رسّی ہے۔ باقی چودہ سو بیس میٹر میں کس طرح ڈیسنڈ کروں گی، کچھ بتاؤ'' اس کی آواز میں تھکن غالب تھی۔ وہ کوئی سپر مین تو نہیں تھی کہ اعصاب جواب نہ دینے لگتے، مگر صرف صرف اس ایک شخص کے لیے اس نے خود کو ٹوٹنے سے روک رکھا تھا۔ وہ افق کو مرنے نہیں دے گی اس نے عہد کر رکھا تھا۔

''میں کلائمبر نہیں ہوں ڈاکٹر! میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ ویسے تم نے جو رسّی پہلے لگائی تھی کہاں گئی؟''

''وہ برف میں دب چکی۔ ضائع چلی گئی۔ اگر ہوتی بھی تو کیا فائدہ تھا۔ ہم راستہ بھٹک کے راستے پر آ چکے ہیں۔ تھوڑا سا شمال کی طرف اور اب مجھے کچھ سمجھ نہیں آ رہا کہ میں 80 میٹر سے ڈیڑھ ہزار میٹر کیسے ڈیسنڈ کروں؟''

''کچھ کرو۔ کچھ سوچو۔''

''یہ ڈیتھ زون ہے۔ جوتوں میں کریمپن چڑھانے کے لیے بیس منٹ سوچنا پڑتا ہے، ڈیسنڈ کے متعلق کیا سوچوں بھلا؟'' اس کا دماغ سوچ سوچ کر پھٹا جا رہا تھا۔

''افق کیسا ہے؟''

''پاؤں میں ایک اور زخم آیا تھا۔ ابھی صاف کر کے پٹی کی ہے۔ اب سو رہا ہے۔'' اس نے ایک نظر سوتے ہوئے افق پر ڈالی۔

''اچھا۔'' وہ ہنس دیا۔

''ہنسے کیوں؟''

''افق کو پچھلی دفعہ نانگا پربت پر برفشار (avanlanche) نے 480 میٹر نیچے پٹخا تھا۔ آٹھ ایک ہی رسّی پر تھے۔ ایک گرتا تو سارے جاتے۔ مگر سارے بچ گئے۔ صرف افق کو پاؤں میں چوٹ آئی۔ اس کا باس کہتا ہے تم بے عزتی اور برفشار پروف ہو۔''

وہ ہنس دی۔

''یقین کرو ڈاکٹر! اگر تو ماز کا باس افق کے باپ کا دوست نہ ہوتا تو اب تک اس کو شوٹ کر چکا مگر اس دفعہ افق نے باس سے وعدہ کیا ہے کہ وہ راکاپوشی کی چوٹی سے کنکورڈیا اور بلتورو کی چوٹیاں دیکھ کر واپس آ جائے گا اور پھر کبھی پہاڑوں میں نہیں جائے گا۔''

''میں نے راکاپوشی کی دیوار سے وہ تمام چوٹیاں دیکھ لی ہیں اور یقین کرو، مجھے ان کے دیکھنے کی خوشی نہیں ہے۔ وہ زندگی سے زیادہ حسین نہیں ہیں اور اب مجھے زندگی کو دوبارہ چھونا ہے۔ دعا کرو ہم واپس آ جائیں اور ہاں سنو وہ کرنل فاروق کدھر ہیں؟''

''وہ بیس کیمپ میں ہیں۔ آج سارا دن یہیں رہے۔ دوربینوں سے تمہیں کھوجنے کی کوشش کرتے رہے۔''

''انہیں کہنا ہم رات تک ڈیسنڈ کرنے کی کوشش کریں گے اور پاپا کی ای میل تو نہیں آئی؟'' اس نے بے قراری سے پوچھا۔

''آئی تھی، کہہ رہے تھے کہ ارسہ کی وفات کی خبر اخبار میں پڑھی ہے۔ تمہارے لیے سخت

پریشان ہیں۔ میں نے کچھ جھوٹ سچ ملا کر تمہاری طرف سے مکمل خیریت کی اطلاع دی ہے۔

''بہت اچھا کیا اور فرید بیس کیمپ پہنچ گیا ہے؟'' اسے یہ بات پوچھنا آج یاد آیا تھا۔

''وہ تو ادھر نہیں آیا۔''

پریشے کے قدموں تلے زمین نکل گئی۔

''تو پھر، پھر وہ کہاں گیا؟'' وہ پریشان ہوگئی، ''وہ نیچے نہیں اترا؟''

''نیچے تو وہ دو دن پہلے ہی آ گیا تھا پھر کریم آباد واپس چلا گیا۔ میں سمجھا تو اس کے آنے کے متعلق پوچھ رہی ہو۔''

''احمت! تم نے میری جان نکال دی تھی۔'' اس کا دل احمت کا سر پھوڑنے کو چاہا تھا۔

پھر کتنے ہی پل گزر گئے۔ طوفان رکا نہ آہستہ ہوا۔ آسمان ویسا ہی سفید اور دھندلا تھا۔ برف باری مسلسل ہو رہی تھی۔ اگر زیادہ رسی ہوتی تو وہ دونوں طوفان میں بھی نیچے اتر سکتے تھے مگر افق زخمی ٹانگ کے بعد سب سے بڑا مسئلہ رسی کا تھا۔

افق اسی طرح سویا ہوا تھا۔ اس کی جیب سے کچھ سرخ سا جھانک رہا تھا۔ پریشے نے بڑھا کر اس سرخ کپڑے کو کھینچا۔ وہ افق کا ترکی کے جھنڈے والا مفلر تھا۔

وہ یونہی مفلر کو دیکھ کر، سوات اور کالام کے مرغزاروں میں گزرے پل یاد کرتے ہوئے ہاتھوں میں لپیٹنے لگی۔ کتنی ہی دیر وہ مفلر سے کھیلتی رہی۔ یہ وہی سرخ جھنڈا نما مفلر تھا، جو راکاپوشی پر لہرانا تھا۔ پریشے چوٹی پر رکھنے کو اپنی ماں کی تصویر لائی تھی۔ پاکستان کا جھنڈا وہ میں ہی بھول آئی تھی۔

مفلر لمبا سا تھا۔ اس نے اس کے دونوں سرے دائیں ہاتھ میں پکڑ لیے یوں کہ وہ دہرا آدھا ہو گیا۔ اب اس نے بائیں ہاتھ سے وہ جگہ پکڑی جہاں سے وہ آدھا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ کس کر کھینچے، مفلر لمبی سیدھی لکیر بن گیا پھر اس نے دائیں ہاتھ میں پکڑا ایک سرا چھوڑ دیا۔ ہاتھ میں موجود دوسرا سرا کھینچا۔ پورا مفلر اس کے ہاتھ میں آ گیا اور اب وہ سنگل ہو کر دوبارہ لمبا تھا، جب کہ بایاں ہاتھ وہیں ہوا میں خالی رہ گیا۔

''اوہ خدایا'' اس نے چونک کر سر اٹھایا، ''میں کتنی اسٹوپڈ ہوں۔ مجھے پہلے کیوں نہیں خیال آیا۔ افق، افق، اٹھو۔'' وہ مفلر چھوڑ کر اسے جھنجوڑ کر اٹھانے لگی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔

''چلو جلدی کرو۔ ہمیں یہاں سے نکلنا ہے۔ مجھے سمجھ آ گئی ہے کہ ہمیں کیسے نیچے اترنا ہے؟''

''کیسے؟'' وہ حیران پریشان سا اسے دیکھنے لگا۔ آنکھیں نیند کے باعث ابھی تک بوجھل تھیں۔

''ہم rapelling کر کے اتر سکتے ہیں۔ رسی کو ڈبل کر کے۔ میرے پاس 80 میٹر لمبا رسا ہے ڈبل کر کے اتر سکتے ہیں۔ اٹھو جلدی کرو۔''

تمام سامان بند کر کے وہ اپنی ہارنس سے افق کی ہارنس کو باندھنے لگی۔

''بیگ ہلکا ہے تمہارا؟'' افق نے یونہی پوچھ لیا۔

پریشے نے استہزائیہ انداز میں سر جھٹکا، ''کوہ پیما سب کچھ چھوڑتے اور پھینکتے جاتے ہیں صرف اوپر جانے کے لیے۔ وہ چوٹی پر پہنچ بھی جاتے ہیں مگر جب وہاں سے اپنے قدموں پر پلٹتے ہیں تو ان کے پاس واپس نیچے جانے کے لیے کچھ نہیں ہوتا۔'' اس نے کیرابینر کی مدد سے رسی کو اس کی ہارنس سے ہک کرنے کا عمل مکمل کیا اور اپنے رک سیک کو اٹھائے، افق کو سہارا دیئے، ایک کندھے پر ڈال کر کے ڈالے باہر نکل آئی۔

اسے برستے طوفان میں کام کرنا تھا، ساتھ ساتھ ایک اپنے سے وزنی مرد کا وزن بھی اپنی کمر پر اٹھانا تھا۔ وہ کوئی نازک چھوئی موئی لڑکی نہیں تھی، وہ سپورٹس وومن تھی، ایک اچھی کوہ پیما۔ جم میں ویٹ تک اٹھا لیتی تھی، کالونی میں جوگر پہن کر بھاگتی پھرتی تھی۔ وہ کوہ پیما تھی اور یہ سب کر سکتی تھی۔ اس کے باوجود کہ اس نے ایک دن سے کچھ کھایا نہیں تھا مگر اسے افق کو بچانا تھا، اس کو ہر حال میں یہاں سے نکالنا تھا۔

خیمے کے قریب اس نے پتھر میں بال برابر کریک تلاش کیا، اس میں تقریباً ایک انچ تک پی ٹون گاڑا، اس کو ٹیپ سلنگ سے باندھا، پھر رسی سے کلپ کیا اور کھینچا۔ کھنچاؤ صحیح تھا۔

اب اس نے رسی پی ٹون سے باندھی۔ ایسے کہ دونوں سرے ہاتھ میں پکڑ لیے اور افق کو لیے نیچے اترنے لگی۔ رسی اب ڈبل ہو کر چالیس میٹر رہ گئی تھی۔ وہ دونوں تقریباً چالیس میٹر نیچے اترے، پریشے نے رسی کا ایک سرا چھوڑ کر دوسرا سرا زور سے کھینچا، پوری رسی اس کے ہاتھ میں آ گئی، پی ٹون اوپر برف میں لگا رہ گیا۔ اب جہاں وہ اتری تھی وہاں اس نے بیگ سے دوسرا پی ٹون نکال کر نصب کرنا شروع کیا۔

تیز ہوائیں اوپر سے نیچے چل رہی تھیں، صورت حال سخت خراب تھی۔ افق مسلسل کراہ رہا تھا، نہ چل سکتا تھا، نہ مزید برداشت کر سکتا تھا۔ مسلسل گرتی برف سے پریشے سے بھی پی ٹون

گاڑے نہیں جا رہے تھے۔ شروع کے چند گھنٹے افق خود چل کر اترا تھا، مگر وہ بھی بہر حال
اس کی ہمت جواب دے گئی تھی۔ اب اسے پریشے سہارا دیئے اتار رہی تھی۔

"پلیز افق! ہمت کرو۔ تمہیں زندہ رہنا ہے۔ تمہیں پریشے کے لیے زندہ رہنا ہے۔"
ٹون گاڑتی اس کو ہمت دلا رہی تھی۔

"پری..... مت کرو..... مجھ میں..... ہمت نہیں ہے۔"

"میں تمہارے سر میں یہ پی ٹون مار دوں گی اگر تم نے اب ٹرٹر کی۔ چپ کر کے اترو۔" وہ جھنجھلائی۔ اترائی کے دوران ہونے والے تمام حادثوں کی تاریخ اس کے ذہن میں گردش تھی۔ کوہ پیمائی میں عموماً زیادہ تر حادثے (خصوصاً کے ٹو پر) اترائی کے دوران ہوتے ہیں ایک زخمی کے ساتھ تھی، جس میں چلنے کی سکت بھی نہیں تھی۔

برف گرتی رہی، ہواؤں کی رفتار گھٹتی بڑھتی رہی، وہ نیچے دیکھے بغیر اترتے رہے۔ راکا چوٹی کو بادل چومتے ہوئے ہوا میں تیرتے چلے جا رہے تھے۔ کوئی ان کی راہ میں بھی حائل ہو اگر چھٹ جاتا تو ہر پل بڑھتی دھند ان کی جان کی دشمن بن جاتی۔

وہ دوپہر کا وقت تھا، مگر گہری شام سی لگتی تھی۔ دھند کے باعث بار بار اس کی گلیشیئر دھندلی ہو جاتیں۔ اسے بار بار رک کر انہیں صاف کرنا پڑتا۔ افق گلاسز کے بغیر اتر رہا تھا۔ آنکھیں نیم مردوں کی طرح ادھ کھلی تھیں۔ وہ شدید تکلیف میں تھا، اس کی ٹانگ ٹوٹی ہوئی اور شدید سردی کے باعث اس کا زخم خراب ہو رہا تھا مگر جانے کیسے وہ برداشت کر رہا تھا بہادر انسان تھا۔

"بس ہمت کرو افق! ابھی ہمارے پہنچتے ہی کرنل فاروق اپنا ہیلی کاپٹر لے کر آ جائیں گے بس چند گھنٹوں کی بات ہے۔" وہ بمشکل سانس لیتے افق کی ہمت بڑھا رہی تھی۔

ایک جگہ وہ گلیشیئر گلاسز صاف کرنے رکی تو افق زور سے کھانسا۔ اس کے ذہن میں الارم بجا، "ایڈیما!"

مگر صد شکر کہ وہ ایڈیما نہیں تھوڑا سا تنفس پرابلم تھا۔ ایڈیما ہوتا تو بھی ہمالیہ کی بلندیوں کے بعد دوسرا "آبِ حیات" اس کے پاس میڈیکل کٹ میں تھا۔

Dexamethasone کی سرنج، جو ایڈیما کے خلاف واحد ہتھیار تھی اور پانی کے بعد حیات تھی۔

راکاپوشی پر دھیرے دھیرے شام اترنے لگی۔ ان کے اطراف میں موجود دیوہیکل سیاہ اور پہاڑ دھند کے پردے میں خاموشی میں ڈوبے تھے۔ ہزاروں میٹر نیچے دلکش وادیاں پھیلی تھیں۔ وہاں فرید کا کریم آباد بھی تھا، جس کے باسیوں کو علم بھی نہ تھا کہ وہ دو نفوس شام کی نیلگوں میں اترائی کا سفر..... زندگی کا سفر کر رہے ہیں۔ آئے دن کوہ پیماؤں کے مرنے کی خبریں مل جایا کرتی تھیں، کریم آباد کے باسیوں کے لیے یہ معمول کی بات تھی۔

پھر اندھیرا پھیلنے لگا۔ انہیں اس سفر میں جتنی دیر ہو چکی تھی، اس میں کوئی آدمی لاہور سے پنڈی جا کر واپس لاہور بھی آ سکتا تھا اور ان سے ابھی تک ایک کلومیٹر نہیں طے ہو پایا تھا۔ جو سفر صاف موسم میں وہ چند گھنٹوں میں کر سکتے تھے، وہ اب تین گنا زیادہ وقت لے رہا تھا۔ وہ بار بار میٹر چیک کرتی، مگر سوئی ابھی چھ ہزار کے ہندسے سے اوپر تھی۔

دفعتاً طوفان نے زور پکڑنا شروع کر دیا۔ برف پھر سے جاگ اٹھا۔ برف باری میں شدت آ گئی اور بالآخر افق کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ اترتے اترتے وہیں برف پر نڈھال سا ہو کر گر گیا۔

"نہیں اور نہیں..... تم بے شک جاؤ، میں اور نہیں۔" طویل سانس لیتا وہ بے ربط جملے کہتا نے پر پڑا تھا۔ پریشے نے پریشانی سے میٹر دیکھا۔ 6320 میٹر۔

"بس ڈھائی سو میٹر اور افق۔"

"نو نیور..... تم جاؤ..... مجھے..... مجھے ادھر ہی مرنے دو..... میں اور نہیں جا سکتا۔" وہ اکھڑتی سانسوں کے درمیان نفی میں سر ہلاتے ہوئے انکار کر رہا تھا۔

وہ جگہ بالکل عمودی تھی، جیسے کسی تکون کی ایک سائیڈ ہوتی ہے یا جیسے کسی چھت کی منڈیر۔ چند قدم آگے بڑھتے تو نیچے گر جاتے۔ وہاں تو خیمہ بھی نصب نہیں کیا جا سکتا تھا۔

طوفان ہر گزرتے پل وحشی ہو رہا تھا۔ برفیلی ہوا ہڈیوں میں گھس کر خون منجمد کر رہی تھی مگر افق اب ایک انچ نیچے نہیں اترنا چاہتا تھا۔ پریشے نے کھینچ کر رسی کو اپنے ہاتھ میں کر لیا اور فولڈ کر کے ایک کندھے پر ڈال لیا۔ اب اسے خیمہ گاڑنے کو جگہ ڈھونڈنی تھی۔ کون کہہ سکتا تھا کہ یہ وہی پریشے ہے، جو چھوڑے سے ڈرتی تھی؟

اس نے افق کو برف میں دونوں اطراف سے رسی گزار کر باندھ دیا، ایک اور ڈھیلا سا prusik بھی برف کی دیوار میں نصب کر دیا تاکہ وہ نہ گرے۔ اس کی "سیفٹی روپ" کا کھنچاؤ چیک

کر کے وہ خیمے کی جگہ ڈھونڈنے کی خاطر تاریکی اور طوفان میں، گھٹنوں کے بل برف پر
ادھر آئس ایکس مارتے ہوئے کوئی پلیٹ فارم تلاش کرنے لگی۔

کم بصارت، گہری سفید تاریکی اور ہڈیوں کو کھاتی سردی اس کو چند ہی منٹ بعد واپس
کے پاس لے آئی۔ وہ اس خطرناک سلوپ پر زیادہ دور نہیں جا سکتی تھی۔ اگر سکاٹ فشر نے
ہمالیہ میں اندھیرا آپ کا دوست نہیں ہوتا تو بالکل درست کہا تھا۔

وہ ویسے ہی دیوار کے ساتھ بندھا بیٹھا تھا جیسے وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ آنکھیں بند تھیں
کندھے پر ڈھلکی تھی، چہرے پر بڑھی شیو میں برف کے ذرّات پھنسے تھے۔

وہ تھک کر اس کے بالکل ساتھ گھٹنوں کے بل دوزانو بیٹھ گئی۔ طوفان کا ناقابلِ برداشت
اس کے کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا۔

''یہ سوا چھ ہزار میٹر ہے، آئی تھنک ہیلی کاپٹر ادھر آ سکتا ہے۔'' رک رک کر ہانپتے ہوئے
بولی۔ افق نے جواب میں کچھ نہ کہا۔

''افق؟'' اس نے ڈرتے ڈرتے اس کا کندھا ہلایا مگر اس کے وجود میں جنبش نہ ہوئی۔

''افق؟'' اس نے پھر پکارا۔

''ہوں؟'' بہت پست آواز میں اس نے جواباً ہنکارا بھرا۔ پریشے کو سکون ہوا۔

''درد ہو رہا ہے؟''

''نہیں۔'' اس کی آواز سے ہی درد پنہاں تھا۔

''بس تم فکر مت کرو۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔'' وہ افق کے بائیں جانب بیٹھی، اس
بایاں بازو مضبوطی سے پکڑے ہوئے تھی۔ وہ سہارا دے رہی تھی، یا سہارا لے رہی تھی،
اندازہ نہ کر پائی۔

آسمان تک سفید دھند پھیلی تھی۔ جانے ہیلی کاپٹر کب آئے گا؟

اس نے کمر پر بندھے رک سیک میں سے ریڈیو نکالا۔

''کم ان بیس کیمپ۔'' ہاتھ اتنے منجمد تھے کہ بٹن نہیں دبایا جا رہا تھا۔

''آئی ایم ہیئر۔'' احمت کی آواز غنودگی سے بھری تھی۔

''احمت، ہم کوئی سوا چھ ہزار میٹر پر ہیں۔ یوں کرو، میری کرنل فاروق سے بات کراؤ
انہیں لوکیشن دیتی ہوں۔''

''کرنل فاروق وغیرہ تو چلے گئے۔''

پریشے کو لگا اس نے غلط سنا ہے۔

''کہاں چلے گئے؟''

''واپس...... سکردو!''

بلتورو کا پورا گلیشیئر اس کے سر پر پھٹا تھا۔ وہ گنگ سی ریڈیو کو دیکھنے لگی۔

''وہ...... وہ کیسے چلے گئے؟ انہوں نے تو...... انہوں نے تو ہمیں ریسکیو کرنا تھا۔ وہ کیسے؟''
کے لبوں سے الفاظ ادا نہیں ہو پا رہے تھے۔ قوت گویائی جیسے سلب ہو کر رہ گئی تھی۔

''وہ کہہ رہے تھے کہ موسم خراب ہے۔ کوئی فیول کا بھی پرابلم تھا۔ آئی ڈونٹ نو۔ بس صبح ہی صبح
واپس چلے گئے تھے۔''

تب پہلی بار پریشے کو احساس ہوا کہ وہ اس برف باری اور طوفان میں کھلے آسمان تلے ایک
کے ساتھ تنہا پڑی ہے۔

''احمت! وہ کیسے جا سکتے ہیں؟ ہم نے ان کے کہنے پر ڈیسنڈ کیا اور وہ، وہ...... ہمیں چھوڑ کر
گئے؟ کیوں؟'' اس کا دل پھوٹ پھوٹ کر رونے کو چاہ رہا تھا۔ وہ ایک چھ فٹ کے لمبے
مرد کا وزن اٹھائے جانے کتنے گھنٹے پہاڑ کی ڈھلان سے نیچے اترتی رہی تھی، وہ گھنٹے جو
صدیوں پر بھاری تھے اور اب احمت کہہ رہا تھا ''وہ چلے گئے؟''

''تم حوصلہ مت ہارو۔ ہو سکتا ہے وہ صبح تک آ جائیں۔ تم نے ویسے اتنا زیادہ سفر نیچے کو
کیا؟''

''رسی کو rapell کر کے۔''

''وہ کیا ہوتا ہے؟''

''تمہارا سر ہوتا ہے۔'' وہ زور سے چلائی۔

''مجھ پر کیوں غصہ ہو رہی ہو؟ میں ادھر بیس کیمپ میں اکیلا پڑا، سارا دن اس منحوس راکاپوشی کا
چہرہ دیکھتا رہتا ہوں۔ شاید تم سے زیادہ سفر کر رہا ہوں۔'' وہ خفا سا ہو گیا۔

''تم غلط موقع پر غلط بات کیوں کرتے ہو؟'' وہ بجائے سوری کرنے کے الٹا اس پر خفا ہوئی۔

''اچھا تم نیچے اترنے کی کوشش کرنا۔''

''جیسے مجھے یہ معلوم ہی نہیں ہے؟ خدا کے لیے احمت یہاں حالات بہت خراب ہیں۔ برف

کی کنڈیشن بہت بری ہے اور افق زخمی ہے۔ ہم میں مزید رسی سے نیچے اترنے کی ہمت نہیں ہے۔ وہ زور سے چلائی۔

''اچھا ہمت مت ہارو، وہ صبح تک آتے ہی ہوں گے۔ تم بس ہر دو گھنٹے بعد پانی کا آدھا کپ

''پتا ہے مجھے۔ تم دنیا کے واحد ڈاکٹر نہیں ہو۔'' اس نے ریڈیو بند کر دیا۔

علاوہ ایک ہنزو کٹر باورچی کے وہ تن تنہا بیس کیمپ میں پڑا اپنے سفارت خانے سے لے کر تک جس کسی سے بات کر سکتا تھا، کر چکا تھا۔ بہت کم وقت میں اس نے فوج تک سے رابطہ کیا مگر یہ انتہائی بلندی کا اثر تھا یا شدید احساس بے بسی و خود ترسی کہ پریشے کو لگ رہا تھا کہ اجنبی پاکستان آرمی دونوں اس کے معاملے میں دلچسپی نہیں لے رہے۔ غصہ نکالنے کو وہ ریڈیو واپس بیگ میں رکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

''پاکستان آرمی سے اتنا نہیں ہوتا کہ......''

''پاکستان آرمی نے ہماری منت نہیں کی تھی کہ خدا کے لیے اگست میں راکاپوشی کلائمب کرو۔ ہماری غلطی تھی، ہم خود ادھر آئے تھے وہ ہمارے لیے جتنا کر سکتے تھے، کر چکے۔ اس سے زیادہ وہ......'' تیز تیز بولتے ہوئے وہ کھانسنے لگا۔ کھانسی رکی تو اس نے دوبارہ برف سے کمر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔

وہ شرمندہ سی ہوگئی۔ شاید وہ خالص پاکستانی تھی، تب ہی بہت جلدی شدید بدگمان ہو جاتی تھی۔

وہ دونوں ابھی تک کھلے آسمان تلے برف کی دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھے تھے۔ ہر پل گرتی حرارت، مسلسل جاری طوفان اور برف باری سے بچاؤ کے لیے انہیں پناہ گاہ چاہیے تھی۔ وہ پناہ گاہ کہاں سے حاصل کرے، یہ سوچتے ہوئے اس نے پیچھے برف کی دیوار سے کمر ٹکائی۔ اس بلندی پر سوچنا انتہائی کٹھن کام تھا مگر جیسے ہی اس کی کمر پیچھے برف سے مس ہوئی اس نے بے اختیار گردن گھما کر پیچھے دیوار پر جمی برف کو دیکھا۔

یہ تازہ پڑی برف تھی مگر اس کے پیچھے بھی یقیناً ڈھیروں برف تھی۔ اس وقت اسے آسمان سے گرتی برف سے پناہ لینی تھی اور یہ پناہ اسے صرف ایک چیز دے سکتی تھی اور وہ تھی دیوار پر جمی برف۔ سارے دن کی تھکاوٹ کے باوجود وہ نئے سرے سے رخ دیوار کی طرف پھیر کر آئس زور زور سے برف میں مارتی ہوئی اسے کھودنے کی کوشش کرنے لگی۔ کچھ برف ٹوٹی، کچھ ذرات اڑ کر اس کے چہرے اور بالوں میں آ پھنسے۔ وہ پوری قوت صرف کرتے ہوئے دیوار

بنانے لگی پورا دن افق کو سہارا دینے کی مشقت کے باعث اس کی کمر شدید درد کر رہی تھی۔ وہ اسی طرح دیوار سے بندھا، آنکھیں بند کیے بیٹھا تھا اور بیٹھے بیٹھے سو بھی گیا تھا یا پھر شاید کچی نیند میں تھا، جب پریشے نے اسے جگایا۔

''اٹھ جاؤ۔ میں نے ہم دونوں کے لیے ایک زبردست اپارٹمنٹ تیار کیا ہے، جس کا ویو بہت ہی اچھا ہے۔ ذرا موسم ٹھیک ہو تو اس سے پورا اقرا قرم نظر آتا ہے۔ اب ہمیں اس میں شفٹ ہونا ہے۔ دیکھو اور داد دو کہ میں کتنی اچھی آرکیٹیکٹ ہوں۔''

وہ پہلی خوش گوار بات تھی جو اس نے انتہائی ناخوش گوار ماحول میں کہی اور افق کی رسیاں کھولنے لگی۔ ''یوں لگتا ہے جیسے میں نے تمہیں اغوا کر کے ادھر باندھ رکھا ہو۔'' وہ اپنی بات پر خود ہی ہنس دی۔ وہ نیم غنودگی کے عالم میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ شاید اسے لگا تھا کہ پریشے کا دماغ چل گیا ہے۔ کہاں وہ اتنی پریشان ہو رہی تھی اور کہاں اس کی حسِ مزاح ایک دم جاگ اٹھی تھی۔

وہ افق کو یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اسے کسی نہ کسی طرح خود کو اور اسے اس ظالم پہاڑ کے اوپر چڑھی برف کی چادر میں کھود کر بنائے گئے اس چھوٹے سے سوراخ میں زندہ رکھنا تھا۔ ہنس کر نہیں تو رو کر...... رو کر نہیں تو ہنس کر۔

برف کی عمودی دیوار میں اس نے سرنگ بنائی تھی، ویسی جیسے سی ٹی سکین کے لیے مریض کو سرنگ میں سے گزارا جاتا ہے۔ وہ اتنی تھی کہ دو آدمی اس میں کمر ٹکا کر، ٹانگیں سامنے پھیلائے بیٹھ سکتے تھے۔ برف سے انسان کو صرف برف بچاتی ہے جیسے ہیرا ہیرے کو کاٹتا ہے چوں کہ برف نسبتاً گرم ہوتی ہے اس لیے برفانی غار کسی بھی گورٹیکس کے خیمے سے زیادہ گرمائش فراہم کرتا ہے۔

اگر ان کے پاس دو سلیپنگ بیگز ہوتے تو اسے غار کھودنے کی ضرورت نہ رہتی۔ وہ دونوں کھلے آسمان تلے طوفان کے باوجود صرف سلیپنگ بیگ میں بھی گزارا کر سکتے تھے، لیکن کہ ایک سلیپنگ بیگ برفشاران سے چھین چکا تھا سو وہ کافی دیر کی محنت سے تیار کیے غار تک اسے کھینچ لائی۔ خود دو زانو ہو کر بیٹھ گئی اور اسے لٹا دیا۔ افق کے جوگرز غار کے دہانے سے کافی باہر نکلے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی اونچے ریفریجریٹر کے اوپر بنے ڈیپ فریزر میں رکھی ہے جس کا ڈھکن سامنے سے کھول دیا گیا ہے۔ وہ برفانی غار ایسا ہی تھا۔

اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ پرانے وقتوں میں واپس چلی گئی ہو، جب انسان غاروں میں پناہ

لیا کرتا تھا، جب زخمیوں کے لیے مرہم نہیں ہوا کرتے تھے، جب تہذیب کا کوئی وجود نہیں تھا۔

سوچتے سوچتے اسے جلد ہی نیند نے آن گھیرا۔ خواب میں اس نے خود کو قدیم زمانہ
پایا۔ وہ ایک لکڑہارے کی بیٹی تھی اور ایک زخمی سپاہی کو لیے غار میں چھپی بیٹھی تھی۔ دشمن کی
دونوں کے تعاقب میں آ رہی تھی۔ دوڑتے گھوڑوں کے ٹاپوں کی بلند آواز اس کی سماعتوں
ہتھوڑے برسا رہی تھی۔

اس کی آنکھ کھل گئی۔ قدیم وقتوں کا سارا رومانس غائب ہو گیا۔ جسے وہ گھوڑوں کی آواز
رہی تھی، وہ طوفان کا شور تھا۔ وہ کسل مندی سے قدرے سیدھی ہوئی۔ برفانی غار اب رات کی
زیادہ گرم تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے ہی سو گئی تھی، افق بھی ساتھ ہی لیٹا تھا۔ فرق یہ تھا کہ اس نے اپنا
چھوٹے سے بیمار بچے کی طرح پریشے کے گھٹنے پر رکھا ہوا تھا اور گہری نیند میں پرسکون نیند
واقعی معصوم سا بچہ لگ رہا تھا۔

باہر طوفان کے شور میں اس کے کان کسی اور آواز کو سننے کے متمنی تھے۔ ہیلی کاپٹر کے پروں
بھاری گڑگڑاہٹ، آرمی ایوی ایشن کے سبز ہیلی کاپٹر کی ایک جھلک ہی اس کو از سرِ نو زندگی
کے لیے کافی تھی۔

"وہ آتے ہی ہوں گے۔" کھوجتی نگاہوں سے دور دور تک دھند میں دیکھتے ہوئے وہ
تسلی دے رہی تھی مگر "زمین" سے انہیں بچانے کوئی نہیں آیا۔

دونوں جانے کتنے گھنٹے اس برفانی غار میں پڑے سردی سے ٹھٹھرتے رہے۔ وہ غار
جائے پناہ کم اور برفانی تابوت زیادہ لگ رہا تھا۔

افق اٹھ گیا تو اس نے چائے بنا کر خود بھی پی اور اسے بھی دی۔ چائے کیا تھی بغیر شکر اور
کے قہوہ سا تھا۔ افق نے کپ پکڑ کر کہنیوں کے بل قدرے بیٹھ کر چائے کے تلخ گھونٹ اپنے
سے اتارے اور پھر کپ خالی کر کے سائیڈ پر ڈالا اور دوبارہ پریشے کے گھٹنے پر سر رکھ کر لیٹ گیا۔

پتا نہیں کیا وقت تھا، کیا تاریخ تھی، کون سا مہینہ اور کون سی صدی تھی، وقت کا حساب
بھی اب بھولتا جا رہا تھا۔

"پری!" افق نے اسے پکارا۔ وہ نیم وا آنکھوں سے برفانی غار کی چند انچ دور سفید چھت
تک رہا تھا۔ "سو رہی ہو؟"

"نہیں! سو نہیں رہی یونہی تھک گئی ہوں۔" وہ پیچھے کمر ٹکائے، آنکھیں موندے بیٹھی تھی۔

"میری جان بچانے کا شکریہ۔ تم نہ ہوتیں تو میں مر جاتا۔"

"اور تم نہ ہوتے تو شاید میں بھی مر جاتی۔" وہ کرب سے مسکرائی۔

پھر کتنے ہی پل خاموشی کی نذر ہو گئے۔

"پری؟ سو گئیں کیا؟" اس نے پھر پوچھا۔

"نہیں۔" آواز بے حد ہلکی تھی۔

"پھر بولتی کیوں نہیں؟ مجھ سے باتیں کرو، تاکہ مجھے لگے کہ میں اس برفانی تابوت میں اکیلا نہیں ہوں۔" وہ یوں کہتا اس وقت کوئی ڈرا سا بچہ لگ رہا تھا۔ اس حاضر جواب اور شوخ افق سے مختلف جس سے وہ یونہی ایک شام مارگلہ کی پہاڑیوں پر ٹکرا گئی تھی۔ اسے اس پر بہ یک وقت ترس بھی آیا اور رونا بھی۔

"کیا بولوں؟ تمہیں درد ہو رہا ہے؟"

"ہر وقت یہی کیوں پوچھتی ہو؟"

"اور کچھ سوجھتا ہی نہیں۔"

غار میں ایک بار پھر خاموشیاں راج کرنے لگیں۔

وہ کافی دیر کچھ نہ بولا تو پریشے نے آنکھیں کھول دیں۔ وہ اسی طرح لیٹے ہوئے، دونوں ہاتھوں میں ایک چھوٹی سی تصویر پکڑے بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ حنادے مر چکی تھی، باوجود اس کے وہ تصویر افق کے ہاتھوں میں دیکھ کر اس کے کہیں بہت اندر درد کی ٹیسیں اٹھی تھیں۔

"پری!" اس کی آواز بے حد دھیمی تھی، "تم نے کل یہ کیوں کہا کہ میں نے تمہیں حنادے سمجھا؟ تم...... تمہیں میں نے کبھی حنادے نہیں سمجھا۔ تم پریشے ہو، تم حنادے ہو ہی نہیں سکتیں۔"

وہ بے ربط فقرے نہیں بول رہا تھا۔ یہ گرم چائے کی بخشی توانائی کا اثر تھا۔ وہ جواباً خاموش رہی۔ اسے کچھ بھی نہیں پوچھنا تھا۔ اب افق کو ہی سب کچھ بتانا تھا۔

"جانتی ہو لوگ کے ٹو کو سفاک پہاڑ کہتے ہیں، بالکل ٹھیک کہتے ہیں۔

وہ ایسا ہی ہے۔ وحشی اور ظالم، میں ایورسٹ نہیں، راکاپوشی نہیں، کے ٹو کا عاشق تھا۔ کے ٹو قراقرم میں بسنے والے شاگوری بولتے ہیں اور اب میرے لیے اس کا نام بولنا بھی تکلیف دہ ہے۔"

وہ کہتے کہتے کھانسنے لگا۔ کھانسی رکی تو پھر سے کہنے لگا "حنادے میرے چچا کی بیٹی تھی۔ بہت

خوب صورت، بہت مکمل اور بہت آرٹیفیشل۔ اس کی پرفیکشن کے متعلق تو تم تصور بھی نہیں کر سکتے ہمیشہ ٹپ ٹاپ میں رہتی تھی، بنی سنوری، فل میک اپ میں...... وہ بہت سیکولر اور آزاد خیال تھی ہمارے درمیان پہلا فرق تھا، کیوں کہ میں آزاد خیال نہیں، روشن خیال ہوں اور بھی کئی فرق تھے وہ جیسے ذہن پر زور دے کر یاد کر کے بتا رہا تھا۔

''ہمارے خیالات کبھی نہیں ملے۔ وہ مجھ سے بہت اختلافات کرتی تھی۔ (غالباً افق لڑتی تھی، کہنے سے احتراز برت رہا تھا)۔ وہ ہوتے ہیں نا کچھ لوگ جنہیں بات ''نہیں'' سے شروع کرنے کی عادت ہوتی ہے۔ وہ بھی ایسی ہی تھی، ہماری شادی چار سال پہلے ہوئی تھی۔ وہ امریکہ سے آئی تھی اور واپس وہیں جانا چاہتی تھی، مگر میں ترکی اور اپنے پیرنٹس کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا تھا۔

شادی کے وہ دو سال میری زندگی کے بدترین سال تھے۔ اس میں ایک اہم کردار احمت دوران کا بھی تھا۔

احمت کو بچپن سے بھانڈا پھوڑنے کی عادت ہے۔ ہو سکتا ہے تمہارا خیال ہو کہ وہ بہت معصوم بے وقوف اور سیدھا ہے۔ حالاں کہ میں اسے پچھلے اٹھائیس سال سے جانتا ہوں۔ وہ میرا ا ہے اور بہترین دوست بھی۔ احمت حقیقت میں انتہائی تیز اور عقل مند ہے۔ وہ جان بوجھ کر بھا پھوڑتا ہے۔ میری اور جینیک کی اس سے لڑائی ہو گئی تو اس نے جھٹ ڈاکٹرز کو پیٹر آنسرز کے بتا دیا۔ اس دن دیکھا نہیں تھا تم نے کہ میں نے ذرا اکتا کر بات کی اور میرے جانے کے بعد نے فوراً تمہیں پیٹر کی اصلیت بتا دی۔ یہ اس کی پرانی عادت ہے۔ شکل پر بھول پن ہونے اس پر شک نہیں کر سکتا۔

ہاں زندگی میں صرف ایک دفعہ حنا دے کے سامنے احمت کے منہ سے غیر ارادی طور پر بات پھسل گئی تھی۔ ''قراقرم اور ہمالیہ کی پریوں'' کی بات۔ اس نے بعد میں ہاتھ جوڑ کر مجھ معافی مانگی مگر نقصان ہو چکا تھا۔ حنا دے نے پریوں کی جستجو کے متعلق جاننے کے بعد کبھی مجھ اعتبار نہیں کیا۔ وہ اٹھتے بیٹھتے مجھے طعنے دیتی تھی۔''

طوفان کا خوف ناک شور ہنوز جاری تھا۔ اس کی آواز اس شور کے باعث دھیمی لگتی تھی۔

''پھر شادی کیوں کی تھی اس سے؟''

''میری ماں کی خواہش تھی۔ اس کا خیال تھا کہ میں ایک کلائمبر ہوں، تو صرف ایک کلائمبر ساتھ ہی خوش رہ سکوں گا۔ حنا دے بہت زبردست امریکن کلائمبر تھی۔ اس سے پہلے میری ایک لڑکی آئی تھی، میری سکول فیلو ہدیٰ۔ مجھے گمان گزرا تھا کہ وہ میری آئیڈیل ہے، اس چھوٹا سا افیئر بھی چلا، مگر وہ میری آئیڈیل نہیں تھی۔ یونہی ایک کرش تھی۔ میں کوئی بہت ہیرو نہیں ہوں، جس کی اٹھائیس سالہ زندگی میں کوئی لڑکی نہ آئی ہو۔ چھوٹے موٹے افیئر ز انسان کی زندگی میں ہوتے ہیں، پھر حنا دے آئی۔ میرا خیال تھا کہ میں اپنی جستجو میں ناکام ہو گیا مجھے شادی کر کے نارمل انسانوں کی طرح رہنا چاہیے۔ اس لیے اس سے شادی کی تھی۔ وہ نہ بھی شاید اب تک ہماری علیحدگی ہو چکی ہوتی اور میں اس کے لیے حساس نہیں ہوں، بس اس کا ذکر اچھا یا برا، کرنا یا سننا پسند نہیں کرتا۔''

برفانی غار میں ایک دفعہ پھر خاموشی چھا گئی۔

''افق۔'' کچھ دیر بعد وہ بولی، ''کے ٹو پر کیا ہوا تھا؟ تم دو سال پہلے ادھر حنا دے کے ساتھ کے ٹو سر کرنے آئے تھے ناں؟''

کتنی ہی دیر وہ خاموش رہا، اس کی آنکھوں میں عجیب سا خوف اور کرب در آیا تھا۔

''برفانی طوفان آیا تھا۔ وہ بھی ڈیسنڈ کے دوران، کے ٹو کا ڈیسنڈ...... بہت مشکل...... بہت مشکل۔ جتنے لوگ کے ٹو سر کرتے ہیں، کم بہت کم واپس آتے ہیں۔ ایک تہائی واپس آتے ہیں۔ کے ٹو فتح کرنا بڑا کام نہیں۔ اسے فتح کر کے واپس آنا بڑا کام ہے۔'' وہ پھر کھانسنے لگا۔ اس کے الفاظ بے ربط ہو رہے تھے۔ کافی دیر بولنے کے باعث اس کی توانائی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ ''وہ کے ٹو کا طوفان تھا۔ ایورسٹ، نانگا پربت، براڈ پیک، راکاپوشی، سب کا طوفان ایک سا ہوتا ہے مگر کے ٹو کا طوفان بہت برا ہوتا ہے۔ میرا ٹیچر کہتا تھا کہ اگر کے ٹو پر طوفان آ جائے تو اپنا سب کچھ برف پہ چھوڑ دو اور بھاگو۔ اپنی زندگی کے لیے بھاگو۔ وہ طوفان بہت خطرناک تھا اور ڈیسنڈ کے دوران ویسے میں آکسیجن کے بغیر کلائمب کرتا ہوں مگر مجھے سیریبرل ایڈیما ہو گیا تھا۔ دماغ میں سوجن ہو گئی تھی۔ ہوا ایک آکسیجن کنٹینر ساتھ رکھا ہوا تھا۔

میں اور حنا دے ساتھ ساتھ تھے۔ اس کی آکسیجن ختم ہو گئی۔ مجھے ایڈیما ہو گیا تھا۔ مجھے آکسیجن کی ضرورت تھی اور میں نے ماسک چہرے پر لگا رکھا تھا۔ وہ ڈیتھ زون تھا۔ آٹھ ہزار تین سو میٹر، یا شاید اس سے بھی اوپر، دن تھا یا رات، مجھے یاد نہیں، بس میں ایک جگہ نڈھال ہو کر گر گیا۔ حنا دے کو آکسیجن چاہیے تھی، وہ بغیر آکسیجن کے بھی ڈیسنڈ کر سکتی تھی مگر اس نے پھر بھی میرا ماسک، میرا ریگولیٹر اور ڈکٹر، سب میرے چہرے سے نوچ لیا اور نیچے چلی گئی۔ وہ میری ساتھی کلائمبر نہیں

تھی، وہ میری بیوی تھی۔ مگر پھر بھی اس نے ایسا کیا۔ میں بغیر آکسیجن کے تین گھنٹے برف پر کے ٹو کے طوفان کے دوران......

حنادے نے کیمپ فور میں جا کر میرے متعلق بتایا کہ میں لاپتا ہو چکا ہوں۔ مجھے تین گھنٹے اس مقام سے ایک دوسری مہم کے گائیڈ نے اٹھایا اور نیچے لے آیا۔ گرم چائے اور ڈیکس لگائے۔ میرا ایڈیما بدتر ہو رہا تھا۔ میں نیم مردہ تھا۔ وہی گائیڈ مجھے اٹھا کر چھ ہزار زاویے پر لے کر آیا، جہاں میجر عاصم نے ہیلی کاپٹر کے ذریعے مجھے پک کیا اور پھر نیچے لے آئے۔ میرے دونوں ہاتھ پاؤں فروسٹ بائٹ ہو چکے تھے۔ نقصان صرف انگلیوں کو ہوا، پاؤں بچ گیا۔ بہت حیرت انگیز جدوجہد کی تھی عاصم نے...... دوستی کا حق ادا کر دیا تھا۔ ملٹری، ہماری ملٹری سے بہت بہتر اور بہادر ہے...... مجھے وہ لمحے نہیں بھولتے، جب میں گائیڈ کے ساتھ نیم بے ہوش پڑا تھا اور مرنے ہی والا تھا کہ دور افق میں سبز ہیلی کاپٹر اڑتا ہوا نظر وہ لمحہ میرا ''دوسرا جنم'' تھا۔ میں پھر سے زندہ ہوا تھا۔ عاصم میرا ابلتورو میں دو دفعہ لیزان آفیسر تھا۔ اس نے دوستی کا حق ادا کیا۔''

''اور حنادے؟''

''وہ ڈیسنڈ کے دوران کیمپ تھری سے آگے برفشار کا شکار ہو گئی۔ اس کی رسی تک ٹوٹ کیوں کہ برفشار کا زور بہت شدید تھا۔ وہ برف میں گم ہو گئی۔ اس دن کے بعد پھر حنادے کو کسی کے ٹو پر نہیں دیکھا۔ گلگی میموریل قبرستان میں دفن کرنے کے لیے اس کی لاش بھی نہیں ملی۔ کے ٹو کو سفاک پہاڑ کہتے ہیں، ٹھیک کہتے ہیں۔'' وہ طویل سانس لے کر خاموش ہو گیا۔

''تم خواب میں بھی ڈر جاتے ہو ناں؟''

افق نے شدید کرب سے آنکھیں میچ لیں۔

''بس خواب پیچھا نہیں چھوڑتے۔ میں ہمیشہ خود کو اس مقام پر دیکھتا ہوں، جہاں حنادے چھوڑ کر جا رہی تھی۔ میں ہمیشہ اس سے اپنا آکسیجن کنٹینر مانگتا ہوں، مگر وہ نہیں دیتی، میری آکسیجن نہیں دیتی۔ وہ مجھے چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ مجھے برف میں تنہا چھوڑ کر، سانسیں لے جاتی ہے جب مجھے خواب میں یہ سب آتا ہے تو میرا جی چاہتا ہے میں پھوٹ پھوٹ روؤں۔ کیا کوئی اتنا بھی سفاک ہو سکتا ہے، جتنی وہ تھی؟''

لمحے خاموشی سے سرکتے رہے۔ باہر ہوتی برف باری غار کا دہانہ بند کرنے کی سعی کر رہی

بار بوٹ مار کر گول دہانے پر اکٹھی ہوتی برف گرا دیتا۔

''بس شام تک، ہمارے ڈیسنڈ کے متعلق علم ہوتے ہی وہ آ جائیں گے۔ بس آتے ہی ہوں

اس کی بے قرار متلاشی نگاہیں غار سے باہر نظر آنے والے دھند میں لپٹے افق پر بھٹک رہی انتظار کے لمحے طویل ترین ہوتے جا رہے تھے۔ دنیا کا سب سے کٹھن کام انتظار کرنا ہے۔ چوٹی پر یہ اور بھی کٹھن تھا۔

''بس شام تک وہ آ جائیں گے، افق۔ ڈونٹ یو وری!''

پھر شام بھی ڈھل گئی اور ان دیوہیکل سیاہ پہاڑوں پر رات اترنے لگی مگر جنہیں نہ آنا تھا، وہ آئے۔

یقین ڈگمگا رہا تھا، حوصلہ پست ہونے لگا تھا، پھر بھی وہ اپنی اور اس کی ڈھارس بندھا رہی تھی۔

رات گہری ہوتی چلی گئی۔ انہیں بغیر کچھ کھائے یہ تیسرا دن تھا، جو اپنے اختتام کو پہنچ رہا تھا۔ ایندھن کی صرف ایک آخری بوتل بچی تھی، جو اس نے یوں مضبوطی سے پکڑ رکھی تھی جیسے ہفتِ کے خزانوں کی کنجی ہو۔ بس ایک دن کے پانی کی گیس۔

''پاؤں تلے زمین کھینچ لی جائے اور سر سے آسمان ہٹنے لگے تو کیسا محسوس ہوتا ہے، مجھے آج علم ہے۔ جانے کب میں اس لطیف ہوا سے نکلوں گی اور خالص آکسیجن سے بھرپور ہوا میں سانس لوں گی۔'' پریشے کے اعصاب اب جواب دینے لگے تھے۔ افق بند آنکھوں سے مسکرایا۔

''چار سال قبل مارچ میں، میں نے ایورسٹ سر کیا تھا۔ موسم اتنا خوشگوار تھا، میری ایورسٹ کی یہ تھی جیسے کوئی رولر کوسٹر پر چڑھے اور رائیڈ لے کر کالر جھاڑتا اتر جائے۔ چوٹی پر میرے ہمراہ ٹ کے نزدیک واقع شرپا گاؤں (Sherpas Village) کا جو شرپا آیا تھا، اس کا نام بابو شرپا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ چوٹی پر سنہری پریاں دکھائی دیتی ہیں۔ یقین کرو میں نے خود چوٹی پر سنہری پریوں کو رتھ پر سوار، سورج سے چھومولنگما کی چوٹی پر اترتے دیکھا تھا۔ شاید وہ تھا جو بلندیوں پر رہا کرتا ہے۔ پریوں کا رتھ دیکھ کر میں کافی دیر وہاں کھڑا رہا تو بابو شرپا ہوا۔ اس نے چلا کر مجھ سے کہا، ''تم ادھر زیادہ دیر نہیں کھڑے ہو سکتے۔ یہ تمہارا ٹھکانا نہیں ہے، یہ ہمارا ساگرماتا ہے۔ دنیا کی دیوی ماں...... اس کی عزت اور احترام کرو۔''

میں نے واقعی اس کا احترام کیا۔ بابو نے مجھے ٹشو پیپر کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے تھمائے بدھا کی عظمت کی دعائیں لکھی تھیں۔ وہ دعائیں بابو کو بدھ مت کے بھکشوؤں نے دی تھیں،

تا کہ وہ دیوتاؤں کے اعزاز میں ساگر ماتا کی فضا میں انہیں بکھیر دے۔ اس نے مجھے وہ ٹکڑے
میں اچھالنے کو کہا، یہ ان شرپا کا ہمالیہ کو شکریہ کہنے کا انداز تھا۔ میں کوئی توہم پرست آدمی
مجھے بدھ مت سے کوئی لگاؤ ہے، پھر بھی وہ ہمالیہ کا کوئی پراسرار اثر تھا جس کے باعث میں
ٹکڑے لیے اور انہیں ہوا میں اچھال دیا۔ وہ منظر بہت حسین تھا۔ ٹشو کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے
ہمارے سروں سے تقریباً پانچ چھ میٹر اوپر تیرتے بادلوں میں ٹھہر گئے، زمین اور ہوا کے
سفید بادلوں میں ساکت سے ہو گئے۔ آج مجھے اپنا آپ ٹشو کے ان ٹکڑوں کی طرح لگ رہا ہے
جسے زمین اور آسمان کے درمیان بادل کے ایک ٹکڑے نے تھام رکھا ہوا اور گرنے نہ دے۔"

اس کی آنکھیں بند اور لب آہستہ آہستہ حرکت کر رہے تھے۔ آواز اتنی مدھم تھی کہ وہ بمشکل سن سکتی تھی۔ وہ خاموش ہوا تو جیسے ساگر ماتا کا طلسم ٹوٹ کر فضا میں بکھر گیا۔ وہ ایورسٹ سے دومانی کی غار میں آ گئی۔

"سو جاؤ۔ صبح ہیلی کاپٹر کے آتے ہی تمہیں اٹھا دوں گی۔"

افق کے لبوں پر زخمی مسکراہٹ بکھر گئی، جیسے اسے پریشے کے اتنے پُریقین ہونے پر ہنسی آئی ہو۔ پھر تبسم دھیما ہوتا گیا۔ وہ نیند کی کیفیت میں ڈوبتا چلا گیا۔

اس کے سونے کے بعد اس نے ریڈیو نکال کر احمت سے رابطہ کیا۔

"کیسی ہو ڈاکٹر؟" وہ غالباً اس کی کال کے انتظار میں سویا نہیں تھا۔

"پتا نہیں کیسی ہوں۔ میری ای میلز تو پڑھ کر سناؤ۔"

"اچھا سنو۔" وہ لیپ ٹاپ کے سامنے ہی بیٹھا تھا، "پہلی تو میری بیوی سلمیٰ کی ہے۔ لکھا ہے اچھی پریشے جلدی سے نیچے بخیر و عافیت پہنچ جاؤ، تا کہ بیس کیمپ میں موجود میرے شوہر کو واپس بھیج سکو۔ مجھے تمہارے ہنزہ کے اس پار کافرستان میں بسنے والی عورتوں کے حسن کے قصے انہوں نے سنا رکھے ہیں کہ وہ اتنی حسین ہوتی ہیں کہ تمہاری زبان میں ان کے باعث "کافرانہ ادا" اور "کافرانہ حسن" جیسی اصطلاحات رائج ہو چکی ہیں۔ میرا شوہر اتنا معصوم اور سیدھا نہیں جتنا تم اسے سمجھتے ہیں۔ میرا خیال ہے پاک آرمی کو 6320 میٹر پر ریسکیو آپریشن کرنے سے پہلے سرچ آپریشن راکاپوشی بیس کیمپ میں بھی کرنا چاہیے۔"

پریشے بے اختیار ہنس دی۔ چہرے کی جلد اتنی خشک ہو چکی تھی کہ ہنسنے سے کھنچی اور درد ہوا۔

"سلمیٰ کو میری طرف سے جواب دو کہ......"

"وہ میں پہلے ہی دے چکا ہوں۔"

"کیا لکھا ہے؟"

"تمہاری طرف سے اپنا کریکٹر سرٹیفکیٹ دیا ہے اور کیا؟" وہ ہنسا، "اچھا یہ کسی سیف الملوک کی بھی ای میل آئی ہوئی ہے۔"

پریشے کے لبوں پر رقصاں مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ سیف کو تو وہ ان تین دنوں میں بھلا بھی چکی تھی۔ "کیا لکھا ہے؟"

"میں نے اور ندا ایپا (ندا آپا) نے برائیڈل ڈریس پسند کر کے آرڈر دے دیا ہے۔ باری (بری) کی ڈھیر ساری شاپنگ بھی کر لی ہے۔ ویڈنگ کارڈز کے سیمپل بھی سلیکٹ کر رکھے ہیں مگر کارڈز تو ماموں کہہ رہے تھے رمضان کے بعد ہی چھپوائیں گے اور ہاں، ماموں پرسوں کی بجائے ایک ہفتے بعد واپس آئیں گے۔ اچھا پلیز، اب جلدی اپنا ایڈونچر ختم کر کے واپس آؤ۔ یہ آنکھیں تمہیں دیکھنے کو ترس گئی ہیں۔

تمہارا سیف۔"

اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔ اس نے صرف "بائے احمت" کہہ کر ریڈیو بند کر دیا۔

کئی دنوں بعد پہلی دفعہ اس پر یہ ادراک ہوا تھا، جسے وہ اتنا آسان سمجھ رہی تھی، وہ ناممکن ہے۔ اگر اس کا خیال تھا کہ وہ افق کو پاپا سے ملوا دے گی اور وہ بخوشی اس کی تین سال پرانی منگنی توڑ دیں گے تو وہ غلط تھی۔ وہ کبھی بھی ایک سیکولر ملک سے آنے والے غیر ملکی کو اپنے سگے بھانجے پر ترجیح نہیں دیں گے۔ راکاپوشی سر کرنا ایک ایڈونچر تھا، جس کی اجازت دے دینا کوئی اتنی انوکھی بات نہیں تھی مگر منگنی ان کی عزت، ان کی زبان کا معاملہ تھا۔ وہ اس معاملے میں سخت قدامت پسند تھے۔ وہ کبھی بھی اپنی خوشی سے یہ منگنی نہیں توڑیں گے اور وہ ان کی خوشی کے خلاف جانے کا سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ وہ اپنی خواہش، اپنی محبت کے لیے اپنے باپ کو ان کے خونی رشتوں سے محروم نہیں کر سکتی تھی، جو ان کی زندگی تھے۔

ادھر اس کی شادی کی تیاریاں عروج پر تھیں اور وہ منگنی توڑنے کے متعلق سوچ رہی تھی؟ وہ ایسا کبھی بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ جانتی تھی، اگر پاپا افق کے لیے بے دلی سے مان بھی گئے تو افق کبھی بھی اسلام نہیں چھوڑے گا، اسے اس کے ساتھ ترکی جانا پڑے گا۔ پیچھے پاپا اپنے رشتوں کے ہوتے

ہوئے بھی ویسے ہی اکیلے ہوں گے۔ جیسے وہ اس وقت ان ویران پہاڑوں میں اکیلی پڑی تھی۔ شخص اس کا باپ تھا وہ انہیں کوئی دکھ نہیں دے سکتی تھی۔ وہ برو کے خطرناک گلیشیئر سے لڑ سکتی تھی۔ وہ اپنے رشتے داروں کی منگنی توڑنے کے بعد کی ممکنہ ”بلیک میلنگ“ سے ہار گئی تھی۔

رات کے اس پہر اس اندھیرے برفانی غار میں بیٹھے اسے افق اور اپنے باپ میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔

اس نے ایک نظر اپنے گھٹنے پر سر رکھ کر بے خبر سوتے افق کو دیکھا جو نیند میں تھوڑی تھوڑی دیر بعد کراہتا تھا، شاید اس کا زخم ناسور بنتا جا رہا تھا اور اسے ناقابلِ برداشت تکلیف دے رہا تھا۔ اس نے ٹوپی پہن رکھی تھی مگر اس میں سے بھورے بال نکل کر ماتھے پر بکھرے تھے۔ باہر چاند نہ تارے، غار میں روشنی نہ ہونے کے باعث وہ اس کا چہرہ ٹھیک سے نہیں دیکھ سکتی تھی۔

”کچھ عشق تھا، کچھ مجبوری تھی۔“

وہ زیرِ لب بڑبڑائی اور آنکھیں موند لیں۔ اس نے اپنا انتخاب کر لیا تھا۔

”تم مجھے بہت دیر سے ملے افق ارسلان! کاش پہلے ملے ہوتے......“ آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر نیچے گرنے لگے۔

☆......☆......☆

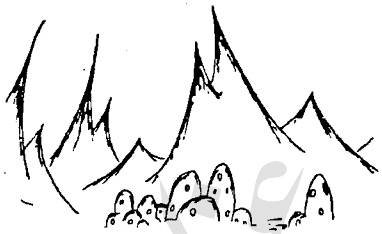

گیارہویں چوٹی

اتوار، 21 اگست 2005ء

کسی دھماکے کی آواز نے اسے جگایا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ وہ برفانی غار میں بالکل تنہا تھی۔ اس کے گھٹنے پر بوجھ نہیں تھا۔

”افق کہاں گیا؟ اوہ میرے اللہ!“ وہ چکرا کر رہ گئی اور پھر بہت تیزی سے دونوں ہاتھوں پیروں کے بل بلی کی طرح رینگتی غار سے باہر نکلی۔

وہ غار کے دہانے کے دائیں طرف چند قدم دور بیٹھا تھا۔ اس نے زخمی ٹانگ برف پر لٹا رکھی تھی اور بایاں گھٹنا سیدھا کھڑا تھا۔ کمر برفیلی دیوار سے ٹکائے وہ بے تاثر نگاہوں سے سامنے دیکھ رہا تھا۔

’’تم ادھر کیوں بیٹھے ہو؟‘‘ اس کے ساتھ ویسے ہی دوزانو ہو کر بیٹھتے ہوئے اس نے غور سے اس کا چہرہ دیکھا۔ برستی برف کے کچھ ٹکڑے اس کے کپڑوں، ٹوپی اور چھوٹی چھوٹی بھوری داڑھی میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ طوفان اب تھمنے کو تھا، مگر برف بے حد خراب تھی۔ چند چند منٹ بعد برفانی تودے گر رہے تھے۔ اب بھی اسے کسی گرتے برفشار کی آواز نے جگایا تھا۔

’’نہیں بیٹھ...... سکتا...... اس قبر میں...... نومور...... نومور......‘‘ اس کی سانس رک رک کر آ رہی تھی۔ کل کے مقابلے میں آج اس کے چہرے سے چھلکتی نقاہت اور کمزوری میں اضافہ ہو گیا تھا۔ اب اس کی توانائی ختم ہونے کو تھی۔ وہ اندر ہی اندر مر رہا تھا۔

’’تمہیں درد ہو رہا ہے؟‘‘

’’ہاں۔‘‘ اب وہ جھوٹ بول بول کر تھک گیا تھا۔ جانے کتنی دیر سے باہر آ کر بیٹھا تھا۔ پریشے نے پلٹ کر ایک نگاہ غار پر ڈالی۔ وہ واقعی برفانی قبر تھی۔

’’بس تم فکر مت کرو۔ صبح ہو گئی ہے۔ طوفان تھمنے کو ہے۔ وہ بس آتے ہی ہوں گے۔‘‘ اس نے دھند میں دور دور تک دیکھنے کی سعی کرتی آنکھیں کسی ہیلی کاپٹر کو نہ پا کر مایوس سی لوٹ آئیں۔ افق جواب دیئے بنا نیم وا بوجھل پپوٹوں سے سامنے دیکھتا رہا۔

صبح کی سفیدی سے قراقرم کے پہاڑ منور تو ہوئے تھے، مگر سورج کی سرخ روشنی اور تمازت دھند کے پردے میں چھپ کر رہ گئی تھی۔

وہ غار سے دو آئس اسکریوز اور ایک Prusik اٹھا لائی اور افق کو باندھ دیا۔ خود کو بھی حفاظتی رسی سے محفوظ کر لیا۔ طوفان کی رفتار سست ضرور پڑی تھی مگر برفیلی ہوائیں اور برف باری ہنوز جاری تھی۔

دفعتاً اس کی نگاہ افق کے ہاتھوں میں پکڑے سرخ مفلر پر پڑی۔ اس مفلر کے ساتھ اسے کتنے لمحے بہت یاد آئے تھے۔ ماہوڈھنڈ کے پانیوں پر رقص کرتی حسین پریاں، اشو کا پتھروں سے ٹکراتا پانی، مری کی سڑک پر اترے بادل...... وہ سب اب صدیوں پرانی یاد لگتا تھا۔

اس لمحے گرتی برف اور کہر میں ڈوبے پہاڑوں کو دیکھتے ہوئے اس کا دل چاہا کہ وہ دوا نج کا یہ فاصلہ مٹا دے اور اپنا سر اس کے کندھے پر رکھ کر خوب روئے، اتنا روئے کہ اس کے آنسوؤں سے راکاپوشی کی ساری برف پگھل جائے اور پھر وہ تھک کر سو جائے اور جب جاگے تو ساری مشکلات، تکالیف اور پریشانیاں اس کی زندگی سے غائب ہوں۔ وہ جاگے تو وہ اپنے گھر میں ہو اور سوات جیسا ہنستا مسکراتا سا افق اس کے سرہانے کرسی ڈالے بیٹھا ہو مگر سوچ اور حقیقت میں کتنا فرق ہوتا ہے؟

اس نے اپنے منجمد ہوتے ہاتھوں میں افق کا ٹھنڈا ہاتھ تھام لیا۔ دونوں کے ہاتھ دستانوں کے باوجود اتنے یخ تھے کہ یوں لگتا تھا جیسے برف کے تین ٹکڑے اوپر نیچے رکھے ہوں۔

’’جب میں چھوٹی تھی تو ایک کہانی بہت شوق سے پڑھا کرتی تھی۔ اس کہانی میں حسین اور فلک بوس پہاڑوں کا ذکر تھا، ہجر کی طویل راتوں کے بعد ملن کی خوش کن گھڑیوں کا ذکر تھا۔ ایک بہادر شہزادہ، دنیا کے سب سے حسین پہاڑ کی چوٹی پر سونے کے پنجرے میں مقید ایک پری کو چھڑانے جاتا ہے جسے ظالم دیو نے صدیوں سے اس پنجرے میں قید کر رکھا تھا۔ ہزاروں سال سے، دنیا کی تخلیق سے بھی پہلے سے، وہ پری سونے کی سلاخوں کے اس پار نگاہیں جمائے شہزادے کی راہ تک رہی تھی پھر شہزادہ اس پہاڑ پر جاتا ہے اور......‘‘

وہ یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گئی۔ افق اب گردن ترچھی کیے بغور اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اسی دھند میں سامنے ہراموش پر نئی پڑی برف کو تک رہی تھی۔

’’جب میں لیک ڈسٹرکٹ میں تھی تو گرمیوں کی چھٹیوں میں پاپا کو بتائے بغیر اپنے ٹیچرز کے ساتھ کبھی کبھار اپنے اسکول کے ٹیچرز کے ساتھ سوئس مرغزار میں جایا کرتی تھی۔ یہ میرا اور ماما کا سیکریٹ تھا۔ ہم نے پاپا کو اس کے متعلق کبھی آگاہ نہیں کیا۔ صرف اس لیے کہ وہ پریشان ہوں گے اور میں پاپا کو پریشان یا اپ سیٹ نہیں دیکھ سکتی۔ وہ اپنے رشتے داروں سے بہت محبت کرتے ہیں، انہیں چھوڑ نہیں سکتے۔ مما ہمیشہ میری ڈھال بنا کرتی تھیں، اب ہوتیں تو ڈھال بن جاتیں، مگر وہ نہیں ہیں۔‘‘

وہ ادھوری باتیں کر رہی تھی۔ دور ہراموش کی چوٹی کے قریب برف میں دراڑ پڑ رہی تھی۔ وہ بنا پلک جھپکے اس شگاف کو دیکھے گئی۔

’’فکر کیوں کرتی ہو؟ خود ہی تو کہتی ہو کہ وہ آ جائیں گے، جیسے ہالی وڈ کے فلموں کے آخر میں ہیرو آ جاتا ہے۔ ہمیں بچا کر لے جائیں گے پھر میں تمہارے پاپا کے پاس جاؤں گا۔‘‘

وہ مبہم سا ہنسی۔ ’’کیوں جاؤ گے؟‘‘ اس کی نگاہیں دراڑ سے نیچے ٹوٹتی برف پر تھیں۔

’’تم میرے منہ سے کیا سننا چاہتی ہو؟‘‘ وہ بہ دقت بول پا رہا تھا۔

’’کچھ نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔ اب کچھ سننے کی حسرت نہیں رہی۔‘‘ دراڑ کے نیچے کی برف کے تودے ٹوٹ کر زور سے چند فٹ نیچے گرے اور پھر ساری برف سفید دھول میں تبدیل ہو کر تیزی سے نشیب میں گرنے لگی۔

’’پری...... ! پریشان مت ہو۔ ہم سب کو منا لیں گے۔ پھر میں تمہیں ترکی لے جاؤں گا

اور......" وہ کھانسنے کو رکا۔

"مجھے خواب مت دکھاؤ افق۔" اس کی آنکھیں پانی سے بھر گئیں، "خواب ٹوٹ جاتے ہیں۔ یہ ٹوٹ کر ساری عمر آنکھوں میں کرچیوں کی طرح چبھتے رہتے ہیں۔ آنکھیں زخمی ہیں، روح بھی زخمی ہو جاتی ہے۔ مجھے خواب مت دکھاؤ۔" سفید دھول نے نیچے گرتے ہوئے ... بڑا حصہ اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔

"پری! تم......"

"نہیں افق...... ابھی تم صرف میری سنو۔ میں ساری رات ٹھیک سے سو نہیں سکی۔ میرے افق! نشاء تم ہم سب غلط تھے۔ پاپا نے دس لوگوں کے سامنے میری منگنی کی ہے۔ میں وہ منگنی ... ان کو دکھ نہیں دے سکتی۔ میں ایسا کوئی نیا رشتہ نہیں بنانا چاہتی جس کی بنیاد میں پرانے رشتوں کی قبریں ہوں۔ میں نے ایک فیصلہ کیا ہے۔ میری بات غور سے سنو۔

تم مجھ سے آج اس برفانی غار کے باہر بیٹھے ایک وعدہ کرو۔ راکاپوشی کے گلیشیئرز، ہراموش ... آتا برفشار اور یہ گرتی برف اس عہد کی گواہ ہوگی۔ مجھ سے وعدہ کرو کہ یہاں سے نکلتے ہی تم واپس چلے جاؤ گے۔ ہمیشہ کے لیے واپس ترکی چلے جاؤ گے اور پھر پری کے لیے کبھی واپس نہ ... پری اب سونے کے پنجرے سے آزاد نہیں ہونا چاہتی۔"

وہ اسے دیکھ کر رہ گیا۔ "بس؟ صرف اپنے بارے میں سوچا اور فیصلہ سنا دیا؟ میرے ... میں کچھ نہیں سوچا؟"

"تمہیں واقعی لگتا ہے میں نے تمہارے بارے میں کچھ نہیں سوچا؟" دور ہراموش پر ... بالکل سکوت تھا، جیسے برفشار کبھی آیا ہی نہ ہو۔

افق نے گردن نفی میں ہلائی اور دوبارہ سر پیچھے ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ "جو تم کہو میں کروں گا۔" وہ ہار مان گیا تھا۔ اتنے مختصر الفاظ میں فیصلہ صادر کر کے پری نے اس کے ... انتخاب نہیں چھوڑا تھا۔

"مگر پری...... تمہیں بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔" وہ پھر کتنی ہی دیر چپ رہا ... بولا۔ اس میں مزید بولنے کی سکت نہیں تھی۔

برف کے تینوں ٹکڑوں نے ابھی تک ایک دوسرے کو تھاما ہوا تھا۔ پھر پری نے ... درمیان پھنسا وہ سرخ کپڑا نکالا، ترکی کا جھنڈا، جسے کئی دن تک وہ مفلر سمجھتی رہی تھی۔

... مفلر" جھاڑا۔ برف کی قلمیں نیچے گریں۔ وہ بے حد گیلا تھا۔ ان دونوں کے کپڑوں ... کی طرح گیلا۔

پھر اس نے غار کے دہانے کے قریب برف چند انچ گہری کھودی، سرخ مفلر اندر دبایا اور اوپر ... لنے لگی۔ چند لمحوں بعد کپڑا برف کی تہوں تلے چھپ گیا۔

"بس اب یہ ہمیشہ ادھر رہے گا۔" غار کے دہانے پر برف برابر کرتے ہوئے وہ بہت پیار ... بولی، جیسے کوئی اپنی بے حد قیمتی شے محفوظ کرنے کے لیے دفن کرتا ہے۔

"جانتے ہو افق! قطبین کے بعد...... دنیا کے سب بڑے گلیشیئرز میرے ملک میں ہیں۔ ... بیافو، ہسپار، بلتورو۔ کہتے ہیں یہ گلیشیئرز اب تیزی سے پگھل رہے ہیں۔ میں سوچتی ہوں ... آج سے دس، بیس، سو سال یا پھر سینکڑوں، ہزاروں سال بعد جب یہ گلیشیئرز پگھل جائیں ... پھر ایک روز ایسا آئے گا جب قراقرم کے پہاڑوں پر سورج بہت روشن طلوع ہوگا جس کی ... سے راکاپوشی کی صدیوں پرانی برف پگھل جائے گی اور پھر "برو" میں دفن یہ مفلر اور قراقرم ... تاج محل میں دبی داستان، نگر کے دریا میں بہہ جائے گی پھر جہاں جہاں نگر بہے گا اس کے ... کے ساتھ پڑے پتھر، پتھروں سے دور اگے درخت، درختوں پر پھدکتی نیلی چڑیاں، ... اور پرسیاہ پہاڑوں کی سفید چوٹیوں کو چومتے روئی سے نرم بادل، بادلوں کے درمیان ... جھانکتی سورج کی سرخ شعاعیں اور ان سب کے اوپر چھایا نیلا آسمان، سب نگر کے دریا میں ... داستان کے نغمے سنیں گے پھر نگر جس وادی میں جائے گا جس دریا کے ساتھ ملے گا، ہنزہ، ... جہلم اور نیلم کے دریاؤں میں ہر سو وہ داستان خاموشی سے سنائی جائے گی۔ کبھی تو نگر کا پانی ... چاندنی کی تہ سوات کے مرغزاروں میں اس جھرنے کے قریب پہنچے گی وہ جھرنا ... اوپر پہاڑ پر کبھی ہم بیٹھا کرتے تھے، جہاں اداس چڑیا گیت گاتی تھی، کسی کی روٹھی محبت ... نارسائی کے، کسی کی جدائی کے...... تب وہ چڑیا ہماری کہانی سیاحوں کو سنایا کرے گی۔ وہ ... جو اس جھرنے کے پانی اور پانی میں پڑے سرمئی پتھروں کے نیچے بہت پہلے سے دبی ہوگی۔ ... پری اور کوہ پیما کی کہانی...... ہاں کبھی تو راکاپوشی کی برف پگھلے گی اور برف میں دبی کہانی ... دریا میں بہہ جائے گی۔"

... مدھم سرگوشی میں کہہ رہی تھی کہ اسے یقین بھی نہیں تھا کہ وہ سن رہا ہے۔

"اس مفلر کو یہیں رہنے دو۔ یہیں قراقرم کے تاج محل میں سونے دو۔ جانے اس کی دیواروں

پراور کتنے پیار کرنے والوں کی یادیں رقم ہیں۔ایک اور سہی۔'' وہ خود سے بڑبڑائی۔

برف ویسے ہی اس کے اوپر اور آس پاس گرتی رہی۔ دھند کبھی بڑھتی، کبھی گھٹتی۔ہر خاموش تھی۔افق خاموش تھا۔قراقرم کے پہاڑ خاموش تھے۔

سورج تب بھی نہیں چمکا، جب اسے سوا نیزے پر ہونا چاہیے تھا پھر سفیدی دوپہر ڈھل شام کا نیلگوں اندھیرا قراقرم کے پربتوں اوران کی دیوی کو اپنی لپیٹ میں لینے لگا۔

ہر دو گھنٹے بعد پانی کی آدھی پیالی اس کی ضرورت تھی مگر اس ڈھلتی شام میں جب ا انداز اً دو ڈھائی گھنٹے بعد چولہا جلایا تو وہ ٹھنڈا پڑا رہا۔اس نے فیول کی آخری بوتل ہلائی تھی۔اس نے ریڈیو اٹھا کر ٹرانسمٹ بٹن دبایا۔ وہ بھی مردہ تھا۔اس کی بیٹری مر چکی تھی بیٹریاں افق کے بیک پیک میں کہیں بہت اوپر برف میں دفن تھیں۔

کہر میں ڈوبے دیو ہیکل جامنی پہاڑ اپنے چہروں پر سفید چادر کا بکل مارے خاموشی سے دیکھتے رہے۔ان پہاڑوں کے اس پار بھی میلوں تک پھیلے پہاڑی سلسلے تھے۔وہ ان کے میں بے قرار منتظر نگاہوں سے کسی کی راہ تک رہی تھی۔

گیس تھی، نہ پانی۔خشکی اور سردی کے باوجود اس سے اس کے حلق میں کانٹے اگ تھے۔بغیر پانی کے اب اس کے پاس زندگی کے چند آخری گھنٹے رہ گئے تھے۔وہ کپکپا بھی رہی تھی۔کپکپانے سے گو کہ ایک دو لمحے کے لیے اس کا جسم گرم ہو جاتا مگر اس اضافی حرکت اس کی دسترس میں موجود چند آخری گھنٹوں میں کمی ہو جاتی۔کانپنے کے لیے توانائی خرچ ہو اور اسے توانائی بچانا تھی۔ چند گھنٹوں کی مہلت کو کھینچنے کے لیے...... چند منٹ مزید حاصل کے لیے......زیادہ سے زیادہ زندگی کا ایک دن مزید گزارنے کے لیے......

''بس وہ آتے ہی ہوں گے رات کی تاریکی پھیلنے سے پہلے وہ آتے ہی ہوں گے۔ہمیں آب ایک اور سفید رات نہیں گزارنی پڑے گی۔'' اس کی متلاشی نگاہیں دور پہاڑی سلسلوں کر بار بار مایوس لوٹ رہی تھیں۔

''سب کہاں چلے گئے؟ کرنل فاروق، آپ نے تو کہا تھا کہ آپ ہمیں لینے آجائیں آپ کدھر رہ گئے ہیں؟ میرے اللہ! انہیں جلدی بھیج دو ورنہ افق مر جائے گا۔وہ بغیر پانی سفید رات میں مر جائے گا۔'' وہ بے اختیار رونے لگی۔

برف باری پھر سے تیز ہوگئی، یوں جیسے وہ کبھی ختم نہیں ہوگی۔پریشے نے امید کا تمنا

میں سجائے دھند میں لپٹے آسمان پر دور تک نگاہ ڈالی۔اس کی پلکیں بھیگتی چلی گئیں۔

''کوئی ہے؟'' اس نے زور سے چلا کر کہا، ''کوئی ہے جو ہماری مدد کرے، ہمیں اس برفیلے سے نکالے؟ خدا کے لیے کوئی تو آئے ورنہ افق مر جائے گا۔'' اس کی آواز پہاڑوں میں گونجتی، ٹکرا کر واپس آگئی۔

''مت کرو، وہ آتے ہی ہوں گے۔'' بند آنکھوں سے وہ بڑبڑایا۔

پریشے نے نفی میں سر ہلایا اور نڈھال سی ہو کر پیچھے برف سے ٹیک لگا لی اور ایک آخری بار دعا کوئی آجائے مگر راکاپوشی پر تو دعائیں بھی قبول نہیں ہوتی تھیں۔

''وہ کبھی نہیں آئیں گے افق، کبھی نہیں۔ہم نے جانے کتنے دن ان کا انتظار کیا، مگر وہ نہیں ۔وہ اب نہیں آئیں گے۔یہاں سے ہمیں نکالنے کوئی نہیں آئے گا۔ہمیں ادھر ہی مرنا ہے۔ آہستہ آہستہ دھیرے دھیرے......''

اس نے آنکھیں بند نہیں کیں۔بس بے تاثر پتھرائی نگاہوں سے دھند میں تقریباً سو میٹر تک نظر آتی سے سفید پن کو دیکھتی رہی۔پھر برف باری اور تیز ہوگئی تو اس کا پینو راما چھوٹا ہوتا چلا گیا۔

طوفان کئی گھنٹے ہوئے تھم چکا تھا۔لمحے بھی تھم چکے تھے۔لوگ کہتے ہیں وقت نہیں ٹھہرتا مگر دراز ہومر کہا کرتا تھا، بعض اوقات وقت بھی ٹھہر جایا کرتا ہے۔

زندگی میں چند لمحے ایسے آتے ہیں جب وقت رک جاتا ہے، گھڑیاں جم جاتی ہیں۔

تب کوئی گزرا کل اور کوئی آنے والا کل نہیں ہوتا۔

تب صرف آپ ہوتے ہیں اور آپ کی تنہائی۔

وقت کی تفریق اور حساب ختم ہو کر رہ جاتا ہے۔

آپ عجیب سے timeless time میں پھنسے ہوتے ہیں، جو درحقیقت وہاں ہوتا ہی نہیں

ان لمحوں میں پوری کائنات رک جاتی ہے۔

راکاپوشی پر بھی وقت ٹھہر گیا تھا۔

وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی۔وہ سوچ پا رہی تھی، نہ وہ وقت کا حساب رکھ پا رہی کتنے بجے تھے، رات کا کون سا پہر تھا، اس کی یادداشت نے کام کرنا ترک کر دیا تھا۔ہاں بس نیند آ رہی تھی۔وہ گہری میٹھی نیند سونا چاہتی تھی، مگر اسے اپنے لبوں کی قید سے آزاد ہوتے

الفاظ فضا میں تحلیل ہوتے سنائی دے رہے تھے۔

''سونا نہیں افق......! سونا نہیں۔ اگر ہم سو گئے تو پھر کبھی نہیں جاگیں گے۔''

وہ سونا چاہتی تھی، نیند، تھکاوٹ اور پیاس سے اس کا برا حال تھا مگر دور اندر کوئی اسے جھنجھ... اسے جگائے رکھنے کی کوشش کر رہا تھا، اسے کہہ رہا تھا کہ وہ نہ سوئے۔ ہاں اندر سے وہ بھی ... کہ اگر وہ اس رات سو گئی تو پھر وہ کبھی نہیں جاگے گی۔ اسے سونا نہیں تھا، خود کو اور افق کو جگا... تھا۔ وہ وہی الفاظ بار بار کسی غیر ارادی عمل کے طور پر دہراتی، جانے کب اس دنیا سے، سردی... اور دھند کی اس دنیا سے اس دنیا میں چلی گئی جہاں کوئی درد، کوئی تکلیف، کوئی خیال، کوئی ذہنی... کوئی زماں اور مکاں کی تفریق نہ تھی۔ وہ دنیا، زمان و مکان کی قید سے آزاد تھی۔ وہاں مکمل... اور سکون تھا۔

وہ سو گئی تھی۔

☆......☆......☆

پیر، 22 اگست 2005ء

اس کے ذہن میں اندھیرا تھا۔ ساعتوں میں کوئی آواز مسلسل سنائی دے رہی تھی مگر نگاہوں کے سامنے گہری تاریکی چھائی تھی۔ کمر کے پیچھے برف کی دیوار وہ محسوس کر سکتی تھی پھر ... آنکھوں سے تاریکی چھٹنے لگی اور گہرا نیلاہٹ بھرا اندھیرا ان میں بھرنے لگا۔

اس نے پلکیں جھپکائیں۔ ایک دفعہ، دو دفعہ، تین دفعہ اور پھر کئی دفعہ۔ منظر قدرے واضح ہوا... سامنے دور دور تک پھیلے سلسلۂ قراقرم کی جامنی چوٹیوں کی برف نیلگوں روشنی میں چمک... تھی۔ آسمان صاف تھا۔ دھند چھٹ چکی تھی۔ گہرے نیلے آسمان پر ستارے بکھرے... جھلملاتے، ہر سو بکھرے چمکتے ستارے...... پہاڑوں سے بہت اوپر بہت اوپر تیرتے بادلوں... پیچھے سے نارنجی شعاعیں جھانک رہی تھیں۔

راکاپوشی پر صبح اتر رہی تھی۔

گھومتے سر اور چکراتے ذہن کے ساتھ اس نے دونوں ہاتھ برف پر رکھ کر زور لگا کر ا... کوشش کی۔ وہ بہ مشکل گھٹنوں پر زور دے کر کھڑی ہو پائی۔ اس کی ٹانگیں جم کر سن ہو چکی تھیں... دماغ پوری طرح ماؤف تھا۔

افق وہیں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں اور وہ جاگ رہا تھا۔ پریشے کو کھڑے ہو...

...ش کرتے دیکھ کر وہ مسکرایا۔ جلد اتنی خشک ہو چکی تھی کہ مسکراتے ہوئے کھنچنے سے جگہ جگہ سے ...نکلنے لگا۔

پریشے نے بے یقینی سے خود کو اور اسے دیکھا۔ وہ زندہ تھی۔ وہ اب تک مری نہیں تھی اور اب شاید کسی کے پکارنے پر اٹھی تھی۔ کس نے پکارا تھا اسے؟ اس نے سامنے پھیلے پہاڑی سلسلے پر ...دوڑائی۔ دوران پہاڑوں کے درمیان سے آواز آ رہی تھی۔ برفانی طوفان کے چنگھاڑنے کی... مگر وہ طوفان کی آواز نہیں تھی۔ وہ کوئی دھبا سا تھا، جو ان کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس نے ...نہیں سکیڑ کر دیکھا۔ دھبا بڑا ہوتا جا رہا تھا۔ سبز رنگ، درمیان میں چمکتا چاند ستارہ......

''افق اٹھو۔ وہ آ گئے ہیں۔'' وہ ایک دم زور سے پھٹی آواز میں چلائی۔ اس کی بے حد خشک ...بدے سے خون نکلنے لگا مگر وہ پرواہ کیے بغیر اس سبز ہیلی کاپٹر کو دیکھتے چلانے لگی، جو فضا کا سینہ چیرتے ہوئے ان کے قریب پہاڑ کے سامنے کی جانب بڑھ رہا تھا۔

''افق اٹھو...... میں نے کہا تھا ناں وہ آ جائیں گے۔ وہ آ گئے ہیں۔'' وہ خوشی سے رونے لگی تھی۔ ''وہ ہمیں چھوڑ کر نہیں گئے...... دیکھو سامنے وہ آ گئے ہیں۔''

وہ کھڑی تو تھی ہی، اب اس نے پوری قوت سے دونوں بازو ان کی جانب ہلائے پھر منہ کے گرد ہاتھوں کا پیالہ بنا کر ان کو آواز دینے لگی۔

''ہیلپ...... ہیلپ!'' وہ انہیں دونوں ہاتھوں کو ہلاتی اپنی جانب بلا رہی تھی۔ سبز ہیلی کاپٹر کی ایک جھلک نے اس میں جیسے نئی روح پھونک دی تھی۔

ہیلی کاپٹر بہت چھوٹا سا تھا۔ اس میں دو سرمئی یونیفارم میں ملبوس پائلٹ بیٹھے تھے۔ ایک کے چہرے پر گلاسز تھے اور قدرے درمیانی عمر کے دکھائی دیتے تھے۔ وہ ہیلی کاپٹر اڑا رہے تھے۔ وہ ...ئی کہ وہ کرنل فاروق تھے۔ ان کا معاون پائلٹ نوجوان تھا اور اس کے چہرے پر گلاسز نہیں ...تھے۔ اس نے پریشے کو ہاتھ سے اپنی جانب آنے کا اشارہ کیا۔

''چلو افق...... اٹھو۔'' نقاہت کے باوجود اس نے افق کو کندھے سے پکڑ کر اٹھانا چاہا۔

''تم جاؤ ان کے قریب۔'' بہ دقت تمام وہ بولا۔

اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کرے۔ وہ افق کو چلنے کا کہہ رہی تھی اور وہ اسے آگے بھیج رہا ...دوسری جانب وہ معاون پائلٹ مسلسل اسے اپنی جانب آنے کا اشارہ کر رہا تھا۔

''جاؤ ناں!'' افق نے بیٹھے بیٹھے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے آگے دھکیلا۔ پریشے نے اپنی حفاظتی

رسی کھولی پھر افق کی کھولنی چاہی۔ وہ کھل کے نہیں دے رہی تھی۔ اس کے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ اس نے چاقو نکال کر رسّی کاٹنے کی کوشش کی۔ اس کے اردگرد، دستانوں پر برف گرنے لگی۔ رسی کٹ کے ہی نہیں دے رہی تھی۔ اس نے گردن موڑ کر بے چینی سے ہیلی کاپٹر کو دیکھا۔ معاون پائلٹ نے اپنی طرف کا دروازہ کھول دیا تھا اور ہاتھ میں چھوٹا سا مووی کیمرہ پکڑے فلم بنا رہا تھا۔

لرزتے منجمد ہاتھوں سے اس نے رسی کاٹی اور آزاد ہو کر ہیلی کاپٹر کے قریب جانے لگی۔ وہ جگہ کسی چھت کی منڈیر کی طرح تھی۔

برف کا پلِ صراط۔

وہ سہج سہج اس پر قدم رکھتی۔ ہیلی کاپٹر کے قریب بڑھنے لگی جو ابھی تک ان کے نزدیک ہی اِدھر اُدھر چکرا رہا تھا۔ اس کے "پنجے" برف سے بہت قریب تھے مگر وہ وہاں لینڈ نہیں کر سکتا تھا۔ پریشے سے چلا نہیں جا رہا تھا۔ قدم من من بھر کے ہو رہے تھے۔

اسے قریب آتے دیکھ کر مووی بناتے معاون پائلٹ نے کیمرہ رکھا اور بازو اس کی جانب بڑھایا۔ وہ اس کو اندر آنے کو کہہ رہا تھا۔

پریشے نے الجھ کر اسے اور پھر گردن پھیر کر افق کو دیکھا، وہ اسے اپنی جانب دیکھتا پا کر ہاتھ سے اندر جانے کا اشارہ کرنے لگا۔ وہ واپس ہیلی کاپٹر کی جانب پلٹی۔ میجر بلال اسے اندر آنے کا کہہ رہا تھا۔

"میرا ساتھی زخمی ہے، پہلے اسے اٹھاؤ۔" وہ زور سے چلائی، مگر ہیلی کاپٹر کے پروں کی بھاری گڑگڑاہٹ میں اس کی آواز دب کر رہ گئی۔

میجر بلال نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلایا اور اسے دوبارہ اندر آنے کو کہا۔ وہ ایک پل ہچکچائی پھر اس کا بڑھا ہوا بازو تھام لیا۔ دوسرے ہی پل وہ ہیلی کاپٹر کے اندر تھی۔

"اوہ سر! ہم گئے...... بس ہم گئے...... کلمہ پڑھ لیں سر!" ہنس کر کہتے ہوئے میجر بلال نے دروازہ بند کیا۔

"میرا ساتھی زخمی ہے۔ اسے سہارا دے کر اٹھانا پڑے گا۔ وہ چل نہیں سکتا۔" ہیلی کاپٹر کے اندر اتنا شور تھا کہ وہ چیخ کر بولی۔ میجر بلال نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور پھر ہیڈ فون اس کی جانب بڑھایا۔

"یو وانٹ ٹو کے میم؟ اسے پہن لیں۔"

اس نے ہیڈ فون تھاما مگر پہنا نہیں۔ بس وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے شیشے کے اس پار برف پر بیٹھے افق کو دیکھتی رہی، جس نے سر پھر برفیلی دیوار سے ٹکا کر آنکھیں موند لی تھیں۔ تب دفعتاً اسے احساس ہوا کہ افق دور ہوتا جا رہا تھا۔ ہیلی کاپٹر فضا میں اوپر بلند ہو رہا تھا۔ اس کے اندر جیسے الارم سا بجنے لگا۔

"وہ...... میرا ساتھی...... اسے بھی تو اٹھائیں آپ...... مجھے کہاں لے کر جا رہے ہیں۔"

پروں کی گڑگڑاہٹ اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ اس کی بے چین نگاہیں نیچے برف پر بیٹھے افق پر جمی تھیں، جس کی آنکھیں بند تھیں اور گردن شانے پر ڈھلک گئی تھی۔ وہ آنکھیں کیوں نہیں کھول رہا؟ وہ گردن سیدھی کیوں نہیں کر رہا؟ کوئی اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجا رہا تھا۔

"اسے مت چھوڑ کر جائیں آفیسر! وہ...... وہ زخمی ہے۔ آپ لوگ اسے اٹھاتے کیوں نہیں ہیں؟" جیسے جیسے ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہوتا جا رہا تھا، پروں کا شور بڑھتا جا رہا تھا۔ اس شور کے درمیان اسے آگے والی دونوں نشستوں پر بیٹھے پائلٹس کی آوازیں ہلکی ہلکی سنائی دے رہی تھیں۔

"لڑکی چیخ کیوں رہی ہے؟"

"سر! آئی تھنک ان کو شاک ہے یا کوئی نفسیاتی اثر۔"

"اور وہ دوسرا لڑکا؟ بلال تمہارا خیال ہے وہ وہاں ہے؟"

"نہیں سر! آئی تھنک وہ مر چکا ہے۔"

"اچھا، مگر باڈی تو ریکور کرنی پڑے گی۔ ترک گورنمنٹ کو......"

شور بلند ہو رہا تھا۔ اس کے کانوں کے پردے پھٹ رہے تھے۔ اس کا دماغ چکرا رہا تھا۔ اس نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔ وہ کیا کہہ رہے تھے، وہ سننا نہیں چاہتی تھی۔ اس کی نظریں دور بیٹھے افق پر تھیں۔ وہ چیخ چیخ کر اسے کہنا چاہتی تھی کہ وہ آنکھیں کھولے، وہ اسے جھنجھوڑنا چاہتی تھی، اسے گھسیٹ کر اپنے ساتھ ہیلی کاپٹر پر لانا چاہتی تھی، مگر وہ کانوں کے پردے پھاڑتا شور...... اس کا ذہن تاریکی میں ڈوب رہا تھا۔ اس نے خود کو زور زور سے چلاتے سنا۔

"وہ زندہ ہے۔ خدا کے لیے اسے بچاؤ۔ وہ زندہ ہے۔ وہ مرا نہیں ہے۔ اسے پکارو، وہ آنکھیں کھول دے گا۔"

میجر بلال نے شاید مڑ کر اس کی طرف ترحم بھری نظروں سے دیکھا بھی اور ہیڈ فون کی طرف اشارہ کر کے کچھ کہا بھی، جو اس کی گود میں دھرا تھا مگر اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی

آنکھوں کے آگے گہرا اندھیرا چھاتا گیا...... گہرا دبیز اندھیرا...... سیاہ دھند......

اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی۔ پلکوں کی ادھ کھلی درزوں سے نیلا آسمان جھانک رہا تھا۔ وہ کسی چیز پر لیٹی ہوئی تھی اور کچھ لوگ اس چیز کو حرکت دے کر کہیں لے جا رہے تھے۔ اس سے آنکھیں نہیں کھولی جا رہی تھیں۔ وہ بس چیخ رہی تھی، چلا رہی تھی، "تم نے مار دیا اسے...... تم اسے مرنے کے لیے چھوڑ آئے۔"

وہ پتا نہیں کس پر چلا رہی تھی۔ کوئی سوئی کی نوک اس کی جلد میں کہیں چبھی اور پھر گہرا اندھیرا اور غنودگی تھی...... پھر اس کے کان میں کوئی مدھم سرگوشی میں کچھ کہہ رہا تھا۔ دھیمی دھیمی خوب صورت آواز اس کی سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔ کوئی اس کے بہت قریب تھا اور کسی نے آہستگی سے اس کے بالوں کو چھوا۔ گرم سانسوں کی تپش اسے اپنی گردن پر محسوس ہوئی تھی۔

اس نے جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں۔

وہ کسی ہسپتال کا کمرہ تھا۔ سفید دیواریں، سفید چھت، بستر کی سفید چادر، اس نے کہنیوں کے بل اٹھنے کی کوشش کی۔ قریب کھڑی ساڑھی میں ملبوس نرس نے جھٹ اس کے پیچھے تکیہ رکھا۔ وہ بیٹھ گئی تو اس نے بغور اپنے دائیں پہلو میں دیکھا جہاں تھوڑی دیر پہلے کوئی بیٹھا کچھ کہہ رہا تھا۔

اب وہاں کوئی نہیں تھا۔ وہ بستر پر اکیلی تھی۔

Happy Second Birthday Dr. Parisheh! (دوسری زندگی مبارک ہو ڈاکٹر پریشے!)

اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ قریب ہی آرمی یونیفارم میں کرنل کے رینک کے ڈاکٹر نے اس کی فائل پر نگاہیں دوڑاتے ہوئے اسے مبارک باد دی۔

"تھینک یو سر!" اس کو اپنا گلا بیٹھا ہوا محسوس ہوا۔ اسے زکام بھی تھا۔

"کیسی ہیں آپ، لٹل بریو گرل؟"

"بالکل ٹھیک۔" وہ خود کو بہت بہتر محسوس کر رہی تھی۔ اس کے جسم کے کسی حصے میں درد نہیں تھا۔ اس نے ایک نظر خود پر ڈالی۔ اس نے ہلکے سے سفید کپڑے پہن رکھے تھے جن کی آدھی آستینوں سے اس کے دودھیا بازو باہر نکل رہے تھے۔ گرم موٹے کپڑوں سے اسے بالآخر نجات مل گئی تھی۔ جلد بھی خاصی نرم تھی۔

"مجھے کیا ہوا تھا؟"

"کچھ بھی نہیں۔ صرف نفسیاتی جھٹکا تھا جو ظاہر ہے کسی ساتھی کے مرجانے پر محسوس ہوتا ہے۔ صرف دائیں ہاتھ کی کلائی سوجی ہوئی تھی کئی چھوٹے موٹے زخم بھی تھے۔"

وہ "کسی ساتھی کے مرجانے پر" کے الفاظ پر چونک سی گئی۔

"میں...... میں بے ہوش تھی کیا؟ کتنی دیر تک؟"

"تین دن تک۔ آج 25 اگست ہے میم۔" وہ مسکرائے۔ وہ مسکرا بھی نہ سکی۔

"تین دن تک؟ میں اتنی لمبی بے ہوش نہیں رہ سکتی۔ ناممکن۔" بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

"آپ کو کرنا پڑا تھا۔ آپ ہسٹریک ہو رہی تھیں۔ میجر بلال نے بتایا تھا کہ سم فرینڈ آف یورز ڈائیڈ آن راکاپوشی۔"

"ڈائیڈ؟" وہ سانس نہیں لے سکی۔

"آپ کے انکل، آنٹی اور ایک کزن بھی اسلام آباد سے آئی ہوئی ہیں۔"

"اسلام آباد سے؟ تو میں کدھر ہوں؟"

"آپ گلگت سی ایم ایچ میں ہیں۔ شاید آپ کو یقین نہیں آ رہا کہ آپ ایک ڈیڈلی ماؤنٹین سے لڑ کر آگئی ہیں۔ آپ کا ریسکیو ماؤنٹین کلائمبنگ کی تاریخ کا......"

"پلیز میری کزن کو بلا دیں، مجھے اس سے بات کرنی ہے۔" اس نے بے چینی سے ان کی بات کاٹی۔ وہ سر ہلا کر اسے آرام کرنے کو کہہ کر باہر چلے گئے۔

"ڈائیڈ؟ انہوں نے یہ کیوں کہا؟ وہ...... وہ کسی اور کی بات کر رہے ہوں گے۔ افق...... افق نہیں...... ہرگز نہیں۔"

اس کی نگاہوں نے سامنے آخری بار دیکھا، افق کا چہرہ گھوم گیا۔ بند آنکھیں، کندھے پر ڈھلکی گردن...... پریشے کو اپنا دل ڈوبتا محسوس ہوا۔

دروازہ ہلکی سی آہٹ کے ساتھ کھلا اور نشاء اندر داخل ہوئی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا اور آنکھیں سرخ تھیں۔

"کیسی ہو پری؟" وہ اس کے بیڈ کے کنارے کھڑی ہوگئی۔ بیٹھی نہیں۔

"نشاء، افق کیسا ہے؟" اس نے بے قرار ہوتی دھڑکنوں کو بمشکل قابو کیا۔

نشاء کچھ دیر خاموشی سے اسے دیکھتی رہی، پھر لبوں کو جنبش دی۔ "تم ٹھیک ہو جاؤ گی پری! شکر ہے تمہارے ہاتھ پاؤں فروسٹ بائٹ ہونے سے بچ گئے۔"

''نشاء! میں تم سے پوچھ رہی ہوں، افق کیسا ہے؟'' وہ زور سے بولی۔ اس کو اپنے قدم کی ہز
برف پر کھڑے لگ رہے تھے۔ ابھی نشاء کچھ کہے گی اور اس کے نیچے کچی برف پھٹ جائے گی۔

''تم آرام کرو پری! ہم پھر بات کرلیں گے۔ تمہاری طبیعت......''

''نشاء! خدا کے لیے مجھے بتاؤ، افق کیسا ہے؟'' کوئی اس کے جسم سے جان نکال رہا تھا۔

نشاء چپ چاپ کھڑی لب کاٹتی رہی۔ وہ بول کیوں نہیں رہی، وہ چپ کیوں ہے؟ پریشے
دل گھبرانے لگا۔

''نشاء پلیز مجھے بتاؤ، وہ ٹھیک تو ہے؟ وہ اسے بچانے گئے تھے یا نہیں؟ خدا کے لیے نشاء مجھے
بتادو، ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا۔''

نشاء نے آہستہ سے سر ہلایا ''وہ ٹھیک ہے۔''

پریشے نے بے اختیار اپنا سر تکیے پر گرادیا اور تھک کر سینے میں دبی سانس خارج کی۔ تو ڈا
ارسہ کی بات کررہا تھا۔

''مگر......'' نشاء ایک لحظہ کو رکی۔

''مگر کیا؟'' ایک ثانیے کو پوری کائنات رک گئی۔ وہ سانس روکے نشاء کو دیکھ رہی تھی۔

''مگر......مگر وہ چلا گیا پریشے۔''

''چلا گیا؟'' اس کے دل کو دھکا سا لگا، ''کدھر چلا گیا؟''

''واپس ترکی۔ میں نے اسے روکنے کی بہت کوشش کی مگر وہ کہتا تھا، میں نے پری سے وعدہ
کیا ہے کہ میں چلا جاؤں گا، میں نے کہا بھی کہ میں ممی پاپا سے بات کروں گی۔ انکل سے بات
کروں گی مگر وہ نہیں رکا۔ تم نے اچھا نہیں کیا پری! تم نے اس سے وعدہ کرکے اس کے ساتھ اور
اپنے ساتھ اچھا نہیں کیا۔''

''پھر اور کیا کرتی؟'' کہیں بہت اندر زور سے کچھ ٹوٹا تھا۔ اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے
لگے۔ ''اچھا ہوا وہ چلا گیا۔ میں اس کے لیے پاپا کو دکھ نہیں دے سکتی تھی۔''

کتنے ہی پل خاموشی سے سرک گئے۔

''کب گیا وہ؟'' نظریں اٹھائے بغیر اس نے رندھی آواز میں سوال کیا۔

''کل دوپہر میں جانے سے پہلے تمہیں دیکھنے آیا تھا۔ اس کی ٹانگ بہت خراب تھی، مگر ٹ
ہونے سے بچ گئی۔ دونوں ہاتھ پیر فروسٹ بائٹ ہو چکے تھے، مگر بالکل ضائع نہیں ہوئے او

ن ہوا وہ تم نے کیا اس کے ساتھ پریشے! تم اس کی شکل دیکھ لیتیں تو تمہارا دل پھٹ جاتا۔ تم
اسے توڑ کر رکھ دیا ہے۔ وہ اتنا بکھرا بکھرا اور شکست خوردہ لگ رہا تھا کہ مجھ سے برداشت نہیں
لگتا ہی نہیں تھا کہ یہ وہی زندہ دل افق ہے، جس کے ساتھ ہم نے سوات میں آٹھ دن گزارے
ہے۔ وہ تو کبھی بھی ایسا نہیں تھا پری! تم نے اس کے ساتھ بہت برا کیا۔ بہت برا۔''

اسے یاد تھا، جب وہ بے ہوش تھی تب بھی لاشعور میں کہیں نہ کہیں اسے افق کی آمد کا پتا چل گیا
۔ اس کے لمس کی تمازت، سانس کی حدت، نرم دھیمی آواز مگر وہ کیا کہہ رہا تھا، وہ کوشش کے
باوجود یاد نہ کرپائی۔

''مجھے اس سب کے بارے میں ڈاکٹر احمت دوران نے فون کرکے بتایا تھا۔ ترک گورنمنٹ
بہت پریشر تھا، جس کے باعث پریذیڈنٹ نے فوری ریسکیو آپریشن کا آرڈر دیا پھر وہ تمہیں
سیدھا گلگت لائے۔ میں، ممی اور پاپا بھی یہاں آچکے تھے۔ افق کو انہوں نے بیس کیمپ اتارا۔ وہ
تندرست نہیں تھا مگر کل وہ گلگت آیا، مجھ سے ملا اور پھر تم سے ملا پھر وہ اسلام آباد چلا گیا۔ کل شام
فلائٹ تھی۔

سیف بھائی اور تمہاری پھپھو کو پاپا نے اپنے طریقے سے سب کچھ سمجھا دیا ہے۔ تم بے فکر رہو،
ے کچھ نہیں پوچھیں گے۔ سیف بھائی کو نیوز پیپر سے پتا چلا تھا اور ان کی تنگ نظری کو تو تم جانتی
ا لیے پاپا نے سب ہینڈل کرلیا۔ انہیں افق کے بارے میں کچھ علم نہیں۔ ویسے بھی وہ دو دن
راچی میں ہیں اور انہیں کوئی اتنی خاص پرواہ بھی نہیں۔ پھپھو کو بھی کوئی فرق نہیں پڑا۔ پڑے بھی
ی کی ڈیتھ کے اثر کے باعث وہ تم سے کچھ نہیں پوچھیں گی۔''

''اور ارسہ کے پیرنٹس؟''

''وہ آئے تھے اور افق سے ملے بھی۔ افق نے انہیں ارسہ کا ادھورا ناول دے دیا۔ افق کہہ رہا
ناول کا اختتام خوش گوار ہونے والا تھا مگر شاید اب نہ ہوسکے۔''

''میں جانتی ہوں، ارسہ! ہماری کہانی لکھ رہی تھی۔'' وہ دھیرے سے بولی، ''حیرت ہے، افق
سے زیادہ زخمی تھا پھر بھی ہر کسی سے ملتا پھر رہا تھا جب کہ مجھے بے ہوش کرکے رکھا ہوا تھا؟''

''اس لیے کہ وہ ہسٹریک نہیں ہو رہا تھا۔'' نشاء ہولے سے ہنسی۔
وہ مسکرا بھی نہ سکی۔

☆......☆......☆

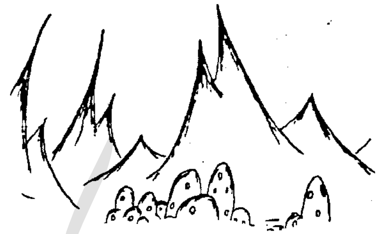

بارہویں چوٹی

جمعہ،26 اگست 2005ء

ہیلی کاپٹر سبز گھاس پر اس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اس نے بالوں کو انگلیوں سے سنوارا،
انہیں اونچی پونی ٹیل میں مقید کر کے برآمدے سے باہر نکل آئی۔ (اس کا کیچر گھر میں پڑا تھا)۔
اسے گلگت سے اسی ہیلی کاپٹر پر اسلام آباد جانا تھا، کرنل فاروق جا رہے تھے، تو وہ بھی
ہی چلی آئی۔

ہیلی کاپٹر کے پر ساکن تھے۔ اس کے دروازے کے قریب میجر بلال کھڑا تھا۔
''ہیپی سیکنڈ برتھ ڈے میم!'' اسے آتے دیکھ کر وہ خوش دلی سے مسکرایا۔ وہ بھی جواباً مسکرائی۔
کتنا غلط سمجھتی رہی تھی وہ انہیں، کتنی بدگمان تھی کہ وہ اسے بھول گئے ہوں گے مگر انہوں نے اسے
بھلایا تھا۔ وہ اسے وقت پر بچانے آ گئے تھے۔

''میں نے اپنے ریسکیو کی ویڈیو دیکھی تھی آج۔ مجھے میجر خالد نے دکھائی۔ بہت امیزنگ کام
آپ نے۔ اتنا مشکل ریسکیو کیسے کر لیا آپ نے؟ میں اب تک امیزڈ (ششدر) ہوں۔''
''ارے میم! جو کیا اللہ نے کیا۔ پاک فوج نے بس ہمت کی۔ ویسے امید ہے اب آپ مجھے
نہیں کہیں گی۔''
وہ شرمندہ سی ہو گئی۔ ''نہیں وہ دراصل میں پریشان ہو گئی تھی۔ آپ بیس کیمپ سے اچانک
کہاں گئے تھے؟''
''میم! ہم فیول کے لیے گئے تھے اور ہنزہ کے باہر تین دن موسم ٹھیک ہونے کا انتظار کرتے رہے
جیسے ہی آسمان صاف ہوا ہم آ گئے۔''
''مگر آپ نے افق ارسلان کو ہیلی کاپٹر میں کیوں نہیں بٹھایا؟ یہ اچھا خاصا بڑا ہیلی کاپٹر
ہے۔'' اس نے سامنے کھڑے ہیلی کاپٹر کی جانب اشارہ کیا۔
''یہ وہ نہیں ہے، جس نے آپ کو ریسکیو کیا تھا۔ آپ کو ٹھیک سے یاد نہیں۔ وہ ''لاما'' تھا، اس
میں ہم ارسلان کو کیسے بٹھاتے؟ وہ تو بالکل مچھر تھا۔''
''کون ارسلان؟''
''نہیں میڈم! ہمارا ہیلی! لاما مچھر ہوتا ہے۔'' وہ ہنسا، ''وہ زیادہ وزن نہیں اٹھا سکتا۔ تین سے
زیادہ بندے اس میں نہیں بیٹھ سکتے۔ کرنل زبیر اور میجر عاصم نے اپنی گلہری، آئی مین اپنے
squirrel سے ارسلان کو ریسکیو کیا۔ اس دفعہ راکاپوشی پر ہم نے دو ہیلی کاپٹر بھیجے تھے، جیسے بلتورو
گلیشیئر پر ایک آپریشن کرتے ہوئے بھیجتے ہیں۔''
پریشے نے غور سے سبز رنگ کے ہیلی کاپٹر کو دیکھا۔ ''ہاں، یہ وہ مچھر تو نہیں لگ رہا۔''
''ارے میم! اسے کچھ مت کہیں، یہ مائنڈ کرے گا۔''
وہ ہنس دی، ''میجر بلال، یہ ہیلی کاپٹر ہے۔'' جیسے وہ کہنا چاہ رہی تھی کہ ''یہ انسان نہیں ہے۔''
''جناب! یہ شیر جوان ہے۔'' اس نے ہنستے ہوئے سبز رنگ کی دھات کو تھپکی دی۔
''اینی ویز میجر بلال، میں میجر عاصم سے مل نہیں سکی۔ ان کو میری طرف سے شکریہ کہہ
دیجیے گا۔''
''راجر میم!'' پھر یک دم وہ بولا، ''ہاں، میجر عاصم آپ کا پوچھ رہے تھے۔ شاید کوئی چیز تھی
آپ کی ان کے پاس.....''

"نہیں کچھ بھی نہیں تھا۔ اچھا خدا حافظ اور ایک دفعہ پھر شکریہ۔" وہ بات کاٹ کر ہیلی کھلے دروازے سے اندر چڑھنے لگی۔

میجر بلال نے اب قدرے الجھ کر کچھ کہنا چاہا، شاید اسے کوئی الجھن تھی مگر پریشے کوئی قیمتی شے چھوڑے نہیں جا رہی تھی۔ جو وہ کھو چکی تھی، اس کے بعد اگر کچھ رہ بھی گیا تو پرواہ نہ تھی۔ وہ اندر بیٹھ گئی۔ کرنل فاروق تیار ہی تھے، سو دروازہ بند کر دیا۔

ہیلی کاپٹر فضا میں بلند ہونے لگا۔ اس نے ہیڈ فون کانوں پر چڑھا لیے۔ شور نسبتاً کم

وہ کھڑکی کے پار چھوٹے ہوتے گلگت اور دور نظر آتے پہاڑوں کو دیکھنے لگی، جن کے بہت تمکنت اور غرور سے پربتوں کی دیوی کھڑی تھی۔

"!thank you raka poshi" اس نے چمکتی دیوار کو کس بات کا شکریہ ادا کیا، بھی نہیں جانتی تھی۔

دور دور تک پھیلے یہ وہ پہاڑ تھے، جن کی پیشانیاں آسمان جھک کر چوم رہا تھا۔ وہ واقعی عظیم تھے اور ان کے درمیان میں قراقرم کا تاج محل کھڑا تھا، جس کی سفید مرمریں دیواروں پر ایک خاموش داستان لکھی تھی۔ وہ بلاشبہ آگرہ کے تاج محل سے زیادہ سفید اور حسین تھا۔

اس نے ایک آخری نظر قراقرم کے کوہساروں پر ڈالی۔

"الوداع قراقرم۔ الوداع ہمالیہ۔ مجھے تم عظیم چوٹیوں کی قسم! میں زندگی میں پھر کبھی پہاڑوں میں نہیں آؤں گی۔"

اس نے سیٹ کی پشت سے سر ٹکا کر آنکھیں موند لیں۔ کتنے دنوں بعد آج اس کی کمر پر برف نہیں تھی۔

"تو یہ تھا میری کہانی کا اختتام۔ آخر اس موڑ پر آ کر قراقرم کی پری اور کوہ پیما کی کہانی ہو گئی۔" وہ بند آنکھوں سے بے حد افسردگی سے مسکرائی۔

لیکن قراقرم کی پری اور کوہ پیما کی کہانی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔

☆......☆......☆

محبت جیت ہوتی ہے
مگر یہ ہار جاتی ہے
کبھی دل سوز لمحوں سے

کبھی بے کار رسموں سے
کبھی تقدیر والوں سے
کبھی مجبور قسموں سے
مگر یہ ہار جاتی ہے
کبھی یہ پھول جیسی ہے
کبھی یہ دھول جیسی ہے
کبھی یہ چاند جیسی ہے
کبھی یہ دھوپ جیسی ہے
کبھی مسرور کرتی ہے
کبھی یہ روگ دیتی ہے
کسی کا چین بنتی ہے
کسی کو رول دیتی ہے
کبھی لے پار جاتی ہے
کبھی یہ مار جاتی ہے
محبت جیت ہوتی ہے
مگر یہ ہار جاتی ہے

اسلام آباد واپسی پر اسے ہر اس بندے سے لیکچر ملا، جس کی اس نے توقع کی تھی۔ پھپھو، ندا ...نوں، ممانی اور سب سے بڑھ کر سیف سے۔

"تمہیں احساس ہے کہ تمہاری زندگی ہمارے نزدیک کتنی اہمیت رکھتی ہے؟" وہ کتنی ہی دیر ...اپنی جان کو ہلاکت میں ڈالنے اور کوہ پیمائی کے نقصانات بتاتا رہا مگر جس طرح وہ خاموشی ...سر جھکائے بیٹھی رہی تھی وہ آخر اسے جھنجھوڑ کر بولا۔ پریشے نے سر اٹھایا۔ اس کے لبوں پر ...یہ سی مسکراہٹ تھی۔

"آپ کے لیے میری زندگی اہم ہے یا میں آپ کی زندگی ہوں؟" سیف کچھ بول نہ سکا۔

"اگر آپ کا لیکچر ختم ہو چکا ہے تو میں جاؤں؟"

"پریشے! اتم آئندہ......"

''آئندہ تم پہاڑوں کا نام نہیں لوگی، کلائمبنگ جیسی فضول سپورٹ میں حصہ نہیں لوگی... ای میل کا جواب دوگی، یہی ناں؟ تو میں یہ باتیں سن چکی ہوں۔ جواب دینا میں ضروری... سمجھتی۔'' وہ میز پر رکھے کاغذ فائل میں جوڑ کر اٹھ کھڑی ہوئی۔

سیف اتنا بے وقوف نہ تھا کہ اس کا سرد مہر رویہ نوٹ نہ کرتا، مگر وہ اس سب کو اس کی... کے مرنے کے باعث اپ سیٹ ہونا سمجھ رہا تھا۔

''مجھے دیر ہو رہی ہے۔'' وہ پرس کندھے پر اور اوور آل بازو پر ڈال کر باہر چلی آئی۔ وہ... جا رہی تھی۔ گزشتہ روز ہی اس نے پمز جوائن کیا تھا۔

پاپا آج صبح ہی واپس پہنچے تھے۔ یہ پریشے کو بعد میں علم ہوا کہ پاپا کو سارے معاملے کی... تھی مگر جانے کیوں شاید ارسہ کی موت کے باعث، انہوں نے پریشے کی ذہنی حالت محسوس کر... ہوئے کچھ نہ پوچھا۔ کوئی باز پرس نہیں کی، کوئی ڈانٹ ڈپٹ نہیں کی۔ اخبار میں یقیناً انہوں نے... خبر پڑھ لی تھی۔ ''مایا ناز ترک کلائمبر افق ارسلان'' کو انہوں نے نظر انداز کر دیا یا اہمیت نہ دی۔ ... وہ خود ایک ماہ پہلے تک کئی دفعہ کلائمبنگ میگزین اور سپورٹس میگزینز میں افق ارسلان کا نام پڑھ... کے بعد اسے نظر انداز کر دیتی تھی۔

پاپا اس کے معاملے میں بہت حساس تھے مگر چوں کہ وہ بالکل ٹھیک واپس آ گئی تھی، اس لیے انہوں نے اسے کچھ نہیں کہا۔

مگر وہ ''بالکل ٹھیک'' نہیں تھی۔ اندر سے بھی اور باہر سے بھی۔ وہ زندگی بھر کبھی اتنی خاموش اور الگ تھلگ نہیں رہی تھی، جتنی ان دنوں رہنے لگی تھی۔ پھپھو نے اسے دیکھا تو انہیں یقین نہیں آیا کہ یہ وہی پریشے ہے، جو پانچ اگست کو ہنزہ گئی تھی۔

اس کی گوری رنگت ماند پڑ چکی تھی اور وزن بیس بائیس پاؤنڈ کم ہو چکا تھا۔ سب کو یہ بات نظر آتی تھی، مگر کسی کو وہ نظر نہیں آیا تھا جو اسے اصل میں ہوا تھا۔ وہ بیماری جو اسے دراصل لاحق ہوئی تھی، پریشے جہاں زیب کو عشق ہو گیا تھا۔

☆......☆......☆

منگل، 6 ستمبر 2005ء

اس روز ندا آپا آئیں تو اسے اپنے ساتھ گھر لے گئیں۔ کسی اور وجہ سے یا پھر شاید یوم دفاع کی چھٹی کے باعث سیف گھر پر ہی تھا۔ اسے ندا آپا کے ہمراہ آتے دیکھ کر اس کی آنکھوں میں چمک آ گئی، جس سے پریشے کو نفرت تھی۔

''کیسی ہو پری؟'' وہ اس کا سر سے پیر تک جائزہ لے کر مسکرایا۔

پریشے نے سنجیدگی سے اسے دیکھا، ''سیف! آپ کو نہیں لگتا کہ میں اب بڑی ہو گئی...... ہوں اب مجھے پورے نام سے پکارنا چاہیے۔''

اس کی بات پر سیف ہنس پڑا، مگر اس کی پیشانی پر پڑے بل دیکھ کر اسے خاموش ہونا پڑا

''...... آپا آپ بھی سن لیں، آئندہ پریشے کو پری نہیں کہنا۔'' وہ خاموشی سے سیف کو دیکھتی جیسے اسے اس مذاق پر ہنسی نہیں آئی۔

''اوہ پری آئی ہے!'' پھپھو بھی کمرے سے باہر نکل آئیں، ''آج تو فریش لگ رہی ہو۔''

''جی پھپھو! بس ڈائٹ تھوڑی ہیلدی رکھی ہوئی ہے۔'' وہ بیٹھ گئی ندا آپا اندر سے بری کے کپڑوں والے شاپر اور ڈبے اٹھا لائیں۔

''سیفی بتا رہا تھا تم نے پمز میں جاب شروع کر دی ہے؟''

''جی پھپھو!''

''کب سے جا رہی ہو؟''

''چند دن ہوئے ہیں۔'' اسے اب اس تفتیش سے الجھن ہو رہی تھی۔

''خیر سے کتنی تنخواہ دیتے ہیں؟''

اس کو وہاں بیٹھنا مشکل لگ رہا تھا۔ اس نے کن اکھیوں سے سیف کو دیکھا، جو بہت دھیان سے اس سوال کے جواب کا منتظر تھا۔

اس نے آہستگی سے اپنی تنخواہ بتائی۔

''ہاں یہ اچھی ہے۔ ویسے بھی بیٹا اچھی بیوی وہ ہوتی ہے، جو شوہر کے شانہ بہ شانہ کام کرے۔ شوہر بھی تو اس کے لیے کماتا ہے۔'' یہ اس بات کا اشارہ تھا کہ وہ شادی کے بعد بھی ملازمت جاری رکھے گی۔

''اور نہیں تو کیا اچھا پری! یہ دیکھو، یہ جناح سپر سے فرنچ ویلوٹ کا لے کر آئی ہوں، پورے ... کا ہے۔'' انہوں نے نیوی بلیو ویلوٹ پر فیروزی ستاروں والا دوپٹہ سامنے پھیلایا۔ وہ غیر ارادی طور پر قدرے بے توجہی سے وہ سارا سامان دیکھتی رہی۔

سیف بھی ساتھ بیٹھا کپڑوں کے بارے میں، دکان داروں کی بے ایمانی کے بارے میں

مسلسل تبصرہ کر رہا تھا، جیسے عموماً عورتیں کرتی ہیں۔ اس نے کلاس بدل لی تھی لیکن اس کا رہنے کا سلیقہ اسے ابھی تک نہیں آیا تھا۔

دفعتاً اس کے موبائل کی بِپ بجی۔ اس نے موبائل نکال کر روشن سکرین کو دیکھا۔ وہاں غیر شناسا نمبر سے میسج آیا ہوا تھا۔ اس نے میسج کھولا۔ ''کیا میں آپ کو اس ٹائم کال کر سکتا ہوں آپ فارغ ہیں؟'' میسج رومن اردو میں تھا، تاکہ لکھنے والے کی جنس واضح ہو۔ اس نے کوفت سے اسے ڈیلیٹ کر دیا جب سے موبائل کمپنیوں نے نرخ سستے کیے تھے ایسے میسجز...... اور غیر شناسا نمبر سے کالز آتی رہتی تھیں۔ دنیا جہاں کے فارغ اور لوفر لڑکے ایسے کام کر کے لڑکیوں سے دوستی کے خواہش مند ہوتے تھے۔ اس نے ''ہو آر یو؟'' لکھ کر جواب بھی نہیں دیا اور موبائل رکھ دیا۔

''کس کا میسج تھا؟'' سیف نے فوراً پوچھا۔

''پاپا کا!'' اس نے یہ کہنے سے احتراز کیا کہ کسی کے ایس ایم ایس کے متعلق پوچھنا نہایت غیر اخلاقی حرکت ہے۔

''اچھا یہ والا دیکھو۔ یہ بریزے کا ہے۔'' انہوں نے بازو پر ایک اور ہلکا سا گرین کپڑا پھیلایا۔ وہ ''ہوں اچھا ہے'' کہہ کر خاموش ہوگئی۔

اسی اثنا میں روشان اور سنی جانے کہاں سے وارد ہوگئے۔

''ماما دیکھیں! سیفی ماموں ہمارے لیے مناپلی لائے ہیں۔'' روشان مناپلی کا گتہ اس کے کارڈز اور گوٹ ماں کو دکھانے لگا۔

''بھلا اتنے چھوٹے بچے یہ گیم کھیلیں گے؟'' ندا آپا نے کہا۔ پریشے کو بے اختیار کچھ یاد آیا۔ رات کی تاریکی، جلتے الاؤ سے اڑ کر فضا میں گم ہوتی چنگاریاں، لکڑیوں کے چٹخنے کی آواز ماہوڈھنڈ کے خاموش پانیوں پر چڑھی چاندنی کی تہ، دور دور تک پھیلا سبزہ زار......

اس نے سر جھٹکا۔ اس کو مزید وہاں بیٹھنا مشکل لگ رہا تھا۔ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

''میرا ڈیوٹی ٹائم ہے۔ ڈاکٹر واسطی بہت خفا ہوں گے، مجھے جانا ہوگا۔'' بہانہ اسے سوجھ گیا تھا۔

☆......☆......☆

پیر، 12 ستمبر 2005ء

جیولری شاپ کا شیشے کا دروازہ دھکیل کر وہ اندر داخل ہوئی۔ سیف اس کے عقب میں تھا۔

جلتی شوکیس کے سامنے سیٹوں کی لمبی قطار میں سے ایک کرسی کھینچ کر، ٹانگ پر ٹانگ بیٹھ گئی۔ سامنے بیٹھا سیلز مین پروفیشنل خوش اخلاقی سے اس کی جانب متوجہ ہوا، ''جی میڈم۔'' سیلز مین کے پیچھے والی دیوار شیشے سے ڈھکی ہوئی تھی، چمکتی ہوئی شیشے کی دیوار...... چمکتی دیکھ کر اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے سر جھٹکا اور آئینے میں ایک نظر خود پر ڈالی۔ لمبے اور سیدھے بالوں کو باندھ کر اس نے کیچر لگا دیا تھا۔ قیمتی پتھروں سے مزین کیچر جس کا دورنگا پتھر ڈھیلا تھا۔ چند لٹیں نکل کر اس کے گالوں کو چھو رہی تھیں۔ چند دنوں سے کھانے پینے کی احتیاط کے باعث اس کا چہرہ آج خاصا تروتازہ اور گال قدرے بھرے بھرے لگ رہے تھے۔

سیف اس کے ساتھ والی کرسی پر آ کر بیٹھ گیا۔ اس کو دیکھ کر دور بیٹھا ادھیڑ عمر سنار لپک کر اس کی جانب آیا۔

''جی سیٹھ صاحب! کوئی یونیک چیز دکھائیں، ہماری ہونے والی دلہن کو شادی کے دن پہننے کے لیے۔''

اس کو سیف کا متعارف کرانے کا انداز زہر لگا تھا مگر وہ خاموش رہی۔

سنار سیٹھ جھٹ سیاہ مخملیں ڈبوں میں سجے چمکتے دمکتے سونے کے سیٹ شوکیس پر رکھنے لگا۔ ایک لڑکا اس کی مدد کر رہا تھا۔

پریشے ایک ایک کر کے ہر سیٹ کو مسترد کرتی رہی۔ اسے اس سب میں کوئی دلچسپی ہی نہیں تھی۔ پاپا اور پھپھو نے کہا تھا کہ وہ سیف کے ساتھ اپنی مرضی کی شاپنگ کر آئے تو وہ چلی آئی۔

سیف نے بہت سے ڈبے کھلوا لیے۔ وہ جیولر کو اچھی طرح سے جانتا تھا۔ یقیناً وہ پہلے یہاں آتا رہتا تھا۔ ندا آپا کی شادی کو عرصہ گزر چکا تھا، جب ان کی شادی ہوئی تھی تب سیف اتنے مہنگے زیورات افورڈ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ یقیناً وہ پچھلے چند برسوں میں یہاں آتا رہا تھا، جانے کتنی لڑکیوں کو زیورات دلوانے۔ شاید اسی لیے اس نے دکان دار پر واضح کیا تھا کہ وہ لڑکی اس کی ہونے والی دلہن ہے، سو وہ محتاط رہے۔

ایک لمحے کو بھی اس کا دل نہیں چاہا تھا کہ وہ جیولرز سے سیف کے چکروں کے متعلق پوچھے۔ اسے سیف اور اس کے افیئرز میں کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اگر پاپا جانتے بوجھتے اپنی آنکھیں بند کر رہے تھے تو وہ بھی اپنی آنکھیں اور دل کب کی بند کر چکی تھی۔

''یہ فیروزی پتھروں والا تو بہت اچھا ہے۔ یہ لے لو۔'' اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے بالوں پر لگا

کیچر اتارا، سیاہ آبشار کمر اور چہرے کے اطراف میں گرتی چلی گئی۔

"آپ کے پاس اس طرح کا کوئی دوسرا کیچر ہوگا یا آپ اس پتھر کو جوڑ دیں۔ یہ ذرا اور کسی بھی لمحے اکھڑ جائے گا۔" پریشے نے کیچر شوکیس پر رکھتے ہوئے دو رنگے پتھر کی جانب اشارہ کیا۔

"یہ بالکل گرنے والا ہے۔ اس کیچر کو پھینک دو، میں تمہیں نیا لے دوں گا۔" سیف نے لاپروائی سے کیچر اٹھا کر ڈسٹ بن میں پھینکنا چاہا۔ کسی چیتے کی تیزی سے پری نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے کیچر چھینا۔

"ہاتھ مت لگائیں اسے۔ یہ بہت قیمتی ہے، سمجھے آپ؟"

کسی متاعِ عزیز کی طرح اسے مٹھی میں بند کیے پریشے نے سیف کو غصیلی نگاہوں سے دیکھا۔

وہ اس کے ردعمل پر ششدر رہ گیا۔ "پریشے! تم۔" اس نے آہستہ آواز میں کچھ کہنا چاہا۔

"میں گاڑی میں بیٹھ رہی ہوں آپ کو آنا ہے تو آجائیں، نہیں تو میں ٹیکسی سے چلی جاؤں گی۔" بالوں کو پوری طرح کیچر میں جکڑ کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور کھٹ کھٹ چلتی گلاس ڈور دھکیل کر باہر نکل گئی۔ سیف جیولر سے معذرت کرتا کچھ حیران کچھ دبے دبے غصے کے ساتھ اس کے پیچھے باہر نکل گیا۔

جیولر نے استہزائیہ انداز میں سر جھٹک کر ساتھ والے لڑکے کو بتایا۔ "بیگم صاحبہ شادی پر خوش نہیں ہیں، چچ چچ......"

لڑکا دانت نکوسنے لگا، جیولر پھر سے اپنی سیٹ سنبھال کر رجسٹر پر جھک گیا جب کہ لڑکا شوکیس پر رکھے زیورات کے مخملیں ڈبے بند کرنے لگا۔

☆......☆......☆

منگل، 13 ستمبر 2005ء

وہ ہسپتال جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ اوور آل بازو پر لپیٹا، سٹیتھوسکوپ پاکٹ میں گھسایا، جلدی جلدی جوتوں کی سٹریپس بند کیں، بالوں کو اسی طرح اسی کیچر میں جکڑا اور بیگ کندھے پر ڈال کر باہر نکل آئی۔

گاڑی کی جانب بڑھتے ہوئے اس نے نشاء کو گیٹ سے اندر آتے دیکھا۔

"تم ہسپتال جا رہی ہو؟" وہ اس کی تیاری اور عجلت بھرے انداز کو دور سے ہی پہچان گئی تھی۔

"ہاں، کہو کوئی کام ہے؟" وہ گاڑی کا لاک کھولتے ہوئے کھڑی ہونے لگی۔

"میڈم آپ کے جہیز کی شاپنگ کرنی ہے۔ آپ کو ممی بلا رہی ہیں۔"

"اوہو نشاء! امی کی چوائس بہت اچھی ہے، وہ خود کر لیں گی۔ تم ان کی ہیلپ کروا دینا، تمہیں پسند ناپسند کا علم تو ہے۔"

"مگر ابھی ہم جوتے لینے جا رہے ہیں، جو تمہیں ہی لینے ہوں گے۔"

"یار! ادھر اسلام آباد پنڈی سے کہاں اچھے جوتے ملتے ہیں؟ اور میرے پاس بہت جوتے ہیں، چھوڑو رہنے دو، مجھے دیر ہو رہی ہے۔" اس نے فکرمندی سے گھڑی دیکھی۔

"بے وقوف! لینے تو پڑیں گے آخر کو شادی ہے تمہاری۔"

اس کے چہرے سے سایہ سا گزر گیا۔ دروازے کے ہینڈل پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔

"پری!" وہ اس کے قریب چلی آئی۔ "اگر فیصلہ کر لیا تھا تو کمپرومائز کرنا بھی سیکھو۔ سیف جیسے بھی ہیں انہیں قبول کرو اور دل سے کرو۔"

"دل؟" ایک پھیکی مسکراہٹ اس کے لبوں کو چھو گئی۔ "دل تو کہیں دور قراقرم کے پہاڑوں میں کھو گیا ہے۔ اب تو یاد بھی نہیں کہ کس جگہ کھویا تھا اسے۔ ماہوڈھنڈ کی جھیل میں یا ڈومانی کی دھند میں۔"

"کوئی فون، کوئی خط، کوئی رابطہ نہیں کیا اس نے؟"

وہ جانتی تھی نشاء کس کی بات کر رہی تھی۔

"نہیں اس کو فون نمبر دیا کب تھا۔"

"ای میل؟"

"احمت دوران کی وائف کی آئی تھی، میں نے جواب نہیں دیا۔ مجھے ترکی کے باسیوں سے رابطہ نہیں رکھنا۔" وہ سر جھٹک کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گئی اور دروازہ بند کر لیا۔ کھلے شیشے کے پاس نشاء کھڑکی پر جھکی۔ پریشے نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"خوش رہا کرو پری! ورنہ لوگ سب جان جائیں گے۔"

"جاننے دو۔" اس نے اگنیشن میں چابی گھمائی۔ گاڑی کے انجن میں حرکت ہوئی۔ نشاء سامنے سے ہٹ گئی۔ وہ پیچھے دیکھتے ہوئے گاڑی باہر نکالنے لگی۔

ہاتھ کی لکیروں میں کیا تلاش کرتے ہو؟

ان فضول باتوں میں کس لیے الجھتے ہو

جس کو ملنا ہوتا ہے
بن لکیر دیکھے ہی
زندگی کے رستوں پر
ساتھ ساتھ چلتا ہے
پھر کہاں بچھڑتا ہے؟
جو نہیں مقدر میں
کب ہمیں وہ ملتا ہے؟
کب وہ ساتھ چلتا ہے؟
ہاتھ کی لکیروں میں
کیا تلاش کرتے ہو؟

☆......☆......☆

یہ اسی شام کی بات ہے جب اسے ہسپتال میں فون کر کے نہایت بدحواسی کے عالم میں بدو نے بتایا کہ جہاں زیب صاحب کی طبیعت اچانک خراب ہوگئی ہے۔ وہ آفس سے جلدی آ گئے تھے اور ابھی گاڑی سے نکلے ہی تھے کہ ان کی حالت بگڑ گئی۔

وہ اپنے سب کام چھوڑ کر بھاگم بھاگ گھر پہنچی، مگر جس وقت وہ گھر میں داخل ہوئی، ممانی اور نشاء پہلے سے ہی وہاں موجود تھیں اور پاپا...... وہ کافی دیر ہوئی جا چکے تھے۔ انہوں نے اس کے پہنچنے کا، اس سے آخری بار ملنے کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔

اسے نہیں معلوم وہ کتنے دن بغیر کچھ کھائے پیے روتی رہی تھی۔ اس کے غم بہت تھے، وہ کس کا ماتم کرتی؟ اپنی زندگی کی پہلی اور آخری محبت کو اس نے جس شخص کے لیے چھوڑا تھا، وہ اسے چھوڑ کر، بھری دنیا میں تنہا کر کے جا چکا تھا۔ وقت ایک دفعہ پھر چھ برس پیچھے چلا گیا تھا۔ تب بھی یوں ہی لوگوں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے دلاسا دیا تھا۔ کھوکھلے دلاسے اور جھوٹی تسلیاں آج بھی اسے یہی مل رہی تھیں۔

اس نے بہت لوگوں کو پاپا کی میت کے سرہانے بین کرتے دیکھا تھا، ان میں ندا آپا بھی تھیں اور پھپھو بھی۔ وہ بے تاثر، بھیگی نگاہوں سے سب کو دیکھتی رہی۔ وہ ان سب کو اندر باہر سے جانتی تھی۔ ان کے آنسوؤں کی حقیقت کو سمجھتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ اگر کسی کو اس بھری دنیا میں پاپا

بچوں کا خیال تھا تو وہ صرف وہ خود تھی۔ اس کی زندگی میں دو ہی مرد تھے، ایک پاپا اور ایک ...ن۔ ایک پہلے چھوڑ گیا تھا اور دوسرے نے اب چھوڑ دیا تھا۔ وہ پھر سے اکیلی رہ گئی تھی۔

☆......☆......☆

وقت کا کام ہے گزرنا اور وہ تو گزر ہی جاتا ہے۔
...ر نہیں تو ہنس کر......
ہنس کر نہیں تو رو کر......
بھلا وقت کب ایک سا رہتا ہے؟

سو یونہی جہاں زیب کی زندگی میں بھی وقت گزر رہا تھا۔ چند دن اس نے بہت ماتم کیے ...ے لگتا تھا اب زندگی ختم ہو چکی، مگر پھر گزرتے دنوں کے ساتھ اس نے خود کو سنبھال ہی لیا ...ں اب وہ پھر سے کمزور ہوتی جا رہی تھی، ہنسنا بولنا اس نے ترک کر کے خود کو زندگی کے بہتے ...ے پر چھوڑ دیا تھا۔

اب اس اتنے بڑے ویران بنگلے میں وہ رہ کر کیا کرتی؟ سو شادی تک جو جہاں زیب صاحب ...وفات کے باعث فی الحال ملتوی ہو چکی تھی، اس نے ماموں کی طرف رہنے کا فیصلہ کیا۔ ویسے ...ماموں اب اسے اکیلے نہیں رہنے دے رہے تھے، وہ اس کے کچھ کہنے سے قبل ہی اسے اپنے ...ھ اپنے گھر لے آئے۔

چند دن تو خاموشی سے کمرے میں بند رہ کر اس نے بتا دیے پھر اس روز نشاء اس کے پاس آئی ...سمجھانے لگی۔

"زندگی میں غم آتے رہتے ہیں، یہ غم اتنا بڑا ہے کہ میں تمہیں صبر کرنے کو تو نہیں کہوں گی، مگر ...ہیں خود کو سنبھالنا ہوگا۔"

"میں کوشش کر رہی ہوں۔"

"میری بات مانو تو ہسپتال پھر سے جوائن کر لو۔"

"ہاں، یہی سوچ رہی تھی۔ مصروف رہوں گی تو شاید صبر آ ہی جائے۔" وہ زبردستی مسکرائی۔

"پری! اب تم زندگی کو نئے سرے سے شروع کرو۔"

نشاء بہت آہستہ آہستہ کہہ رہی تھی۔

"جو کچھ جیسے ہو رہا ہے، اسے ویسے ہی ہونے دو۔ نشاء مجھے کسی سے کوئی شکوہ نہیں۔ پاپا نے

میرے لیے اچھا ہی سوچا ہوگا۔ اس لیے مجھے مزید کوئی فیصلہ نہیں کرنا۔ مجھے سیف قبول ہے
کے کہنے سے قبل ہی اس کا مطلب سمجھ کر پریشے نے کہا۔

نشاء احتجاجاً کچھ کہنے لگی تھی، مگر پھر مصلحتاً اس قصے کو کچھ عرصے تک پس پشت ڈالنے کا
رک گئی۔ پریشے خود بھی ابھی اس معاملے پر کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھی۔

پھر اس نے ہسپتال جانا شروع کر دیا۔ حالات اب دوبارہ معمول پر آنے لگے تھے۔
لاشعوری طور پر انتظار تھا کہ نشاء پھر اس سے اس بارے میں کوئی بات کرے گی، مگر اس روز کے
نشاء نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔

ماموں، ممانی اور نشاء کی محبتوں کے قرض اٹھائے اس نے خود کو زندگی کے جھمیلوں میں گم کر لیا

شاید اسے صبر آ گیا تھا۔

یا شاید اس نے سمجھوتا کر لیا تھا۔

☆......☆......☆

جمعہ، 30 ستمبر 2005ء

وہ ہسپتال میں اپنے کمرے میں بیٹھی تھی۔ سامنے والی کرسی پر ایک معمر عورت اور ساتھ ایک
نوعمر لڑکی نشست سنبھالے، منتظر نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ رہی تھیں۔ وہ سر جھکائے، دونوں
کہنیاں ٹیبل پر رکھے تیزی سے پیڈ پر قلم چلاتے ہوئے نسخہ لکھ رہی تھی۔ کیچر سے نکلی چند لٹیں
کے ماتھے سے لٹک کر کاغذ کو چھو رہی تھیں۔

نسخہ لکھ کر وہ سیدھی ہوئی۔ کاغذ پیڈ سے پھاڑا اور بغیر تہہ کیے معمر خاتون کی جانب بڑھایا۔

''بچی کی خوراک کا خیال رکھو۔ یہ تو ویسے بھی بہت کم عمر ہے۔ اب گھر جا کر اس سے کام وغیرہ
نہ کرواتی رہنا۔''

بوڑھی عورت نسخہ تھام کر شکریہ ادا کرتی اٹھ کھڑی ہوئی۔ سہمی ہوئی لڑکی نے اس کی تقلید کی۔
اس نے سیاہ چادر کا کونا چہرے کے گرد پھیلا کے انگلیوں سے پکڑ رکھا تھا۔ اس کی انگلیوں پر مہندی
کے مدھم بیل بوٹے نمایاں تھے۔ کلائی میں سستا سا زیور بھی تھا۔

پریشے نے اپنی سونی کلائیوں اور مرمریں ہاتھوں کو دیکھا۔ چند ماہ گزر جائیں پھر ان پر
مہندی لگی ہوگی۔ ان کلائیوں میں بھی کسی کے نام کا......

وہ سر جھٹک کر سامنے رکھی فائل کی جانب متوجہ ہو گئی۔ دفعتاً اس کے موبائل کی گھنٹی بجی۔

پلٹتے ہوئے فون کان سے لگا کر مصروف سے انداز میں ہیلو کہا۔

''ڈاکٹر پریشے جہاں زیب بات کر رہی ہیں جی؟''

مردانہ اور غیر شناسا سی تھی۔ اس نے موبائل کان سے ہٹا کر نمبر دیکھا۔ پنڈی اسلام آباد
کا سرکاری نمبر تھا۔

''جی بات کر رہی ہوں، آپ کون؟''

''ڈاکٹر صاحبہ! میں رائزنگ پاکستان سے بول رہا ہوں۔ ہم آپ کو اپنے شو میں انوائٹ کرنا
چاہتے ہیں۔'' دوسری جانب کوئی پروڈیوسر صاحب تھے۔

''اچھا؟ مگر کس سلسلے میں؟''

''آپ کو ابھی چند ہفتے قبل راکاپوشی سے آرمی نے ریسکیو......''

''سوری۔ مجھے کوئی انٹرویو نہیں دینا۔'' وہ رکھائی سے کہہ کر فون بند کر کے دوبارہ فائل پر

لمحوں بعد دوبارہ گھنٹی بجی۔ اس نے سکرین پر چمکتا نمبر دیکھا۔ وہی نو سے شروع ہونے والا
نمبر تھا۔

''جی؟''

''ڈاکٹر صاحبہ! ہم آپ کو انٹرویو کے لیے بہت اچھا......''

''رانگ نمبر، میں وہ پریشے جہاں زیب نہیں ہوں۔ بائے۔'' اس نے درشتی سے بات کاٹ
دیا۔ فوراً ہی گھنٹی دوبارہ بج اٹھی۔ اس نے دیکھا بھی نہیں کہ اس بار سکرین پر جگمگاتا نمبر
نمبر ہے اور تیزی سے فون کان سے لگایا۔

''فرمائیے؟'' لہجے میں دبا دبا سا غصہ تھا۔

''السلام علیکم، ڈاکٹر پریشے جہاں زیب؟'' لہجہ بھاری اور رعب دار تھا۔

''اب آپ کو کیا پرابلم ہے؟'' اس کو اتنا شدید غصہ چڑھا تھا کہ اس نے مختلف آواز اور لب
نہیں کیا۔

''آپ کو یاد ہوگا آپ کو راکاپوشی سے پاک آرمی نے......''

کر دیا تھا پاک آرمی نے مجھے ریسکیو کر کے۔ میں معافی چاہتی ہوں کہ میں بچ کر زمین
خدا کے لیے مجھے معاف کر دیں۔ میں اگلی دفعہ زندہ بچ کر آنے والی غلطی نہیں کروں

گی۔اب مجھے کال مت کیجیے گا۔" کھری کھری سنا کر اس نے کال منقطع کی اور پھر موبائل بند
کر کے رکھ دیا۔

"اتنے دن ہو گئے پھر بھی لوگ بھولے نہیں ابھی تک......" بڑبڑاتے ہوئے اس کی نگاہ میز پر
رکھے کیلنڈر پر پڑی جو اسے سعید بک بینک سے کتابوں کی خریداری پر مفت ملا تھا۔

اس نے گھڑی دیکھی رات کے آٹھ بجنے کو تھے، وہ اٹھنے ہی لگی تھی سو کیلنڈر کا صفحہ پلٹ کر
وقت کو چار گھنٹے پہلے اکتوبر میں لا کھڑا کیا۔

اکتوبر کے صفحے پر تاریخوں سے اس طرف دیار کے درختوں کے جھنڈ کے اس پار راکاپوشی
کھڑا تھا۔اس کی چوٹی دھند میں لپٹی تھی۔جو چیزیں وہ بھول جانا چاہتی تھی جانے کیوں بار بار اس
کے راستے کو کسی ڈراؤنی کالی بلی کی طرح کاٹ جاتی تھیں۔

اس نے کیلنڈر اٹھا کر میز کی دراز میں ڈال دیا اور کرسی پیچھے کر کے کھڑی ہو گئی۔اس کا موبائل
ابھی تک آف تھا۔

☆......☆......☆

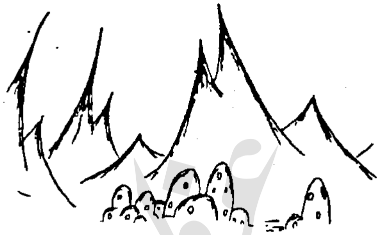

تیرھویں چوٹی

ہفتہ، 18 اکتوبر 2005ء

سفید دودھ سی اجلی برف کے درمیان سیدھی لکیر کی طرح دراڑ پڑ رہی تھی۔دراڑ کے نیچے کی
برف سلائیڈ ہو کر نشیب میں گرنے لگی۔ہر سو برفیلی سفید دھول تھی۔افق اس دھول میں
چھپ گیا۔وہ حلق کے بل چلا کر افق کو پکار رہی تھی۔وہ کہیں نہیں تھا۔اردگرد کے پہاڑ اس پر قہقہے لگا
رہے تھے۔

وہ ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

اس کا پورا جسم پسینے میں شرابور تھا۔اس نے بے یقینی کے عالم میں اپنے چہرے کو چھوا۔وہاں
نمی نہیں لگی تھی۔وہ راکاپوشی پر نہیں تھے۔وہ اپنے نرم گرم بستر میں، اپنے خوب صورت اور آرام دہ
کمرے میں تھی۔

اس نے دوپٹہ اٹھا کر چہرہ خشک کیا۔ خود کو نارمل کرنے میں اسے چند منٹ لگے تھے۔

وہ خواب، وہ خوف زدہ کر دینے والے خواب اُس کا پیچھا نہیں چھوڑ رہے تھے۔

اس نے گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔ پونے نو ہونے والے تھے۔

"گاڈ، مجھے تو آٹھ بجے تک ہسپتال پہنچنا تھا۔" وہ تیزی سے پاؤں میں سلیپر ڈالے باتھ روم کی جانب بھاگی۔ منہ پر چند چھینٹے مارے، بالوں کو سنوارے بغیر کیچر میں کسا، الٹے سیدھے جوتے پہن کر وہ پانچ منٹ میں باہر آ گئی۔ ممانی اور نتاشہ سامنے نظر نہیں آ رہی تھیں۔ ماموں تو شاید آفس جا چکے تھے۔

ڈائننگ ہال میں ناشتہ نہیں لگا تھا۔ اس نے جلدی سے فریج کا دروازہ کھول کر نیسلے اورنج جوس کا بڑا سا پیک نکالا اور اسے منہ سے لگانے ہی لگی تھی کہ یاد آیا آج تو روزہ تھا۔

اسے خود پر ہنسی بھی آئی اور شرمندگی بھی محسوس ہوئی۔ جوس کا پیکٹ ہاتھ میں پکڑے اس نے دوسرا ہاتھ فریج کھولنے کو بڑھایا اور دوسرے ہی پل زمین زور سے ہلی۔

جوس کا پیکٹ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گرا۔ بے اختیار لڑکھڑاتے ہوئے اس نے قریبی میز کا کنارہ مضبوطی سے تھاما۔ زمین نے دو زوردار جھٹکے اور دیئے اور پھر سکوت چھا گیا۔

"مجھے خواب اور چکر بہت آنے لگے ہیں۔" خود کو کوستے ہوئے اس نے پیکٹ اٹھا کر فریج میں رکھا اور ملازم کو فرش صاف کرنے کا حکم صادر کر کے پرس کندھے پر ڈالے باہر نکل آئی۔

اس کا ذہن تیزی سے کام کرتے ہوئے ڈاکٹر واسطی سے دیر سے آنے پر کیے جانے والا بہانہ سوچ رہا تھا۔

ہسپتال میں ماحول معمول کا تھا۔ سامنے استقبالیہ کاؤنٹر تھا، دونوں اطراف میں چمکتی دمکتی راہداریاں مگر ان راہداریوں میں ادھر ادھر بھاگتے لوگوں میں ہلکا سا "غیر معمولی پن" تھا۔ تھوڑی سی ہلچل تھوڑی سی افراتفری۔

وہ تیزی سے سامنے سے آتے ڈاکٹر واسطی کی جانب بڑھی۔

"وہ سر! میں آنے ہی والی تھی کہ میری کار......"

"ٹھیک ہے، ٹھیک ہے، آپ ایمرجنسی میں جائیں۔" وہ عجلت میں کہہ کر آگے بڑھ گئے۔

"ایں؟ آج سر نے ڈانٹا نہیں؟" وہ حیران ہوتی پلٹی تو سامنے ریسپشن ڈیسک سے اوپر دیوار پر لگے ٹی وی کی اسکرین پر نظر پڑی۔

بڑی نیوز فلیش تھی جس سے اسے علم ہوا کہ چند منٹ قبل اس کا سر نہیں چکرایا تھا۔

بڑ تھا۔

☆......☆......☆

ب حشر برپا تھا۔ اسے نہیں معلوم تھا کہ وہ کتنے گھنٹوں سے مسلسل مریضوں میں گھری تھی۔ ب تک ایمرجنسی میں تھی تو دوسری جنرل وارڈ میں۔ زخمیوں کو لانے کا سلسلہ کئی گھنٹوں تھا بلکہ اب تو کشمیر سے بھی زخمی لائے جا رہے تھے۔ راولپنڈی، اسلام آباد کے تمام رے ہوئے تھے۔ ہر چند منٹ بعد سٹریچر پر زخمی لائے جا رہے تھے۔ کوئی خون میں لت پت، جسمانی اعضا سے محروم تو کسی کا چہرہ مسخ ہو کر سیاہ ہو چکا تھا، عجب منظر تھا۔

یہ صرف مارگلہ ٹاورز تک محدود نہیں رہا تھا، بلکہ کشمیر کے چناروں تک یہ قیامت خیز ہلاکت پھیل گئی تھی۔ مانسہرہ، ایبٹ آباد، باغ، وادی نیلم، وادی جہلم، گڑھی دوپٹہ، گڑھی حدیگل، بانا، کالا ڈھاکا اور ایسے نام والے بہت سے شہر اور گاؤں جو آدھے پاکستان نے زندگی بھر نہ سنے تھے۔ سیاست دان اور وزیر تو مارگلہ ٹاورز کے ملبے پر کھڑے ہو کر تقریر کر کے اور فوٹو بنوا چکے تھے، مگر ہسپتالوں میں ایمرجنسی نافذ تھی۔ جانے کتنی دیر بعد وہ ذرا جو کمر سیدھی کرنے کو لابی میں ایک طرف رکھے صوفے پر جا کر بیٹھی تو قریب بیٹھے کسی ڈاکٹر کا فقرہ کانوں سے

"یہ سب ہمارے گناہوں کی سزا ہے۔"

اس کا ایک دم پارہ ہائی ہو گیا۔ "گناہوں کی سزا ہے تو پھر اللہ سے معافی مانگیں اور اپنی اصلاح کریں بجائے ادھر بیٹھ کر دوسروں کو نصیحت کرنے کے۔ تبدیلی ہمیشہ میں سے شروع ہوتی ہے، تم سے نہیں۔" غصے سے کہہ کر وہ اٹھی اور تیز تیز قدموں سے چلتی راہداری کا موڑ مڑتے ہوئے کسی سے ٹکراتے ٹکراتے بچی۔

"سوری میں......" اسی بگڑے موڈ میں سوری کرتے کرتے وہ رک کر اس نوعمر لڑکے کو دیکھنے لگی جس سے وہ ٹکرانے والی تھی۔ بہت جانی پہچانی شکل تھی۔

"ارے ڈاکٹر پریشے؟ کیسی ہیں آپ؟" اس نے آستینیں کہنی تک چڑھا رکھی تھیں اور غالباً زخمیوں کو مارگلہ ٹاورز سے لانے میں رضاکارانہ طور پر مدد کر رہا تھا۔

"ٹھیک ہوں، تم وہی ہو ناں جس کے ابا......"

"جی، جس کے ابا کے بارے میں آپ نے پیش گوئی کی تھی کہ انہیں ترقی ملے گی، جبر... پچھلے ہفتے ریٹائر ہو گئے ہیں۔" وہ مسکرا کر بولا۔

"تو مجھے تو حسیب نے کہا تھا۔ وہی بڑا امپریس تھا جنرل صاحب سے! میں تو نہیں تھی۔"

"ظاہر ہے، ان جیسا ہینڈسم کور کمانڈر پنڈی کو کبھی نہیں ملا۔"

"اچھا ہٹو راستے سے۔" وہ رکھائی سے کہہ کر اس کے ایک طرف سے نکل کر آگے بڑھ گئی۔ پلٹ کر اسے دیکھنے لگا، اس وقت تک جب تک وہ راہداری کے آخری سرے سے آگے غائب نہ ہو گئی اور پھر سر جھٹک کر خود بھی مخالف سمت کو ہولیا۔

☆......☆......☆

بدھ، 12 اکتوبر 2005ء

"کچھ پتا چلا تمہارے کزن کا، فرح؟" ہسپتال جانے کے لیے تیار ہوتے ہوئے اس نے فون کال سے لگائے پوچھا۔ فرح اس کی کولیگ ڈاکٹر تھی اور 8 اکتوبر کے زلزلے کے بعد اکٹھے کام کرنے کے باعث دونوں میں اچھی خاصی دوستی بھی ہو گئی تھی۔

"نہیں یار! ان کا اپارٹمنٹ دوسرے فلور پر تھا اور مارگلہ ٹاورز کے دوسرے فلور پر تو آٹھ فلورز گر پڑے ہیں۔ اچھا، میں نے تمہیں فون اس لیے کیا تھا کہ مظفر آباد میں پیرامیڈیکل اسٹاف کی ضرورت ہے، میں نے وولینٹیر کر دیا ہے۔ تم چلو گی؟"

"نہیں میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔ ویسے تم جاؤ گی کیسے؟"

"آرمی ہیلی کاپٹر پر اور کیسے؟ روڈز تو ابھی تک بلاک ہیں۔ لینڈ سلائیڈنگ بھی خاصی ہوئی ہے۔ چلو پھر بات ہو گی۔"

پریشے نے الوداعی کلمات کہہ کر فون رکھ دیا اور جلدی جلدی تیار ہو کر باہر نکلی۔ رات تین بجے کر سوئی تھی، سو آج دیر سے آنکھ کھلی تھی۔

"السلام علیکم پھپھو! ماموں! آپ ابھی تک آفس نہیں گئے؟" پھپھو بھی ماموں کے ساتھ لاؤنج میں ہی بیٹھی تھیں، وہ بہ یک وقت دونوں کو مخاطب کر کے بولی۔

"بس نکلنے لگا ہوں۔ تم نے سحری نہیں کی؟"

"بس اٹھ نہیں سکی مگر نیت کر لی تھی۔" وہ اپنی ازلی لاپروائی سے بولی۔ ماموں واقعی جانے والے تھے سو اٹھ کر چلے گئے۔ وہ مروتاً کچھ دیر کے لیے پھپھو کے پاس بیٹھ گئی۔

...تو ظاہر ہے اب بھائی کی وجہ سے لیٹ ہی کریں گے مگر تیاری تو بہر حال کرنی ہے۔ ...پیالہ والوں سے دونوں سیٹ اٹھانے جا رہی ہوں، تم بھی چلو۔ پھر آگے مہندی کا ...کرنا ہے، وہ تم خود ہی کرنا۔ اب مجھے کیا پتا آج کل کی لڑکیوں کی پسند کا۔"

...سے منہ کھولے انہیں دیکھنے لگی۔

"...نہیں لینے ہی آئی تھی۔" انہوں نے وضاحت کی۔

"...کے لیے پھپھو! ملک پر اس وقت آفت ٹوٹی ہوئی ہے، لوگ مر رہے ہیں اور آپ لوگوں کو ...جوڑے کی پڑی ہے؟" اسے سخت صدمہ پہنچا تھا۔

"...تو ٹھیک ہے، مگر زلزلہ ہم تو نہیں لائے۔ یہ دکھ سکھ تو چلتے ہی رہتے ہیں۔ اب ان کے لیے ...خوشیاں بھی حرام کر لیں؟" پھپھو کو اس کی بات پسند نہیں آئی تھی۔

"...دکھ چلتے نہیں رہتے۔ دکھ تو آتے ہیں اور ٹھہر جاتے ہیں۔ جانے کتنے بچے بوڑھے اور ...زلزلے میں جان ہار گئے۔ فرض کریں، ہم تب بھی خوشیاں مناتے اگر ان مرنے ...میں یا سیف ہوتے؟"

"...خدا نہ کرے، سیف کیوں ہوتا؟" وہ دہل کر بولیں۔

...دیکھ کر رہ گئی۔ انہوں نے صرف سیف کا نام لیا تھا۔ انہیں صرف سیف پیارا تھا۔ یہ "...خدا نہ کرے تم اور سیف کیوں ہوتے؟" وہ کسی گنتی میں بھی نہ تھی۔

"...کم پاپا کا کفن تو میلا ہونے دیا ہوتا پھپھو!" وہ تیزی سے کہہ کر باہر نکل آئی اور پھر کتنی ...کے دروازے کے ساتھ کھڑی خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرنے لگی۔

...اس دنیا میں کسی کے لیے بھی اہم نہیں تھی، سوائے اس شخص کے جو اسے قراقرم کی پری ...جس نے محبت بھی کی تھی اور اظہار بھی نہیں کیا تھا۔

...کے سارے راستے وہ بے آواز روتی آئی تھی۔ پھر ہسپتال پہنچ کر اس نے فوراً ڈاکٹر ...

"...تم مظفر آباد جا رہی ہو ناں؟ تو پھر مجھے بھی ساتھ لے چلو" اس نے فرح کو ملتے ہی ...جانے والا فیصلہ سنا دیا، جو وہ تمام راستہ سوچتی آئی تھی۔

"...پھر ابھی چلو۔" فرح نے مصروف سے انداز میں کہا اور آگے کو بڑھ گئی۔

...وہ آج پھر...... ایک دفعہ پھر ان پہاڑوں میں واپس جا رہی تھی، جن کی شکل نہ

دیکھنے کی قسم اس نے کھائی تھی۔ تین ماہ قبل بھی وہ پھپھو اور ندا آپا کے لگائے زخموں سے نجات
لیے پہاڑوں میں گئی تھی۔

آج پھر اس نے فرار حاصل کرنے کا وہی راستہ سوچا تھا۔

☆......☆......☆

جمعہ، 14 اکتوبر 2005ء مظفرآباد۔

وہی بارشوں کا موسم
وہی سردیوں کی شامیں
وہی دلربا گھٹائیں
وہی سانس لیتی خوش بو
وہی موڑ مڑتی سڑکیں
وہی پرسکوں جگہ ہے
ہے فرق بس ذرا سا
جو گزشتہ موسموں میں
میرا ہمنوا تھا
جانے وہ اب کہاں ہے؟
جانے وہ اب کہاں ہے؟

وہ ایک اسکول کی منہدم عمارت کے ملبے کے قریب کھڑی تھی۔ اس کی پشت پر سبزہ زار تھا جس کے آخری کنارے پر کھڑے ہیلی کاپٹر کے پروں کی بھاری گڑگڑاہٹ اس احاطے میں موجود بیسیوں لوگوں کو کانوں پر ہاتھ رکھنے پر مجبور کر رہی تھی۔

چھت کے ٹوٹے ٹکڑوں اور وزنی لوہے کی سلوں تلے جانے کتنے بچے ابھی تک زندہ تھے۔ مقامی افراد، ریسکیو ٹیمیں، رضا کار اور فوجی جوان مسلسل ملبہ ہٹا کر بچوں کو نکالنے میں مصروف ہوئے تھے۔

وہ ملبے سے چند قدم دور سینے پر ہاتھ باندھے خاموشی سے کھڑی انہیں دیکھ رہی تھی۔

کیچڑ سے نکلتے بات تیز ہوا سے اڑ رہے تھے۔ ہوا میں خنکی بڑھتی جا رہی تھی۔

کسی بچے کے زخمی وجود کو نکال کر سٹریچر پر ڈالے دو فوجی جوان کیمپ لے جا رہے تھے۔

...ن موڑ کر سٹریچر پر موجود معصوم بچے کو دیکھتی رہی۔

...پٹر کی جانب سے کیموفلاج یونیفارم میں ملبوس ایک آرمی آفیسر تیزی سے دو جوانوں کو ...دے رہا تھا۔

...نے کہا تھا کہ دس سے بیس کلو والے پیکٹ بنانے ہیں، ایزی ڈراپ کے لیے مگر انہوں ...لتے بولتے وہ یک لخت رک کر پریشے کو دیکھنے لگا۔ پریشے نے ایک سرسری نگاہ اس پر ...واپس منہدم عمارت کی جانب موڑ لیا۔ اسے کیپٹن بشیر کا انتظار تھا جس کے ساتھ اس ...غ کے میڈیکل کیمپ جانا تھا۔

...ی دیر بعد اسے احساس ہوا کہ وہ سمارٹ سا آفیسر ابھی تک اسے دیکھ رہا ہے۔ اس نے ...کر اسے دیکھا۔ وہ اب پری کی جانب اشارہ کر کے کیپٹن بشیر سے کچھ پوچھ رہا تھا۔ ...چند لمحوں بعد وہاں سے چلا گیا۔ وہ آفیسر پھر سے اسے دیکھنے لگا۔ وہ پریشے کے لیے قطعاً ...اگر کسی آرمی والے کو جانتی بھی تھی تو وہ وہی تھے، جنہوں نے اسے راکاپوشی سے ریسکیو ...آفیسران میں سے نہیں تھا۔

...جب کیپٹن بشیر آیا تو وہ اس کے ہمراہ وہاں سے جانے لگی۔

...پٹن بشیر سے اس کا تعارف وہیں مظفرآباد میں ہوا تھا۔ وہ بہت سادہ، مؤدب اور اونچا لمبا ...کا باپ فوج میں صوبے دار رہا تھا۔ وہ اپنے گاؤں کا تیسرا لڑکا تھا جو فوج میں گیا تھا اور ...ت پر بے حد فخر تھا۔

...وہاں آرمی کے فیلڈ ہسپتال میں ہی رہ رہی تھی۔ بشیر اس دوران اس کی ہر ممکن مدد کرتا ...ں سے اسے ایک دن پریشے نے اپنا ''لیزان آفیسر'' کہا تو ڈاکٹر فرح حیرت سے بولی۔

...یا مطلب؟''

...یہ ماؤنٹین کلائمبرز اور پاکستان آرمی کا آپس کا مذاق ہے۔'' وہ ہنس کر بولی تھی اور ...اپس گم ہو گئی۔ اس سے زیادہ وہ کسی سے فری نہیں ہوتی تھی۔

...کیپٹن بشیر! یہ آدمی میرے بارے میں کیا کہہ رہا تھا؟'' اس کے ہمراہ چلتے ہوئے پریشے ...

...پ کا نام وغیرہ پوچھ رہے تھے۔ میں نے بتا دیا۔''

...''(جانے کون تھا) اس نے لاپروائی سے شانے اچکائے۔

"ویسے میڈم! میں نہیں جانتا، یہ کون تھے۔ ایوی ایشن کے تھے شاید اور......"

"اچھا ٹھیک ہے، اٹس اوکے۔" لمبی وضاحت سے بچنے کو وہ بولی تو کیپٹن بشیر فوراً... گیا۔ یہ سویلین ڈاکٹر بہت موڈی تھی، یہ وہ اندازہ کر چکا تھا۔

☆......☆......☆

جمعہ، 21 اکتوبر 2005ء

"کتنا خراب ہو رہا ہے زخم، اوہ گاڈ!" وہ بڑبڑاتے ہوئے بچی کی پٹی کھولنے لگی۔ اس... گھر مسمار ہو گیا تھا۔ وہ 8 اکتوبر کی رات ہی نکال لی گئی تھی، مگر ابتدائی طبی امداد کے طور پر... چائے کی پتی سے بند کیا گیا تھا، جو اب اسے خراب کر رہی تھی۔

ادھر باغ میں بھی تمام لوگوں کے زخم یونہی بند کیے گئے تھے جو بے حد نقصان دے رہے... مگر خیر وہ اور کرتے بھی کیا۔ وہ اب زخم کو صاف کرتے ہوئے افسوس کر رہی تھی۔

وہ کل ہی باغ سے واپس آئی تھی۔ وہاں روز تقریباً ڈیڑھ سو مریض دیکھتی تھی جو... سفر کر کے کیمپ تک پہنچتے تھے۔ جانے کتنے دنوں سے اس کی نیند پوری نہیں ہوئی تھی۔

وہ اس وقت مظفر آباد کے نیلم سٹیڈیم میں نصب فیلڈ ہسپتال کے ایک خیمے میں تھی۔ اس... کے سامنے اور اس کے دائیں طرف چند اور مریض بھی بیٹھے تھے۔

دفعتاً کیپٹن بشیر خیمے کا کپڑا ہٹا کر اندر آیا۔

"میڈم! ویکسین آ گئی ہے۔" اس نے پیکٹ اس کی میز پر رکھا۔ پریشے نے سر اٹھا... حیرت سے اسے دیکھا۔

"اتنی جلدی؟ ابھی تو کہا تھا۔"

"یہ دراصل یونیسف کے جو ڈاکٹرز تھے، وہ لائے ہیں۔ ساتھ میں ہائی انرجی بسکٹ بھی..."

"اچھا اور اس اسکول کا پورا ملبہ ہٹا؟"

"تقریباً۔ برٹش ٹیم آئی ہوئی ہے۔"

"ہوں۔" وہ سر جھٹک کر کام میں مصروف ہو گئی۔ برٹش، یونیسف، جانے کتنے غیر... آئے ہوئے تھے۔

ایک دم اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ "کیپٹن بشیر!" وہ جانے لگا تھا اس کی آواز پر جانے... پلٹا۔

...ڈم؟"

...بہت سے غیر ملکی آئے ہوئے ہیں۔ ترکی سے کوئی نہیں آیا؟" اس نے بظاہر سرسری

...یا۔

...تھا۔"

...ت ایک پل کو ساکن ہو گئی۔

...ن؟" وہ سانس روکے اس کے جواب کی منتظر تھی۔

...ب طیب اردگان آیا تھا، شوکت عزیز کے ساتھ کل پورے علاقے کا دورہ کیا۔"

...کے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔ "اچھا۔" وہ پھر سے بچی کے زخم پر جھک گئی۔

...ن بشیر نے باہر جانے کے لیے خیمے کا پردہ اٹھایا، تب پریشے نے پھر اسے پکارا، "سنو

...ڑا ہاتھ میں لیے، رک کر اس کی بات سننے لگا۔

...کی سے کوئی آئے تو مجھے بتانا۔" جانے کس امید پر اس نے کہہ ڈالا۔

...ی نے آنا ہے کیا؟"

...ں، آنا تو نہیں ہے۔ آنا تو کسی نے نہیں ہے۔" وہ اداسی سے سر جھٹک کر بچی کی پٹی

...یا۔

...مجھتے ہوئے باہر نکل گیا۔ خیمے کا کپڑا اس کے پیچھے ہلتا رہ گیا۔

☆......☆......☆

...22 اکتوبر 2005ء

...ہسپتال سے کچھ دور وہ ایک پتھر پر خاموشی سے بیٹھی خنک ہوا کی سرسراہٹ سن رہی تھی۔
...نیلا اور آل پہن رکھا تھا، بال کیچر میں مقید تھے، پاؤں میں سفید اور ہلکے گلابی جوگرز تھے
...جو اب پھیکے پڑ گئے تھے۔ اس کی زندگی کی طرح۔
...ش سے کچھ دیر پہلے کا موسم تھا اور وہ ہمیشہ کی طرح اس موسم میں اداس ہو گئی تھی۔ آج
...تھے وقفے سے آفٹر شاکس (درمیانے درجے کے زلزلے) آتے رہے تھے۔ سامنے
...تو ایک جھٹکے کے دوران حقیقتاً دو ٹکڑوں میں ٹوٹنے کو تھا۔ آج اس کی چوٹی پر برف بھی
...اس ڈھلتی شام میں وہاں تنہا بیٹھی گنگنا رہی تھی۔

''ہم لیلیٰ ہیں، ہم مجنوں ہیں۔''

یہ گیت افق بیس کیمپ میں ہنزو کٹر پورٹرز کو سناتا تھا اور اوپر جب وہ برفانی غار میں تو
تب بھی تھک کر وہ یہی گنگناتا تھا۔

وہ اسے بھولا ہی کب تھا۔ وہ تو ہر لمحہ، ہر پل اس کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ کہیں برف دیکھتی تو
برفانی غار میں چت لیٹا افق یاد آ جاتا، وہ بارش دیکھتی تو اسے وائٹ پیلس کی سیڑھیوں پر
موروں کو یہی لیلیٰ مجنوں والا ترک گیت سناتا افق یاد آ جاتا۔ وہ خواب میں آ کر اسے کہتا۔

''پری! کیوں پریشان ہوتی ہو؟ مجھے درد نہیں ہو رہا۔'' اور وہ جانتی تھی اسے درد ہو رہا ہے۔
کبھی وہ کہتا، ''میرے ساتھ چلو۔ میں تمہیں ترکی لے جاؤں گا۔'' اور وہ نیند میں
رونے لگتی۔

اس نے اپنے ہاتھ پر اس جگہ دیکھا، جہاں تین ماہ قبل ماہوڈھنڈ کے کنارے افق
سانیتا بانت لگایا تھا۔ اب وہ معمولی خراش وہاں نہیں تھی، مگر درد، اندر ہی اندر ''درد'' بہت ہوتا تھا
جب یہ درد شدت اختیار کر لیتا تو وہ رو دیا کرتی تھی۔ ''افق ......! واپس لوٹ آؤ...... میرا زخم
گیا ہے...... مجھے سانیتا بانت لگا دو...... اسی بہانے ہی لوٹ آؤ۔''

وہ اب بھی اس کے ساتھ تھا، اس کے کہیں بہت اندر موجود تھا۔ اس کے ساتھ سانس لیتا
اس کے ساتھ ہنستا تھا، اس کے ساتھ روتا تھا۔

اس کے خیالات میں مخل ہونے والی آواز بھاری بوٹوں کی دھمک تھی، جو اسے اپنی پشت
سنائی دی تھی۔

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ یہ وہی اس روز والا آرمی آفیسر تھا جو اسے گھور رہا تھا۔ کھلتی رنگت
نقوش، کافی ہینڈسم سا میجر کے رینک کا آفیسر تھا۔

''آپ ڈاکٹر پریشے جہاں زیب ہیں؟''

وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ ''یہ بات آپ اس روز کیپٹن بشیر سے معلوم کر چکے ہیں۔'' وہ رکھائی سے بولی

''معلوم نہیں، کنفرم کیا تھا۔ آپ نے مجھے پہچانا، میں میجر عاصم رؤف ہوں۔ میں نے
ارسلان کو راکاپوشی سے ریسکیو کیا تھا۔''

''اوہ!'' اس کے ماتھے پر بل غائب ہو گئے۔ ''اچھا۔'' پھر وہی یادیں۔ خدایا یہ ذہنی مریضہ
کیوں نہیں چھوڑتا؟ ''اصل میں میجر صاحب! میں نے آپ کو سرسری سا ایک دو دفعہ ہی دیکھا

لیے پہچان نہیں پائی۔'' وہ مروتاً کہنے لگی۔

''اٹس او کے میم! مجھے آپ سے ملنا تھا۔ آپ سی ایم ایچ میں بے ہوش تھیں اور جس دن ہوش
میں آئیں، مجھے اسی صبح سی او نے فارورڈ ایریاز میں بھیج دیا۔ میں ان فیکٹ تین دن وہاں موسم خراب
ہونے کی وجہ سے اپنے ہیلی کاپٹر کے ساتھ پھنس کر رہ گیا، جب واپس آیا تو آپ جا چکی تھیں۔''

''میں چلتی ہوں، مجھے کچھ مریض دیکھنے ہیں۔ تھینکس اینی ویز۔'' اسے اس کی تفصیلات سے
کوئی دلچسپی نہ تھی۔ سو رسمی مسکراہٹ کے ساتھ کہتی پلٹ کر جانے لگی۔

''میم! میرے پاس آپ کی ایک امانت تھی۔ افق ارسلان نے یہ آپ کے لیے دیا تھا کہ آپ
کو ہوش آئے تو دے دوں۔''

وہ بے حد تیزی سے میجر عاصم کی جانب گھومی تھی۔

''کیا...... کیا دیا تھا افق نے؟'' اس کے دل کی دھڑکن بے ترتیب ہونے لگی۔

''اس روز آپ کو دیکھا تو یہ میرے پاس نہیں تھا، ورنہ دے دیتا۔ کل اسلام آباد گیا تو لے
آیا۔'' اس نے والٹ سے ایک چھوٹا سا خط کا لفافہ نکال کر پریشے کی جانب بڑھایا جسے اس نے
تیزی سے پکڑا۔

لفافے کے کونے میں سبز رنگ کا آرمی کا کوئی نشان بنا تھا اور اوپر گلگت کنٹونمنٹ کا ایڈریس
لکھا تھا جیسے وہ جی ایچ کیو سے آیا ہو۔

''یہ لفافہ اس نے مجھ سے لیا تھا۔'' اس کے لفافہ الٹ پلٹ کر دیکھنے پر میجر عاصم نے
وضاحت کی۔

پریشے نے کپکپاتے ہاتھوں سے وہ چھوٹی سی ٹیپ اتاری۔ میجر عاصم اتنا مہذب تھا کہ پریشے
کو یقین تھا، افق کے ٹیپ لگانے کے بعد وہی پہلی دفعہ اسے کھول رہی ہے۔

لفافے کے اندر ٹشو میں لپٹی تصویر تھی۔

دور تک پھیلا سبزہ، دائیں طرف جھیل، بائیں جانب گھوڑا، گھوڑے کے ساتھ پریشے اور
پریشے کے اس طرف افق۔ وہ ہنستے ہوئے منہ پر ہاتھ رکھے ہوئے تھی۔ سیاہ گھڑی کے ڈائل کا
فریم چمک رہا تھا۔ تصویر کے نیچے لکھا تھا، ''گھوڑا، پریشے کے دائیں طرف ہے۔''

اس نے تصویر کو پلٹا پیچھے سفید کاغذ چپکا کر ہاتھ سے سبز روشنائی سے انگریزی میں لکھا تھا،
زندگی کے سفر میں بچھڑنے سے پہلے

ملن کے آخری شام کے ڈھلنے سے پہلے
اور ایک دوسرے کی سانسوں اور
دھڑکنوں کی آخری آواز سننے سے پہلے
کہ جس کے بعد تم میری دنیا سے دور چلے جاؤ گے
تمہیں مجھ سے
ایک وعدہ کرنا ہوگا
کہ جب بھی سورج طلوع ہوگا
اور سوات کی وادیوں میں روشنی، بارش کے قطروں کی طرح گرے گی
اور قراقرم کے جامنی پہاڑوں پر جمی برف پگھلے گی
اور پھر جب اس برف میں دبی داستان، نگر کے درمیان میں بہہ جائے گی
تب تمہیں مجھ سے ایک وعدہ نبھانا ہوگا
کہ اس رات کے بعد اپنی زندگی میں آنے والی
ہر صبح کی ٹھنڈی ہوا
اور ہر بارش کے بعد گیلی مٹی
اور جامنی پہاڑوں پر دودھ کی سی جمی برف کو دیکھ کر
تم مجھے یاد کرنا
کہ یہ میرا تم پر
اور تمہارا مجھ پر
قرض ہے

اس کی آنکھوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر گرنے لگے تھے۔

اسے یاد تھا، برف کی دیوار سے ٹیک لگائے اس کی جانب گردن پھیرے بیٹھا افق۔

”تمہیں بھی مجھ سے ایک وعدہ کرنا ہوگا۔“ اور پھر اس نے گہرے کرب سے آنکھیں موند لی تھیں۔ وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ اس میں بولنے کی وعدہ لینے کی سکت بھی نہیں تھی۔

”آر یو او کے، ڈاکٹر پریشے؟“ اس کو پرائیویسی دینے کے لیے میجر عاصم جو نامحسوس انداز میں چند قدم دور ہٹ چکا تھا، اسے روتے دیکھ کر تشویش سے بولا۔

”کب دی اس نے یہ آپ کو؟“ ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کر کے وہ زبردستی مسکرائی۔

”جب وہ آپ سے ملنے ہسپتال آیا تھا۔ آپ بے ہوش تھیں۔ وہ آپ کے کمرے سے باہر نکلا ور مجھ سے لفافہ، ٹشو، پین اور صاف کاغذ مانگا۔

پھر اس نے پاکٹ سے ایک پکچر نکالی، اس کی پشت پر کاغذ لگا کر کچھ لکھا، ٹشو میں لپیٹا، پین مجھے دیا اور لفافے میں بند کر کے قریب رکھی کسی دوائی کی ڈبیا پر لگی ٹیپ اتار کر لگائی۔ اس نے یہ مجھے آپ کو خود دینے کی تاکید کی تھی، ورنہ جب میں کام سے اسکردو گیا تھا تو بلال یا خالد کو دے کر جا سکتا تھا۔ اس لیے میں نے بعد میں یہ آپ کو کوریئر بھی نہیں کیا، حالاں کہ آپ کا ایڈریس اور نمبر میرے پاس تھا۔ آپ کو کال بھی کی، ایس ایم ایس بھی کیا، مگر کسی غلط فہمی کی بنا پر آپ نے میری بات نہیں سنی پھر میرا پنڈی آنا ہی نہیں ہوا۔ کام میں بہت مصروف تھا۔ اب اتفاق سے آپ مل گئیں تو میں یہ لے آیا۔ بہت معذرت دیر کرنے پر۔“

”مجھے آپ کی کال ریسیو کرنا قطعاً یاد نہیں، مگر تھینک یو سو مچ میجر عاصم!“

”مائی پلیژر میم!“ وہ خوش دلی سے مسکرایا۔ اس نے ایک مرتبہ بھی نہیں پوچھا کہ وہ کیوں رو رہی تھی۔ کوئی تجسس، کوئی سوال نہیں وہی ٹپیکل مگر بہت ڈیسنٹ آرمی مین!

”اور، وائف اور بچے ٹھیک ہیں آپ کے؟“ پریشے نے یونہی اخلاقاً پوچھ لیا۔

”جی، مہوش بالکل ٹھیک ہے۔ بچے بھی پنڈی میں ہوتے ہیں۔“ وہ شائستگی سے مسکرایا۔ پھر چند ایک باتیں کہہ کر وہاں سے چلا گیا۔

اور وہ وہاں کھڑی سوچنے لگی کہ کیا افق کو واقعی ”یاد آنے کا وعدہ“ کرنے کی ضرورت تھی؟ کیا وہ اسے بھول سکتی تھی؟

☆......☆......☆

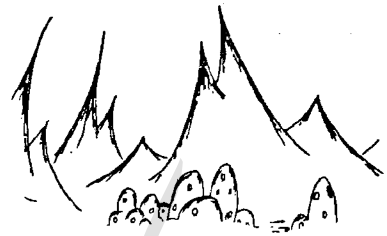

چودھویں چوٹی

اتوار، 23 اکتوبر 2005ء

زلزلے کے متاثرین میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ٹیٹنس کی وبا پھوٹ رہی تھی۔ اس وقت بھی وہ اور فرح اپنے خیمے میں بیٹھی متاثرہ افراد کو انجکشن لگا رہی تھیں۔

''فرح! میں ابھی اسلام آباد واپس جا رہی ہوں۔ تم چلو گی یا ادھر مزید رہو گی؟''

''تم جا رہی ہو تو میں بھی چلتی ہوں۔ ویسے تم بائی ائیر جا رہی ہو؟''

''ہاں، ابھی بشیر آ کر بتائے گا کہ...... ہیلی کاپٹر فارغ ہے یا نہیں۔'' اسی اثنا میں کیپٹن اندر آیا۔

''میڈم! ہیلی بس آنے ہی والا ہے۔ کرنل طارق اس میں کچھ لوگوں کو لے کر آ رہے ہیں آتے ہی ہوں گے۔''

''اچھا۔'' وہ جھک کر بچے کو ٹیکا لگا رہی تھی، پھر بے حد فکرمندی سے ساتھ بیٹھی اس کی ماں سے بچے کے بارے میں سوالات کرنے لگی، کیوں کہ اسے تیز بخار تھا۔

کیپٹن بشیر نے ایک لمحے کو سوچا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو بتائے کہ جو لوگ کرنل طارق کے ہیلی میں مظفر آباد آ رہے تھے، وہ ترکی سے آئے تھے، کیوں کہ ڈاکٹر صاحب نے اس سے ترکی سے آنے والوں کے متعلق پوچھا تھا، مگر ایک تو وہ اتنی مصروف تھی، دوسرا اس نے خود ہی کہہ دیا تھا کہ ترکی سے تو کسی نے نہیں ہے اور پھر، ڈاکٹر صاحب کو اگر ترکی سے آنے والوں میں کوئی دلچسپی ہو گی تو وہ بینا ترک ڈاکٹرز سے ہو گی۔ کیپٹن بشیر کچھ کہے بغیر وہاں سے چلا گیا، کیوں کہ آنے والے ڈاکٹرز نہیں، انجینئرز تھے۔

آدھے گھنٹے بعد یہ کیپٹن بشیر ہی تھا، جس نے دونوں کو کرنل طارق کے پہنچنے کی اطلاع دی۔

''آپ سامان وغیرہ پیک کر کے جلدی آ جائیں، کیوں کہ کرنل صاحب نے فوراً واپس جانا ہے۔ پلیز میڈم دیر مت کیجیے گا، کیوں کہ کرنل صاحب کا غصہ پوری یونٹ میں مشہور ہے۔''

''ہاں میں ذرا اپنا سامان اس خیمے سے لے لوں، جہاں رات ہم سوئے تھے۔'' وہ اس خیمے سے نکل آئی۔ اس کا رخ چند گز کے فاصلے پر موجود اس میدان کے سب سے آخری سبز خیمے کی جانب تھا، جس میں وہ اور فرح اتنے دن سے رہ رہی تھیں۔

وہاں کھلا سا میدان تھا، ایک طرف خیمہ بستی تھی، دوسری جانب خالی قطعہ اراضی پر ہیلی کاپٹر نیچے اتر رہا تھا۔ اس کے پنکھے ابھی گھاس سے چند فٹ دور تھے۔

وہ اس آخری خیمے میں چلی آئی۔ جلدی جلدی سامان سمیٹا، بالوں کو ایک دفعہ پھر اوپر کر کے کیچر میں باندھا۔ کسی چیز کے چٹخنے کی آواز بھی سنائی دی مگر وہ دھیان دیئے بغیر شال لپیٹے بیگ کندھے پر ڈالے باہر آ گئی۔

فرح اس کے انتظار میں کھڑی تھی۔

''چلو۔''

وہ دونوں ساتھ ساتھ ہیلی کاپٹر کی جانب بڑھنے لگیں۔ وہاں ارد گرد ڈھیروں لوگ، جن میں اکثریت فوجی جوانوں کی تھی، ادھر ادھر گھوم رہے تھے۔

چند فوجی جوان ان مریضوں کو ہیلی کاپٹر میں چڑھا رہے تھے جن کو انہیں سرجری اور طبی امداد

کے لیے اسلام آباد لے جانا تھا۔ بشیر نے قریب سے گزرتے ایک جوان کو روک کر ہدایت دی۔

''Toki کی ٹیم کو اس آخری خیمے میں لے جاؤ ابھی وہی خالی ہے۔''

وہ دونوں سر نیچے کیے، تیز ہوا سے بچتی آگے پیچھے اندر داخل ہوئیں۔ مریض پہنچ چکے تھے۔ دروازہ بند ہوگیا۔ پریشے نے ہیڈ فون چڑھانے سے قبل شال اتار کر بالوں کو دوبارہ سنوارنا چاہا۔ پھر یہ کیا؟ اس کے کیچر کے ایک طرف لگا دو رنگا پتھر غائب تھا۔

''اب کہاں ڈھونڈوں اسے؟ کبھی سستی میں ایلفی سے بھی نہیں جوڑا۔'' وہ کپڑے جھاڑنے لگی۔ اندر روشنی خاصی کم تھی، اسے پتھر کہیں بھی نظر نہیں آیا۔

''فرح! اس کا پتھر گر گیا ہے۔ وہ کونے والے خیمے میں گرا ہوگا۔ میں لے آؤں؟''

''بے وقوف! ہیلی اڑنے لگا ہے۔ کرنل طارق کے غصے کے قصے نہیں سنے؟ خواہ مخواہ ان کو غصہ مت دلاؤ۔''

''مگر فرح وہ قیمتی پتھر تھا اور......''

''لوگوں کا گھر بار لٹ گیا اور تمہیں پتھر کی پڑی ہے؟ ایک پتھر کے لیے۔ کرنل صاحب سے دوبارہ ہیلی اترواؤ گی؟'' فرح بالکل نشاء کی گھرکتی تھی۔ وہ خاموشی سے پیچھے ہو کر بیٹھ گئی، مگر جانے کیوں اس لمحے اس کا دل چاہا کہ وہ کرنل طارق سے ہیلی اتارنے کی درخواست کرے، صرف ایک منٹ کے لیے۔ بس وہ اپنا پتھر لے آئے۔

صرف پتھر نہیں، اس لمحے اسے مظفر آباد کے شہر خموشاں کی اداس اور سوگوار فضا میں ''کچھ اور'' محسوس ہوا تھا، کچھ ایسا جو ان پچھلے بہت سارے دنوں میں جو اس نے وہاں گزارے تھے، نہیں تھا۔ وہ اس وقت ہیلی کاپٹر سے نیچے اترنا چاہتی تھی، وہ مظفر آباد چھوڑنا نہیں چاہتی تھی، مگر محض مروت میں وہ خاموش سے بیٹھی رہی۔

پریشے اور فرح کو ہیلی کاپٹر میں بٹھا کر کیپٹن بشیر تیز قدموں سے واپس آیا، جس جوان کو اس نے Toki ٹو کی ٹیم کو خیمے میں بٹھانے کو کہا تھا، وہ ان تین افراد کے ہمراہ اس آخری خیمے کے قریب ہی کھڑا تھا۔ تینوں افراد کی بشیر کی جانب پیٹھ تھی۔

وہ ان کے قریب آیا۔

''السلام علیکم سر!''

تینوں ایک ساتھ پلٹے۔

پہلا ترک انجینئر اچھی قد و قامت کا مالک تھا۔ بال سیاہ، گوری رنگت، یورپی نقوش۔ بشیر نے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا، ''آئی ایم کیپٹن بشیر۔'' اس کی انگریزی پورے گاؤں میں بہترین تھی۔

''کینن جینک۔'' ترک انجینئر نے گرم جوشی سے ہاتھ تھاما۔ کیپٹن بشیر دوسرے کی جانب بڑھا۔ وہ قد میں باقی دونوں سے چار پانچ انچ چھوٹا تھا۔ بال گھنگھرالے اور سنہری مائل بھورے تھے۔ سر پر الٹی پی کیپ تھی جس پر سفید مارکر سے کچھ لکھا تھا۔

''جینیک یقین۔'' اس نے خوش دلی سے بشیر سے ہاتھ ملایا۔

''خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔'' اب اس نے تیسرے کی جانب دیکھا۔

تیسرا انجینئر ان دونوں سے ایک قدم پیچھے کھڑا تھا، ایسے کہ اس کا چہرہ اندھیرے میں تھا۔ اس کے سر پر سیدھی کیپ تھی اور دونوں ہاتھ جیبوں میں ڈال رکھے تھے۔

کیپٹن بشیر کے ہاتھ بڑھانے پر وہ دایاں ہاتھ جیب سے نکال کر اس کا ہاتھ تھامتے ہوئے دو قدم آگے بڑھا، اس کا چہرہ روشنی میں آیا، جس پر بلا کی سنجیدگی تھی۔

''افق حسین ارسلان۔'' اس نے اپنا تعارف کرایا۔ اس میں کوئی بات ایسی ضرور تھی جس سے کیپٹن بشیر متاثر ہوا تھا۔ شاید وہ بہت ہینڈسم تھا، یا شاید اس کی شخصیت میں عجیب سی مقناطیسیت تھی، جو مقابل کو مسمرائز کر دیا کرتی تھی۔

''آپ کو انجینئرنگ کور والوں سے بس تھوڑی دیر میں ملواتا ہوں۔ تب تک آپ اندر آرام کریں۔'' وہ عجلت میں کہہ کر پلٹ گیا۔

جینیک آگے بڑھا اور خیمے کا پردہ ہٹا کر اندر قدم رکھا۔ کینن نے اس کی تقلید کی۔ افق سب سے آخر میں جھک کر خیمے میں داخل ہوا۔

تینوں ایک ساتھ نیچے زمین پر بیٹھنے ہی لگے تھے جب افق بیٹھتے بیٹھتے رک گیا۔ اس کی نگاہ زمین پر گرے دو رنگے پتھر پہ پڑی۔ اس نے جھک کر پتھر اٹھایا اور انگلیوں کے درمیان پکڑے ناخنوں کے قریب لا کر روشنی میں بغور دیکھا۔

اس پتھر کا سائز اس کے انگوٹھے کے ناخن سے دگنا تھا، اس کے عین وسط میں لکیر پڑی تھی۔ وہ کچھ دیر اسے انگلیوں کے پوروں میں پکڑے دیکھتا رہا، پھر کچھ سوچتے ہوئے جیب میں ڈال لیا اور باہر نکل آیا۔

اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے جیسے وہ کسی کو تلاش کر رہا تھا۔

"کچھ چاہیے تھا مسٹر ارسلان؟" کیپٹن بشیر کسی سے بات کر رہا تھا، اسے باہر آتا دیکھ کر اس کے قریب آیا۔

"نہیں۔" وہ ایک لمحے کو رکا، پھر آخری خیمے کی جانب اشارہ کیا۔ "یہ خیمہ فوج کا ہے یا امداد میں آیا تھا۔"

"میرا خیال ہے سر! امداد میں آیا تھا۔"

"اچھا ویسے زیادہ مسئلہ تو نہیں ہے، مگر پھر بھی، مجھے یوں لگا کہ اس کی شیٹ سردی روکنے کے لیے ناکافی ہے۔"

"نہیں سر! یہ تمام خیمے خاصے گرم ہیں۔ آرمی کینوس کے بنے ہیں اور ان میں پیراشوٹ لائنرز ہیں۔"

"مجھے نازک مزاج مت سمجھنا کیپٹن، مگر پہلے رہنے والوں کو شکایت تو نہیں ہوئی؟" انداز سرسری سا تھا۔

"نہیں، بلکہ جنہیں ٹھہرایا تھا، انہوں نے تو ذکر بھی نہیں کیا۔"

"ہو سکتا ہے جنہیں آپ نے ٹھہرایا ہو ان کا تعلق انٹارکٹیکا سے ہو، ان کو تو ظاہر ہے یہ گرم ہی لگے گا۔" وہ ہولے سے ہنسا۔ وہ انگریزی تیز تیز بولتا تھا اور بعض الفاظ سمجھنے میں بشیر کو دقت ہو رہی تھی۔

"نہیں سر! وہ دونوں تو اسلام آباد کی ڈاکٹرز تھیں۔ پمز ہسپتال سے آئی تھیں۔ انہوں نے کوئی شکایت نہیں کی۔" کیپٹن نے ذہن پر زور دے کر نفی میں سر ہلایا۔

"پمز ہسپتال۔" وہ بڑبڑایا، پھر جیب سے پتھر نکالا۔

"یہ کس کا ہے؟ مجھے خیمے کے فرش پر سے ملا ہے۔"

"یہ تو ڈاکٹر صاحبہ کے کلپ پر لگا تھا شاید۔ میں غور نہ کرتا مگر یہ ڈھیلا تھا اور گرنے کو تھا۔ میں نے ڈاکٹر صاحبہ کو کہا بھی تھا کہ یہ قیمتی ہے، دھیان رکھیں مگر یہ پھر بھی گر گیا۔"

"وہ ڈاکٹر صاحبہ کہاں ہیں؟" اس نے بظاہر عام سے انداز میں پوچھا۔

"وہ تو ابھی، بالکل ابھی ہیلی پر اسلام آباد چلی گئیں ہیں۔"

ترک انجینئر کے چہرے پر پھیلتی واضح مایوسی پر بشیر کو حیرت ہوئی تھی۔

"سر! آپ یہ مجھے دے دیں، میں اسلام آباد گیا تو ان کو دے دوں گا۔"

"تم اسلام آباد کب جاؤ گے؟" اس نے الٹا سوال کیا۔

"آج 23 ہے، میں دو دن چھوڑ کر 26 کو جاؤں گا۔"

"پھر مجھے بھی ساتھ لے چلنا۔ یہ میں تمہاری ڈاکٹر صاحبہ کو خود ہی لوٹا دوں گا۔ یہ قیمتی پتھر میرے پاس امانت رہے گا۔" اس نے پتھر واپس جیب میں ڈال لیا۔ چہرے پر ہنوز سنجیدگی …

"جیسی...... جیسی آپ کی مرضی۔" کیپٹن بشیر نے الجھن بھرے انداز میں کہا۔ ترک پلٹ کر واپس خیمے کی جانب چلا گیا۔ وہ اسی طرح حیرت اور اچنبھے سے اسے دور جاتے دیکھتا …

"عجیب بندہ ہے۔ ابھی اسلام آباد سے ہی آیا ہے اور ابھی جانے کی بات کر رہا ہے۔ میجر صاحب تو کہہ رہے تھے کہ یہ ترکی کی سب سے بڑی انجینئرنگ فرم سے آنے والے ترکی … انجینئرز ہیں، مگر یہ تو...... خیر سانوں کی!" وہ شانے اچکا کر دوسری جانب کو ہولیا۔ ابھی انجینئرنگ کور کے دوسرے انجینئروں سے ان ترکوں کو ملوانا تھا۔

میجر ڈاکٹر نعمان کے خیمے کے قریب رک کر اس نے اطلاع دی۔ "سر! کرنل صاحب کہہ رہے ہیں ترک انجینئرز سے مل لیں۔" پھر وہ ایک ڈاکٹر کو انجینئروں سے ملوانے کی منطق پر حیران … وہاں سے چل دیا۔

ان تین انجینئروں نے اگلے دو دنوں میں اتنی لگن، محنت اور جاں فشانی سے کام کیا کہ آرمی … حیران تھے۔ وہ ان کے ملک کے نہیں تھے، ان کا کوئی دور پار کا عزیز بھی کشمیر میں نہیں رہتا … کوئی امکان تھا، وہ ایک اور خطے سے تعلق رکھتے تھے، اس سب کے باوجود وہ اپنا آپ … کام میں لگے تھے۔ باقی دونوں تو پھر سوئے بھی تھے، مگر افق حسین ارسلان نے بغیر رکے کئی … کیا تھا۔ وہ شخص بھی عجیب تھا، کم از کم کیپٹن بشیر کو لگا تھا۔

اس کی شخصیت میں مشرقی و مغربی وجاہت کا ملاپ تھا۔ مرد ہونے کے باوجود کیپٹن بشیر کو … تھا کہ اس نے افق ارسلان جیسی خوب صورت آنکھیں آج تک کہیں نہیں دیکھی تھیں۔

… حزن و ملال لیے، اداس، شہد رنگ آنکھیں۔

… بہت سے مرد خاصے وجیہہ تھے، مگر یہ اس شخص کی اداس شہد رنگ آنکھیں تھیں، جو ادھر

موجود ہر لڑکی کو رک کر اسے دیکھنے پر مجبور کرتی تھیں، لیکن پتا نہیں وہ آدمی کس مٹی سے بنا تھا۔ کیپٹن بشیر نے کسی عورت سے بات کرنا تو درکنار، سر اٹھا کر کسی کو دیکھتے بھی نہیں پایا تھا۔ وہ بہت کم بولتا تھا۔ اس کے دونوں ساتھی خصوصاً جینیک یقین بے حد زندہ دل اور شوخ تھا۔ ماحول سوگوار تھا، مگر پھر بھی فضا میں چھائے حزن کو کم کرتی جینیک کی باتیں اچھی لگتی تھیں۔ کیپٹن کو حیرت تھی کہ دو بہت بولنے والوں سے اس خاموش طبع انسان کی دوستی کیسے ہوگئی۔ شروع رات کے علاوہ پھر ان دو دنوں میں بشیر سے صرف دو دفعہ بات کی۔ ایک تب جب وہ کچھ دینے آیا تھا۔

''ہمارے ہاں ایک قدیم رواج ہے۔ ترکی میں ہر پیدا ہونے والی بچی کو اس کے ماں باپ چاہے کتنے غریب ہوں، سونے کا کوئی زیور تحفے میں دیتے ہیں۔ یہ زیور ایک ترک لڑکی کی جان سے قیمتی متاع ہوتی ہے۔ ترک لڑکی مر سکتی ہے مگر اپنا وہ زیور کسی کو نہیں دیتی۔ چاہے جتنی غربت ہو، ترکی میں کبھی یہ والا زیور فروخت نہیں کیا جاتا۔'' وہ چند لمحوں کے وقفے سے کہنے لگا، ''8 اکتوبر کو جب پاکستان میں زلزلہ آیا تو انقرہ کے پبلک سکول میں ٹیچرز نے فنڈز اکٹھے کرنے شروع کیے۔ اپنے مسلمان برادر ملک پاکستان کے لیے ایک سات سالہ بچی عروہ یلیم کے پاس فنڈ میں دینے کو لاکھوں کروڑوں ڈالرز نہیں تھے۔ اس کا باپ اتنا غریب تھا کہ اسے تو پاکٹ منی بھی نہیں ملتی تھی۔ سو اس بچی نے وہ کیا، جس نے وہاں سکول میں موجود تمام افراد کو رلا دیا۔'' افق نے جیب سے چھوٹی چھوٹی سونے کی چوڑیاں نکال کر بشیر کے سامنے کیں۔ ''عروہ کے پاس دینے کو کچھ نہیں تھا، سو اس نے اپنی سب سے عزیز چیز اپنی پیدائش کا تحفہ یہ چوڑیاں اپنے مسلم بھائیوں کے لیے دے دیں۔ ایک ترک ہونے کے ناتے مجھے عروہ پر فخر ہے۔ ایک پاکستانی ہونے کے ناتے آپ کو بھی اس پر فخر کرنا چاہیے۔''

وہ چوڑیاں بشیر نے متعلقہ افراد تک پہنچادیں۔

☆......☆......☆

منگل، 25 اکتوبر 2005ء

وہ اس روز ماموں کے ایک دوست کی اہلیہ کی عیادت کے لیے اسی ایم ایچ آئی تھی۔

صبح کا وقت تھا۔ آسمان، سمندر کے پانی کی طرح نیلا اور صاف تھا ماسوائے دور افق پر تیرتے سیاہ بادلوں کے جھنڈ کے، جو ابھی اسلام آباد سے خاصے دور تھے۔

گاڑی کھڑی کر کے اس نے مین گیٹ عبور کیا سی ایم ایچ کی بلڈنگ کی جانب جانے والی ڈھلوانی سڑک اترنے لگی۔ ڈھلان کی اترائی کے آغاز میں سڑک کے دونوں اطراف میں دو بڑے سرسبز درخت تھے۔ وہ ان کے قریب سے گزرنے ہی لگی تھی کہ نیچے سے آتے میجر نعمان پر نگاہ پڑی۔ وہ عجلت میں اپنے بھاری بوٹوں کی دھمک پیدا کرتا سڑک پر اوپر چڑھ ہی رہا تھا کہ اسے وہاں دیکھ کر ٹھٹکا اور پھر شناسائی سے مسکرا کر تیزی سے اس کی جانب بلند ہوتے قدموں سے اوپر چڑھنے لگا۔

اس نے وہیں دونوں درختوں کے درمیان سڑک پر قدم روک لیے اور جوابی مسکراہٹ کے ساتھ میجر نعمان کو دیکھا۔

ان دونوں نے کئی دن کیمپ میں ساتھ کام کیا تھا، یوں سی ایم ایچ میں ملنا کوئی اتفاق نہ تھا کہ وہ پنڈی پوسٹڈ تھا اور سی ایم ایچ آنے پر پریشے کا اس سے ٹکراؤ ہونا لازم تھا۔

''کیسے مزاج ہیں ڈاکٹر صاحبہ؟ خیریت سے سی ایم ایچ آئی ہیں؟'' وہ چند قدموں کی بلندی طے کر کے اس تک آ گیا تھا۔

''خیریت سے ہسپتال کون آتا ہے، میجر صاحب؟ بریگیڈیئر باجوہ کی مسز کی عیادت کے لیے آئی ہوں، ان کا آپریشن ہوا تھا۔ آپ کب آئے مظفر آباد سے؟''

ٹھنڈی ہوا ایک لمحے کو زور سے چلی۔ دونوں درختوں کے سبز پتوں کے درمیان سے سوکھے پتے نیچے آن گرے۔

''صبح صبح پہنچا تھا اور اب آپ کے سامنے ہوں۔'' یونیفارم اور سرخ ٹوپی میں ملبوس اس کے چہرے پر تھکاوٹ اور سفر کا کوئی شائبہ تک نہ تھا۔

''کیسی گزر رہی ہے مظفر آباد میں؟''

دائیں جانب والے درخت تلے گھاس پہ گرے خشک پتوں کے قریب ایک چڑیا پھدک رہی تھی۔

''بس میڈم! کام ہو رہا ہے۔ کوشش تو سب کر رہے ہیں، آگے جو اللہ کو منظور اور آپ ٹھیک ہیں؟''

چڑیا اب ایک سوکھے، بھورے پتے کو چونچ مارنے لگی تھی۔

''آئی ایم فائن، تھینکس اور کیپٹن بشیر وغیرہ سب ٹھیک ہیں؟'' ٹھنڈی ہوا ایک دفعہ پھر زور سے

چلی۔ گھاس پر گرے زرد پتے اڑ کر ادھر ادھر بکھرتے ہوئے سڑک تک آ گئے۔

''الحمدللہ سب ٹھیک ہیں۔ کیمپ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ کچھ فارنرز بھی آئے ہوئے ہیں تو پہلے بھی تھے، مگر پرسوں جن لوگوں سے مل کر آ رہا ہوں ان کے سوشل ورک کے جذبے نے حیران کر دیا ہے۔ خیر کام تو ہو رہا ہے، آگے دیکھیں۔'' (شاید وہ بولنے کا خاصا شوقین تھا، والوں کو عموماً اس نے ٹو دی پوائنٹ بات کرتے دیکھا تھا) ''مسز باجوہ کو تو خیر ابھی پیپر کروانے تھے، انہیں دوسرے ڈیپارٹمنٹ تک لے کر گئے ہیں، آپ کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے میں پتا کرتا ہوں، وہ روم میں آ جائیں تو میں آپ کو بتا دوں گا۔''

''ارے میجر نعمان! میں خود دیکھ لوں گی۔ آپ خواہ مخواہ اتنی تکلیف نہ کریں۔'' صرف اس وجہ سے کہ وہ کیمپ میں ساتھ تھی، اتنا خیال کر رہا تھا۔ وہ شرمندہ ہونے لگی۔

''کوئی پرابلم نہیں، میں دیکھ آتا ہوں۔ آپ تب تک ویٹنگ روم میں بیٹھ جائیں۔''

چڑیا اب نعمان کے عقب میں سڑک پر گرے پتوں تک پھدک پھدک کر آ گئی اور ایک پر چونچ مارنے لگی۔

''نہیں، میں ادھر ہی ٹھیک ہوں۔ آج موسم بہت اچھا ہے۔'' اس نے سر اٹھا کر اوپر جہاں نیلی چادر میں عین اس کے سر کے اوپر روئی کے گال کی طرح کا چھوٹا سا بادل تیر رہا اداسی سے مسکرائی، ''اور میں تو ویسے بھی خوب صورت موسموں کی دیوانی ہوں۔ میں یہاں نہیں ہوں گی۔''

''چلیں، پھر میں آپ کو بتاتا ہوں۔'' وہ الٹے قدموں پر مڑ گیا۔ بھوری چڑیا سہم کر اڑ گئی۔ نعمان سڑک کی ڈھلان اترنے لگا۔ چڑیا دائیں طرف والے درخت پر جا بیٹھی۔ وہ دور ہوتا واپس درخت کے نیچے گھاس پر آ گئی۔

پریشے اسے جاتا دیکھتی رہی، پھر بائیں طرف اگے درخت کے قریب آئی اور اس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ بھوری چڑیا اس کے بالکل سامنے والے درخت کے نیچے گھاس پر مار رہی تھی۔

ٹھنڈی ہوا کا زوردار جھونکا آیا۔ دونوں درختوں سے پھر سے زرد پتوں کی بارش ہوئی اس کے اطراف اور کچھ اوپر گر گئے۔

وہ درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیتے لمحوں کو یاد کرنے لگی جب انہی خوب

ں میں وہ ساتھ ساتھ وادیوں، مرغزاروں اور چشموں میں پھرتے تھے، ایسا ہی ایک درخت ں کے تنے سے کبھی وہ ٹیک لگا کر بیٹھتے تھے اور ایسی ہی گھاس تھی جس پر اپنا گھٹنا جھاڑتے ائی کی پینٹ پر سے سرخ رنگ کا کیڑا گراتا تھا۔

بھوری چڑیا اب پھدکتی ہوئی سڑک تک آ گئی اور سرمئی تارکول میں ادھر ادھر چونچ مارتی کچھ کرنے لگی تھی۔

اس نے آنکھیں موند لیں۔ زرد سوکھے چرمر کرتے چند پتے ابھی تک اس کے بالوں، گود اور پے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ اس کے لب دھیرے دھیرے گنگنانے لگے۔ وہ گیت، جو کبھی لا دھار بارش میں بھیگتے ہوئے، ان چوڑی سیڑھیوں پر کھڑے، افق ارسلان پنجرے میں مقید وں کو سنایا کرتا تھا۔

نہ کچھ کہو ہمیں
ہم اس راہ کے مسافر ہیں
ہم عشق میں پاگل ہیں
نہ کچھ کہو ہمیں
ہم لیلیٰ ہیں، ہم مجنوں ہیں

شاید لیلیٰ نے قیس سے اتنی محبت نہیں کی ہوگی، جتنی پری نے اپنے کوہ پیما سے کی تھی پھر بھی آج ہی داماں تھی۔

وہ جانے کتنی دیر Kayahan کا وہ ترک گیت گنگناتی رہی، یکایک کسی احساس کے تحت نہیں کھولیں۔

بھوری چڑیا دوبارہ سہم کر سامنے والے درخت کے عقب میں چھپ گئی تھی، کیوں کہ اب اس سڑک پر میجر نعمان کھڑا مسکرا رہا تھا۔

''آپ نے غلط پروفیشن چوز کیا ڈاکٹر صاحبہ! آپ تو بہت اچھا گنگنا لیتی ہیں، پھر میڈیکل کیوں آ گئیں؟''

''نہیں، یہ تو بس ایسے ہی!'' جھینپ کر کہتی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ زرد پتوں کا ڈھیر اس کی گود سے نیچے گھاس پر گرا۔

''بریگیڈیئر صاحب کی وائف واپس روم میں آ چکی ہیں، آپ ان سے مل لیں۔'' پھر وہ

ایک لمحے کے توقف سے کچھ سوچتے ہوئے پوچھنے لگا، ''ویسے ڈاکٹر صاحب یہ گیت
ہے کیا؟''

''نہیں تو۔'' اس نے ہنس کر سر جھٹکا۔ چند پتے اور ٹوٹ کر نیچے گر گئے۔ ''آپ
اسے کسی کے منہ سے نہیں سنیں گے۔''

''ارے نہیں میڈم! میں نے کل ان فیکٹ یہی گیت افق ارسلان کو گاتے سنا تھا۔''

سرد ہوا کا تیز جھونکا پھر سے آیا، اس کے اوپر سوکھے پتوں کی بارش پھر سے ہوئی اور وہ
اسی طرح ساکت کھڑی میجر نعمان کو دیکھ رہی تھی۔

''کس کو؟'' اس نے بے یقینی سے پوچھا۔ شاید اس کی سماعتوں کو دھوکا ہوا تھا۔

''افق ارسلان کو آپ نہیں جانتیں، وہ ترک انجینئر ہے ناں، اس کی بات کر رہا تھا۔
مسز باجوہ سے مل لیں جا کر۔'' اس نے پھر سے اطلاع دی، مگر وہ مسز باجوہ سمیت دنیا کو
بھول چکی تھی۔

''کک...... کون سا ترک انجینئر؟'' شاید اس نے غلط سنا تھا۔ وہ شاید کوئی اور نام لے رہا

''افق ارسلان نام ہے اس کا۔''

وہ پلک جھپکائے بغیر اسے دیکھ رہی تھی۔ ''وہ آپ کو کہاں ملا؟''

''وہیں مظفر آباد میں۔ وہ ریلیف اینڈ ریسکیو ورک کے لیے ترکی سے آیا ہے۔ کل
رہا تھا، شاید یہ ترک گیت ہے۔'' وہ جس طرح میجر نعمان کو دیکھ رہی تھی، وہ الجھ سا گیا۔

''مگر...... مگر میں نے تو مظفر آباد میں کوئی ترک انجینئر نہیں دیکھا۔'' اس کا وجود تو
زلزلوں کی زد میں تھا، آواز پھنسی پھنسی سی نکلی۔

''وہ اسی روز بلکہ اسی ہیلی پر آیا تھا، کرنل طارق کے ہمراہ، جس پر آپ واپس گئی تھیں
اسی لیے۔'' اب کے میجر نعمان کو واضح بے چینی ہوئی تھی۔

''اسی ہیلی پر؟'' وہ بے خبری کہیں دور کھو گئی تھی۔ اسے یاد تھا اس روز وہ کرنل طارق
آنے والے مسافروں کو دیکھ نہیں سکی تھی۔

''آر یو اوکے، ڈاکٹر جہاں زیب؟''

وہ بے اختیار چونکی۔ میجر نعمان تشویش سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے سر جھٹکا۔

''نہیں وہ...... وہ اس کا پورا نام کیا ہے؟''

میجر نعمان نے ایک گہری سانس بھری۔ ''افق حسین ارسلان۔'' اب وہ کچھ کچھ سمجھ رہا تھا۔ وہ
اسے جانتی تھی اور اب کنفرم کرنا چاہ رہی تھی۔

''یہ حسن حسین ارسلان کی خون پسینے کی کمائی ہے، جسے ہم یوں ہمالیہ میں جھونک رہے ہیں۔''
کے ذہن میں بہت دن پہلے کہا گیا افق کا فقرہ گونجا۔

''افق حسین ارسلان؟'' اس نے زیر لب دہرایا۔

افق ارسلان، ترکی کا سب سے کامن نام تھا، مگر حسین تو شاید صرف اس کے افق کے نام میں
تھا۔ تو کیا میجر نعمان اس کے افق کی بات کر رہا تھا؟

عجب بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

''میجر نعمان...... وہ، وہ کیسا دکھائی دیتا ہے؟'' وہ کھوئے کھوئے لہجے میں پوچھنے لگی۔

''آ......'' میجر نعمان سوچتے ہوئے بتانے لگا، ''خاصا اونچا لمبا سا ہے، مجھ سے بھی دو انچ لمبا
سکس ون یا سکس ٹو...... بال براؤن ہیں اور آنکھیں۔''

''اور آنکھیں؟'' وہ سانس روکے جواب کی منتظر تھی۔

''کوئی لائٹ کلر تھا۔''

''ہنی کلرڈ؟''

''شاید ایسی ہی تھیں۔ سوری میں نے غور نہیں کیا۔ یہ لڑکیوں کا شعبہ ہے۔'' وہ ہنس دیا مگر وہ
کسی اور ہی سوچ میں گم تھی۔

''وہ انجینئر ہے ناں، تو سر پر کیپ تو لیتا ہوگا؟''

میجر نعمان نے اثبات میں گردن کو جنبش دی۔

''اس کی کیپ کی پشت پر کچھ لکھا بھی ہوگا؟'' وہ اپنی تصدیق و تشفی کے لیے کہہ رہی تھی، ورنہ
دل تو چیخ چیخ کر گواہی دے رہا تھا کہ وہ افق ارسلان اس کا کوہ پیا ہی تھا۔

''نہیں...... کچھ نہیں لکھا تھا۔''

''اچھا......؟'' اسے واضح مایوسی ہوئی۔ اسے یاد تھا افق کی کیپ کی پشت پر...... مگر وہ افق کی
کیپ تو نہیں تھی، وہ تو......

''اس کے...... اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہوگا۔ کوئی دوسرا انجینئر؟'' وہ بے تابی سے بولی۔

''جی دو انجینئرز اور بھی تھے۔'' پھر وہ قدرے توقف سے بولا، ''ہاں ان میں سے ایک کے سر

پر جو کیپ تھی، اس پر وائٹ کلر سے طیب اردگان کے حق میں نعرہ درج تھا۔ جینیک یقین ہو
اس کا۔"

اب تو کسی شک وشبے کی گنجائش ہی نہیں رہی تھی۔

"اور تیسرا کون ہے؟ ڈاکٹر ہے؟"

"نہیں، وہ بھی انجینئر ہے۔ کینن۔"

"ان کے ساتھ کوئی ترک ڈاکٹر نہیں ہے؟"

"میں نے تو نہیں دیکھا، شاید یونیسیف کے ساتھ جو ڈاکٹرز تھے، ان میں سے کوئی ترک ہو۔ آپ جانتی ہیں انہیں؟ اینی پرابلم؟" بہت تحمل سے اس کے تمام سوالوں کا جواب دینے کے بعد اپنے فطری تجسس کو چھپا نہ سکا۔

"میرا کچھ کھو گیا تھا ان پہاڑوں میں۔ وہی ڈھونڈنا ہے۔" وہ جیسے خود سے بولی تھی۔

"کیا کھویا تھا؟ آپ کی جیولری وغیرہ کا وہ دو رنگا جیم اسٹون جو وہاں خیمے میں گر گیا تھا؟"

پریشے نے چونک کر اسے دیکھا، پھر اثبات میں سر ہلا دیا۔

"ہاں وہی۔"

"وہ کیپٹن بشیر کے پاس ہے، بلکہ ان فیکٹ انہی انجینئرز کے پاس ہے۔ شاید کل کیپٹن بشیر اس کو ساتھ لے آئے۔"

"پتھر کو؟"

"نہیں، اس انجینئر افق ارسلان کو۔ اس نے امانتاً آپ کا قیمتی پتھر اپنے پاس رکھ لیا تھا۔ شاید بتانا بھول گیا تھا۔ وہ آپ کو مل جائے گا ڈونٹ وری۔ آپ مسز باجوہ سے مل لیں۔" وہ کچھ اور بھی کہہ رہا تھا، مگر وہ سن نہیں رہی تھی۔

وہ مظفر آباد میں تھا؟ اس روز وہ مظفر آباد آیا تھا اور وہ چلی گئی تھی، مگر جانے سے قبل اسے محسوس ہوا تھا کہ اس شہر خموشاں کی سی ویرانیوں والی وادی میں، جہاں نیلم کا پانی اونچی آواز میں روتا تھا، وہ اس لمحے آیا تھا۔ کوئی جو اس کی زندگی تھا۔

وہ مظفر آباد میں اسی آسمان تلے تھا، جس کے نیچے وہ اس وقت کھڑی تھی؟ اوہ خدایا! وہ کیوں چلی آئی وہاں سے؟

اور نعمان کیا کہہ رہا تھا؟ بشیر کل افق کو اس کے پاس لانے والا تھا؟ مگر کل میں تو ابھی کئی گھنٹے

باقی تھے۔ وہ کل کا انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ اسے عجیب سی بے چینی و بے قراری ہونے لگی۔ اسے افق کے پاس جانا تھا، ابھی اور اسی وقت۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ میجر نعمان کب کا وہاں سے جا چکا تھا۔ اس کے سر کے اوپر نیلے آسمان میں وہ بادل کا ٹکڑا دو حصوں میں بٹ چکا تھا۔ بھوری چڑیا اب وہاں نہیں تھی۔ سڑک پر زرد پتے اسی طرح بکھرے تھے۔

وہ تیزی سے ڈھلان اترنے لگی۔ سوکھے پتے اس کے گلابی اور سفید جوگرز تلے چرمراتے چلے گئے۔ وہ تقریباً بھاگتے ہوئے ہسپتال کی عمارت میں داخل ہوئی۔

ریسپشن پر ایک سفید یونیفارم والی لڑکی اور خاکی یونیفارم والا لڑکا بیٹھا تھا۔

وہ ان کی جانب لپکی۔

"میجر ڈاکٹر نعمان کدھر ہیں؟"

لڑکا نا سمجھی کے عالم میں کچھ کہنے ہی لگا تھا کہ لڑکی نے کہا۔

"ادھر رائٹ سائیڈ پر جائیں، کاریڈور کے آخر میں لیفٹ......" وہ کچھ اور بھی کہہ رہی تھی، مگر پریشے سنے بغیر دائیں جانب بھاگی، کاریڈور عبور کیا، آگے دو اطراف جاتی راہداریاں تھیں۔ پتا نہیں لڑکی نے کیا بتایا تھا۔ وہ کس طرف جائے؟ پھر اندازے سے وہ ایک جانب کو مڑ گئی۔ جانے سی ایم ایچ میں اتنی بھول بھلیاں کیوں تھیں؟ کاریڈور کے اختتام پر اسے میجر نعمان کسی آفیسر سے بات کرتا دکھائی دیا۔ وہ دوڑ کر اس تک آئی۔

"میجر نعمان......وہ......" پھولی ہوئی سانس کے ساتھ وہ کچھ کہنے ہی لگی تھی کہ میجر نعمان نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روکا، دوسرے آفیسر کو کچھ کہہ کر وہاں سے بھیج دیا اور پھر اس کی جانب مڑا۔

"ریلیکس ڈاکٹر صاحبہ! آرام سے بتائیں۔ خیریت ہے؟ مسز باجوہ نہیں ملیں آپ کو؟"

"بھاڑ میں جائیں مسز باجوہ۔" وہ کہتے کہتے رک گئی، پھر چند گہری سانسیں بھرتے ہوئے تنفس بحال کیا۔

"آج کوئی ہیلی مظفر آباد جا رہا ہے؟"

"ہیلی تو روز ہی جاتے ہیں۔ ابھی تو کتنے ریموٹ ایریاز ہیں جہاں سے ملبہ نہیں ہٹایا جا سکا۔ آپ کو کیا مظفر آباد جانا ہے؟"

''جی پلیز، مجھے ابھی جانا ہے۔''

''ابھی تو......'' وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ''شاید ہمارے ایک کرنل صاحب مانسہرہ جا رہے تھے۔''

''تو مجھے راستے میں مظفر آباد چھوڑ دیں۔'' وہ بے تابی سے بولی۔

''مظفر آباد، مانسہرہ کے راستے میں نہیں پڑتا، ڈاکٹر صاحبہ آپ کو کوئی ایمرجینسی ہے کیا؟''

''ہاں وہ...... وہ میرا پتھر۔''

''تو کل وہ لوگ لے تو آئیں گے۔''

''مگر کل میں ابھی کافی دیر ہے۔ میرا پتھر بہت قیمتی تھا۔ مجھ سے اتنا انتظار نہیں ہو گا۔ مجھے ابھی ان سے بات کرنی ہے۔''

''بات کرنی ہے؟ تو وہ میں کرا دیتا ہوں۔''

''وہ کیسے؟'' پریشے کو حیرت ہوئی۔

''غالباً کئی سو برس پہلے گراہم بیل نامی آدمی نے ایک چیز ایجاد کی تھی، جسے ہم فون بولتے ہیں۔''

''وہ تو مجھے پتا ہے، مگر مواصلات کا نظام تو ڈسٹرب تھا۔ سگنل نہیں آ رہے تھے وہاں۔''

''اب کچھ کچھ آنے لگے ہیں، اور نہ بھی آئیں تو ڈونٹ یو وری، آرمی کا رابطہ تو ہے۔ آپ مجھے بیس منٹ دیں۔ میں آپ کی بات کرا دیتا ہوں۔''

وہ کہہ کر چلا گیا اور پریشے وہیں ٹائلز سے چمکتے کاریڈور میں دیوار سے ٹیک لگائے اضطراری کیفیت میں انگلیاں مروڑنے لگی۔

اس کے پر ہوتے تو وہ اڑ کر مظفر آباد جا پہنچتی۔ اسے ہر حال میں افق سے ملنا تھا، اسے دیکھنا تھا۔

''اف خدایا! میں کیوں چلی آئی وہاں سے؟''

وہ بے چینی سے وہیں کاریڈور میں ٹہلنے لگی۔ پتا نہیں بیس منٹ کب گزریں گے اور وہ افق کی آواز سن سکے گی؟ اس کی روح پیاسی تھی، اس کی سماعتیں پیاسی تھیں۔

جانے اب دو ماہ بعد وہ کیسا ہو گا؟ ویسے ہی ہنستا ہو گا؟ ویسے ہی مسکراتے ہوئے اس کی شہد رنگ آنکھیں چھوٹی ہو جاتی ہوں گی؟

اس کا دل اتنی بے قراری سے دھڑک رہا تھا کہ جیسے ابھی سینہ توڑ کر باہر آ جائے گا۔ جانے بیس منٹ پورے ہوئے بھی تھے یا نہیں، وہ مزید انتظار نہیں کر سکتی تھی۔ اس سے اور انتظار ہو ہی نہیں رہا تھا، سو وہ اسی کمرے کی طرف چلی گئی، جہاں میجر نعمان گیا تھا۔

بے قراری اتنی زیادہ تھی کہ تہذیب اور تمام قواعد کو بھلا کر بغیر دستک دیئے اندر داخل ہو گئی۔

میجر نعمان میز پر رکھے فون کا ریسیور کان سے لگائے میز کے پیچھے کھڑا بات کر رہا تھا۔

جانے ڈیف کام تھا، سیٹلائٹ فون یا عام فون!

''ہاں میں انہیں بلاتا ہوں بلکہ وہ آ ہی گئی ہیں۔'' اس نے ہاتھ سے پریشے کو اندر آنے کا اشارہ کیا۔ وہ جیسے خواب کی سی کیفیت میں چلتی ہوئی اس تک آئی تھی۔

''آپ نے کس انجینئر سے بات کرنی ہے؟'' اس نے ماؤتھ پیس پر ہاتھ رکھ کر پوچھا۔

''افق...... افق ارسلان سے۔'' اس کی آواز کپکپا رہی تھی۔

''ہاں افق ارسلان سے بات کراؤ۔'' میجر نعمان نے ریسیور اس کی جانب بڑھا دیا اور ایک طرف سے نکل کر کمرے سے باہر چلا گیا اور اپنے عقب میں دروازہ بند کر دیا۔

کتنی ہی دیر وہ فون کا ریسیور ہاتھ میں لیے اسے دیکھتی رہی۔ اسے افق سے کیا کہنا تھا، اسے معلوم نہیں تھا اور جانے وہ اس کا افق تھا بھی یا نہیں؟

اس نے ریسیور کان سے لگایا۔ وہ بولنا چاہتی تھی مگر سارے الفاظ لبوں پر دم توڑ گئے۔

دوسری جانب کوئی گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ پھر پریشے کی سماعتوں میں آواز گونجی۔

''پاری شے؟''

اور اس لمحے پوری کائنات رک گئی تھی۔

وہ اس آواز کو لاکھوں کے مجمع میں شناخت کر سکتی تھی۔ وہ آواز جو کسی نغمہ ساز کی دھن سے زیادہ مدھر اور خوب صورت تھی۔ وہ اسے پہچانتی تھی۔ وہ اس کا افق ارسلان ہی تھا۔ وہ پری کا کوہ پیما ہی تھا۔

اس کے پاؤں لڑکھڑانے کو تھے، اس نے بے اختیار میز کا کونا مضبوطی سے تھام لیا۔

''پری؟ بولو نا پری۔ میں سن رہا ہوں۔''

اور وہ بے اختیار رو پڑی۔

''افق......''

''کیسی ہو پری؟'' وہ شاید اداسی سے مسکرایا تھا۔

''تم...... تم کہاں ہو افق؟'' وہ اسی طرح ریسیور کان سے لگائے، دوسرے ہاتھ سے میز کا کونا پکڑے کھڑی تھی۔ آنسو اس کی پلکوں سے ٹوٹ ٹوٹ کر چہرے پر گرنے لگے تھے۔

''میں ہمالیہ کے آسمان کے نیچے ہوں۔''

تو ایک دفعہ پھر ہمالیہ کا آسمان دونوں کے بیچ آچکا تھا۔ وہ ایک دفعہ پھر ان پہاڑوں میں واپس آچکا تھا، جہاں سے کھینچ کر وہ اسے واپس لائی تھی۔

"تم رو رہی ہو پری؟" وہ بے چین سا ہو گیا۔

اس نے جواب نہیں دیا، اسی طرح بے آواز روتی رہی۔

"پری مت روؤ۔ پلیز آنکھیں صاف کرو۔" وہ اس سے بہت دور تھا، مگر اس لمحے اسے خود سے بہت قریب محسوس ہوا تھا۔ اس نے میز کا کونا چھوڑ دیا اور اس ہاتھ کی پشت سے بھیگا چہرہ صاف کیا۔

"اب بتاؤ کیسی ہو؟" وہ جانے کیسے سمجھ چکا تھا کہ وہ آنکھیں صاف کر چکی ہے، سو نرمی سے پوچھنے لگا۔

"بہت تہی داماں ہوں میں، افق! بہت ویران۔ اتنی ویرانیاں میرا مقدر کیوں بن گئی ہیں میں کیوں خالی ہاتھ رہ گئی ہوں؟ میں نے تو وہ سب بھی کیا جو کسی لیلیٰ، کسی ہیر نے نہیں کیا ہوگا۔ سوہنی کا تو صرف گھڑا ٹوٹا تھا جب کہ میرا تو سب کچھ دُمانی کی دھند میں ٹوٹ کر بکھر گیا، پھر بھی منزل نہیں ملی؟ میں نے تو...... میں نے تو عشق میں برف کا صحرا پار کیا تھا، پھر بھی ساری ریاضتیں رائیگاں چلی گئیں؟" وہ پھر سے رونے لگی تھی، "تم...... تم مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے افق؟"

"تم ہی نے تو کہا تھا۔" وہ بہت آہستہ سے بولا۔

"میں نے کہا تھا؟"

"ہاں، تم نے ہی تو عہد لیا تھا، بروکا گلیشیئر، ہراموش پر آتا برفشار اور دُمانی کی دھند اس عہد کی گواہ تھی۔ تمہیں یاد نہیں؟"

"میں نے عہد لیا تھا؟ میں نے کہا تھا؟ میں نے تو اور بھی بہت کچھ کہا تھا۔ میں نے تو...... میں نے تو آبشار پر تمہیں جوتے اتارنے کو بھی کہا تھا، تم نے اتارے تھے؟ میں نے تو کیمپ ٹو سے واپس چلنے کو بھی کہا تھا، تم نے میری بات مانی تھی؟ صرف وہی بات ماننا کیوں یاد رہا تمہیں؟ تم کیوں چلے گئے تھے مجھے چھوڑ کر؟ میں ہسپتال میں جاگی تو میں اکیلی تھی۔ آج پھر میں اکیلی ہوں۔ تم نہیں رکے میرے لیے، تم نے میرے ہوش میں آنے کا انتظار بھی نہیں کیا اور چلے گئے؟"

کافی دیر خاموشی چھائی رہی، پھر وہ تھکے تھکے لہجے میں بولا۔

"میں نے اپنی خوشی سے وہ وعدہ نہیں نبھایا تھا۔"

"خوشی نہیں تھی تو نہ نبھاتے۔ ایک دفعہ تو کہتے کہ میں تمہارے لیے لڑوں گا، ایک دفعہ تو ضد کرتے، نہ مانتے میری بات! ایک دفعہ تو کہتے کہ تم غلط ہو!"

"تمہیں اب لگتا ہے کہ تم غلط تھیں؟ تم نے تو کہا تھا، تم رہ لوگی۔"

"ہاں، کہا تھا۔"

"پھر؟" وہ پوچھ رہا تھا۔

"پھر؟ پھر نہیں رہ سکی۔" آنسو اس کی گردن پر پھسل رہے تھے۔

خاموشی کا ایک طویل وقفہ دونوں کے بیچ حائل ہو گیا۔

"پری!" چند لمحے سرکے تو افق نے اسے پکارا۔

وہ جواب میں لب سیے اسی طرح روتی رہی۔

"پری! میں رکنا چاہتا تھا، مگر تم نے مجھے جانے کے لیے صرف اور صرف اپنے پاپا کی وجہ سے کہا تھا۔ میں تمہارے لیے اپنے باپ سے بڑھ کر مقدم نہیں ہو سکتا تھا، نہ مجھے ہونا چاہیے تھا۔ اس لیے میں چلا گیا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ ہسپتال میں جب تم جاگو اور مجھے دیکھو تو تمہارے سمجھوتے کی ڈور ٹوٹ جائے۔"

"ہاں...... تم کیوں رکتے؟ تم کیوں میرا انتظار کرتے؟ میں...... میں تمہارے لیے ہمالیہ کے طوفان سے لڑی تھی مگر تم کیوں میرے لیے لڑتے؟ تم نے...... تم نے افق! محبت کی ہوتی تو تم رکتے۔" وہ بچوں کی طرح رو رہی تھی۔ پچھلے دو مہینوں کا کرب آج باہر بہہ رہا تھا۔

"ہاں۔" وہ جیسے زخمی دل کے ساتھ مسکرایا، "صحیح کہتی ہو، میں نے واقعی محبت نہیں کی تھی۔ میں محبت کر ہی نہیں سکا۔ حالاں کہ کوشش بہت کی تھی کہ صرف محبت کروں، مگر میں نے تم سے محبت نہیں کی تھی پری! میں نے تو تم سے عشق کیا تھا۔ محبت کی ہوتی تو شاید تمہیں اپنے باپ سے بغاوت کرنے پر مجبور کر دیتا۔ محبت کی ہوتی تو شاید رہ لیتا، محبت کی ہوتی تو شاید اب واپس نہ آتا، مگر میں نے محبت ہی تو نہیں کی تھی۔"

اس کے آنسو بہنا رک گئے تھے، فضا بالکل خاموش تھی۔ ساری کائنات ساکت ہو کر رہ گئی تھی۔ اس کمرے کی ہر شے رک کر، ٹھہر کر، بہت دھیان سے اسے سن رہی تھی، جو کہہ رہا تھا کہ اس نے محبت نہیں کی تھی، اس نے عشق کیا تھا۔

"افق......!" وہ کچھ اور نہ کہہ سکی۔ آنسو پھر سے اُبل پڑے۔

''پری......تمہارے پاپا۔''

''وہ......وہ نہیں رہے۔ وہ بھی مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔'' دل میں درد کی ٹیسیں پھر سے اٹھیں۔

''میں جانتا ہوں۔''

وہ چونکی، ''تم کیسے جانتے ہو؟''

''وہ بہت مشہور آدمی تھے، تم نے ایک دفعہ ان کا پورا نام بتایا تھا، ان کے انتقال کی خبر اخبار میں پڑھی تھی۔ ان دو ماہ میں نے کمرے میں بند رہ کر یہی اخبار پڑھنے والا کام ہی تو کیا ہے۔'' پھر وہ ذرا دیر کو ٹھہر کر بولا، ''میں تم سے ان کا افسوس بھی نہیں کر سکا، میرے پاس تمہارا کوئی نمبر نہیں تھا، نہ ہی کوئی تعلق رہا تھا۔''

''تعلق؟ تعلق تو تھا افق!''

اس نے گہری سانس اندر کو کھینچی۔ ''ہاں وہ تعلق تو دنیا کے تخلیق ہونے سے بھی قبل بنا تھا، اب تو اس کے مٹنے کے بعد ہی ختم ہوگا۔''

وہ چپ چاپ آنسو صاف کرنے لگی۔ اس کے دل کا بوجھ پہلے سے بہت ہلکا ہو گیا تھا۔

''پری!'' کچھ دیر بعد افق نے اسے پکارا۔ ''میں آ جاؤں؟''

''کیا تمہیں اب بھی یہ پوچھنے کی ضرورت ہے؟''

''ٹھیک ہے۔'' وہ اب کھل کر مسکرایا تھا، ''پھر میں کل آ رہا ہوں۔ مجھے ویسے بھی تمہارا پتھر دینا تھا۔''

''مجھے معلوم ہے۔ میجر نعمان نے بتایا تھا کہ وہ پتھر، بلکہ جیم سٹون تمہارے پاس ہے۔'' وہ اب خود کو سنبھال چکی تھی۔ میز کا کونا اس نے چھوڑ دیا تھا۔

''جیم سٹون؟'' وہ دھیرے سے ہنسا، ''اتنے اچھے فوجی اگر دھوکا کھا ہی گئے ہیں تو تم انہیں یہ مت بتانا کہ یہ پتھر ایک ڈھائی سو روپے کے کیچر پر لگا تھا اور قیمتی نہیں تھا۔''

''نہیں، میں کیوں بتاؤں گی؟ میرے لیے تو وہ ویسا ہی قیمتی ہے، جیسے وہ تصویر تھی۔''

''میجر عاصم نے دے دی تھی وہ؟''

''ہاں، مجھے مل گئی تھی۔ مجھے وہ گیت بہت اچھا لگتا تھا، جو تم نے تین ماہ پہلے مجھے وائٹ پیلس کی بالکونی میں کھڑے ہو کر سنایا تھا۔'' وہ سر جھکائے میز کا کونا کھرچ رہی تھی۔

''پھر میں کل آ رہا ہوں اور اب رونا نہیں ہے۔''

''ہاں ٹھیک ہے۔'' اس نے پھر سے آنکھیں رگڑیں۔ ''نہیں روؤں گی۔'' میز کی چمکتی سطح پر ...ہنا رو دیا رویا، متورم چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔

''افق......! تم نے آخری دفعہ ہسپتال میں میرے کان میں کیا کہا تھا؟'' اچانک یاد آنے پر ...نے پوچھا۔

''وہی جو اس تصویر پر لکھا تھا۔''

''اچھا۔'' وہ دھیرے سے ہنس دی۔ پھر کسی خیال کے تحت پوچھنے لگی، ''سنو۔''

''ہوں......بولو۔''

''تم کل کدھر آؤ گے؟''

''ہمز، اسلام آباد۔''

''نہیں وہاں مت آنا۔'' وہ سوچ سوچ کر بول رہی تھی۔

''وہ کیوں؟'' وہ حیران ہوا تھا۔

''افق! تمہیں یاد ہے وہ وقت، آج سے تین ماہ اور تین دن پہلے، جب مارگلہ کی پہاڑیوں پر پیچ ...پہ مجھے ایک شہزادہ ملا تھا۔''

''اور جب پیچ سڑک پر شہزادے کو ایک پری ملی تھی؟'' وہ مسکرایا۔

''ہاں، تمہیں یاد ہے اس روز مارگلہ کی پہاڑیوں پر بادل اترے تھے اور میں سڑک کے ...رے اس سفید پتھر پر بیٹھی تھی جب تم گھوڑا دوڑاتے ہوئے سڑک کی اونچائی سے نیچے آئے ...تمہیں وہ بادل، سڑک کی وہ اونچائی اور وہ سفید پتھر یاد ہے؟''

''میں کچھ بھولا ہی کب ہوں؟''

''میں چاہتی ہوں کہ تم کل اسی وقت سہ پہر کے تین بجے مجھے وہیں ملو۔ میں اسی پتھر پر بیٹھ کر ...نتظار کروں گی۔ تم اسی طرح گھوڑا دوڑاتے ہوئے میرے قریب آ کر مجھے پکار کر کہنا کہ ''کیا ...ری تصویر اتار سکتی ہو؟'' پھر میں تمہارے کیمرے سے تمہاری تصویر لوں گی۔ تب تم کہنا کہ تم ...سال بعد ایک سفر نامہ لکھو گے اور اس کے فرنٹ پیج پر یہی تصویر لگاؤ گے اور اس کا کیپشن ہوگا، ...''وہ پیا کی تصویر، جو اب کبھی پہاڑوں میں نہیں جائے گا۔'' پھر...... پھر افق...... پھر ہم تصور ...یں گے کہ ہم کائنات بننے کے بعد پہلی دفعہ ان پہاڑیوں پر مل رہے ہیں، ہم تصور کریں گے کہ ...یہ تین ماہ ہماری زندگیوں میں جیسے کبھی آئے ہی نہیں تھے۔''

''تم کبھی نہیں بدلو گی پریشے جہاں زیب! تم ہمیشہ عام چیزوں میں بھی خوب صورتی تلاشتی رہو گی۔'' وہ اس کے خوب صورت تخیل پر ہنس دیا۔

''تم بھی تو یہی کرتے ہو، خیر میں دعا کروں گی کہ کل بھی مارگلہ کی پہاڑیوں پر ایسے ہی بادل اتریں جیسے تین ماہ اور تین دن قبل اترے تھے۔''

''میں دعا کروں گا کہ مجھے میری پری اسی طرح سفید اور گلابی رنگوں میں ملے۔ تم کل وہی جوگرز اور وہی کپڑے پہننا، جو اس روز پہنے تھے۔''

پریشے نے سر جھکا کر اپنے جوگرز کو دیکھا جواب بدرنگے ہو چکے تھے۔ کیا وہ یہی پہن کر افق سے ملنے جائے گی؟ نہیں، وہ نئے خرید لے گی، افق کو کون سا ان کا ڈیزائن یاد رہنا ہے۔ مردوں کو ایسی باتیں کہاں یاد رہتی ہیں بھلا؟

''ٹھیک ہے اور تم بھی وہی جیکٹ پہننا'' پھر دونوں ایک لمحے کو خاموش ہوئے، دونوں نے کچھ سوچا اور پھر اکٹھے ہی بولے۔

''اور تم وہی والا.....'' مگر کچھ یاد آنے پر دونوں دوبارہ سے خاموش ہو گئے۔ چوں کہ اکٹھے بولے تھے، سو دوسرے کی بات نہیں سن سکے تھے۔

''خیر، اب تمہارے ماموں تمہارے گارڈین ہیں۔ پھر کل ان کے پاس چلیں گے، ٹھیک؟''

وہ پچھلی بات میں گم تھی، بے دھیانی سے بولی ''وہ کیوں؟''

''تمہیں ٹام کروز نے پروپوز کیا تھا ناں، سو اس کا پروپوزل پہنچانے آؤں گا میں۔''

وہ ہنس دی ''ہاں، اچھا آدمی ہے۔ میں کرلوں گی اس سے شادی۔''

''ہاں مگر مجھے قتل کر کے اس سے ہی شادی کرنا'' وہ جل کر بولا اور پھر خود بھی ہنس دیا۔

''اچھا اب میں فوج کا مزید خرچا کرانے کے بجائے فون بند کر رہی ہوں۔ کل سہ پہر تین بجے یاد رکھنا۔''

''مجھے یاد ہے۔ میں ارتھ کوئیک ریلیف ایکٹیوٹیز کے لیے آیا تھا، مگر کل کے لیے وقت نکال لوں گا۔ میرے لیے سب سے اہم کام تم ہو۔ مجھے یاد ہے، راکاپوشی کی برف میں تمہارے آنسو گرے تھے، مجھے وہ آنسو تمہیں لوٹانے ہیں۔ میں ضرور آؤں گا۔''

اس نے اللہ حافظ کہہ کر فون رکھ دیا۔

آج کتنے دنوں بعد وہ پرسکون تھی۔

اس نے آنکھیں میچ کر ایک طمانیت بھری سانس لی اور پھر آنکھیں کھول دیں۔

وہ کمرہ کتنی خوب صورتی سے آراستہ تھا، کھڑکی سے باہر نظر آتا پودا کتنا سرسبز تھا اور فضا کتنی ...بودار تھی۔

وہ باہر نکل آئی۔

میجر نعمان اسے تھوڑی دیر بعد مل گیا تھا۔

''ہو گئی بات؟ اب خوش ہیں؟''

پریشے نے بچوں کی طرح اثبات میں سر ہلا دیا۔

''چلیں، یہ تو بہت اچھی بات ہے۔'' وہ سمجھ چکا تھا کہ معاملہ محض پتھر کا نہیں تھا۔

وہ اس کا شکریہ ادا کر کے وہاں سے چلی آئی۔

آج اسے بہت سارے کام کرنے تھے۔

☆......☆......☆

وہ پورا گھنٹہ مظفر آباد کی مسمار دکانوں کے قریب متلاشی نگاہوں سے کچھ کھوجتا رہا تھا، مگر اس کی ...لوبہ شے اسے مل کے ہی نہیں دے رہی تھی۔

جانے کب وہ مایوس سا چلتا چلتا ہائی کورٹ لانز تک آ گیا۔

ہائی کورٹ لانز میں بھی خیمہ بستی نصب تھی۔ وہاں ایک جگہ گھاس پر بے تحاشا گرم کپڑوں، ...ٹروں، ٹوپیوں اور موزوں وغیرہ کا ڈھیر لگا تھا۔ اردگرد چند لوگ پھر رہے تھے مگر امداد کے ...ڑوں کے ڈھیر سے کوئی کچھ نہیں اٹھا رہا تھا پھر بھی اس نے متلاشی نگاہوں سے اس ڈھیر کو دیکھا، ...نا اس کی مطلوبہ چیز وہاں بھی نہیں تھی۔

وہ مایوسی سے پلٹنے ہی لگا تھا جب اسے دور ایک درخت کے تنے کے ساتھ ایک کم عمر لڑکی سر ...ئے بیٹھی دکھائی دی، جس کے سر پر ہاتھ سے بنا ہیٹ تھا۔

اس کی مراد بر آئی تھی۔

وہ اسی طرح جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، تیز قدموں سے چلتے ہوئے اس تک آیا۔

''بات سنو۔'' اس کے بالکل سامنے جا کر افق نے اسے مخاطب کیا۔

لڑکی نے گردن اوپر اٹھائی۔ اس کے بال بھورے اور رخسار سیبوں کی طرح سرخ تھے۔ اس کا ...کا حلیہ دیکھ کر افق کو قدرے تذبذب ہوا۔

”تم انگریزی سمجھتی ہو؟“

”ہاں، میں یونیورسٹی کی سٹوڈنٹ ہوں بلکہ تھی۔“ دھوپ سے سرخ ہوتے چہرے پر سوگواریت بکھر گئی۔ ”اب کہاں کی یونیورسٹی اور کہاں کی انگریزی۔ سب کچھ تو راکھ ہو گیا۔ خیر تو بتاؤ، تمہیں کچھ چاہیے؟“

”ہاں، مجھے تمہارا ہیٹ چاہیے۔“ وہ اسی طرح اس کے سامنے کھڑا گردن جھکائے اسے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا اور لڑکی ویسے ہی درخت سے ٹیک لگائے سر اٹھائے اسے تک رہی تھی۔

”میرا ہیٹ؟“ اس نے اپنی سبز آنکھیں حیرت سے سکیڑیں۔ ”اس بدرنگ، پرانے ہیٹ کا کیا کرو گے؟“

”مجھے کسی کو گفٹ کرنے کے لیے ہیٹ چاہیے، مگر مظفر آباد میں مجھے تمہارے ہیٹ کے سوا کوئی دوسرا ہیٹ نہیں دکھائی دیا۔“

”یہ تو بہت پرانا ہیٹ ہے، شاید تین سال قبل میں نے بنایا تھا۔“ لڑکی ہیٹ سر سے اتار کر اسے غور سے دیکھتے ہوئے کہنے لگی۔

”اوہ یعنی تم ہیٹ بنا سکتی ہو؟ بلاشبہ یہ ایک مشکل کام ہے۔“

”ہے تو، مگر میری پھپھی نے مجھے یہ سکھایا تھا۔ خیر تمہیں ہیٹ چاہیے؟ میرے گھر میں شاید کوئی رکھا ہو۔“

اس نے اسے دوبارہ سر پر پہن لیا۔

”ہاں، سادہ سا ہو اور اوپر ایک ادھ کھلا سرخ گلاب ضرور لگانا جس کی پتیاں کنارے سے سیاہ ہو کر مرجھا گئی ہوں۔“

وہ حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔ ”باسی گلاب کا کیا فائدہ؟“

”میں تمہیں یہ بات نہیں سمجھا سکتا، مگر جسے دینا ہے، اسے باسی گلاب اچھا لگے گا۔“

وہ فون پر اسے یہی ہیٹ پہن کر آنے کو کہنا چاہتا تھا، مگر تب اسے یاد آیا تھا کہ وہ ہیٹ تو ماہوڈھنڈ کے پانی پر تیرتا بہت دن پہلے اشو میں گر چکا تھا۔ ان دونوں نے عشق میں بہت کچھ کھویا تھا، اب اسے پریشے کے حصے کی چیز اسے لوٹانی تھی۔

”تو تم نے اسے وہ ہیٹ کب دینا ہے؟“ لڑکی نے دلچسپی سے اسے دیکھا۔ جینز، سویٹر، سر پر پی کیپ پہنے، جینز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ اونچا لمبا ساوجیہہ غیر ملکی اسے خاصا دلچسپ لگا تھا۔

”کل سہ پہر۔“

”تو پھر میں صبح تازہ گلاب ہی لگا دوں گی، سہ پہر تک تو وہ مرجھا جائے گا۔ میں صبح روشنی ...ے کے بعد گلاب توڑوں گی، ایسے وہ جلدی مرجھاتے ہیں، منہ اندھیرے توڑو تو دیر تک فریش ...ہتے ہیں۔“

”واہ! تم تو بہت عقل مند لڑکی ہو۔“ شہد رنگ آنکھوں میں ستائش اتر آئی۔ ”خیر، مجھے کل صبح ...ے وہ ہیٹ نیلم سٹیڈیم میں لا دینا، وہاں جو آرمی کیمپ کا آخری کونے والا سبز خیمہ ہے ناں، وہ ...ے۔ وہاں آجانا، ویسے کتنے پیسے لو گی ہیٹ کے؟“

...ڑکی بہت دکھ سے مسکرائی، ”تم کہاں سے آئے ہو؟“

”ترکی سے۔“

”کیا ڈاکٹر ہو؟“

”نہیں انجینئر ہوں۔“

”پھر تم صرف میرے پہاڑوں میں بسنے والے لوگوں کی مدد کرو، وہ ہیٹ میری طرف سے ...پاکستان آنے والے ترک انجینئر کے لیے ایک تحفہ ہوگا۔ تمہیں شام میں ہی لا دوں گی۔“

”نہیں، ابھی تو ہم کچھ لوگ دور ریموٹ ایریاز امداد لے کر جا رہے ہیں، شام تک تو شاید ...ئیں۔ تم صبح آجانا اور تحفے کا شکریہ۔“ وہ کہہ کر پلٹنے لگا۔

”سنو، تم نے وہ ہیٹ دینا کسے ہے؟“ لڑکی کی آواز میں تجسس تھا۔

...فق نے ایک لمحے کو مڑ کر دیکھا، پھر مسکراتے ہوئے شانے جھٹکے، ”تمہیں کیوں بتاؤں؟“ کتنے مہینوں بعد آج وہ کھل کر مسکرایا تھا۔ پھر مزید کچھ کہے بنا وہ وہاں سے چلا آیا۔

...اس کے دوست اس کا انتظار کر رہے ہوں گے، ان سب نے ابھی آگے پہاڑوں میں جانا ...وچتے ہوئے اس نے اپنے قدم تیز کر دیئے۔

☆......☆......☆

”آپ کے باس اندر ہیں؟“ وہ سی ایم ایچ سے سیدھی ماموں کے آفس گئی تھی اور اب ان ...ے کے باہر ایک لمحے کو رک کر ان کی سیکرٹری سے استفسار کر رہی تھی۔

”جی مگر ابھی وہ دبئی کے لیے نکلنے ہی والے ہیں، آپ کچھ دن......“

...ان سنی کرتی دروازہ دھکیل کر اندر داخل ہو گئی۔

دروازے کی سیدھ میں کافی دور آبنوسی میز کے پیچھے ماموں اپنی ایگزیکٹو چیئر پر بیٹھے، میز پر رکھی فائل پہ جھکے کچھ لکھ رہے تھے۔ آہٹ پر سر اٹھا کر دیکھا، پھر مشفقانہ انداز میں مسکرائے۔

"آؤ بیٹا!" انہوں نے فائل ایک طرف ڈال دی۔ "آج آفس میں؟ خیریت؟"

"جی بس، ایک بات کرنی تھی۔" وہ طویل کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔

"ہاں کہو، ویسے اچھے ٹائم پہ آئی ہو، میں ابھی فلائٹ کے لیے نکل ہی رہا تھا۔ خیر کیا پیو گی؟ چائے؟ کافی؟"

"نہیں رہنے دیں۔ مجھے بس بات کرنی تھی۔"

"چلو بتاؤ، کون سی اتنی ضروری بات تھی۔" وہ اپنا سارا کام چھوڑ کر بہت دھیان سے اس کی طرف متوجہ تھے۔

پریشے نے بمشکل تھوک نگلا۔ ہمت کر کے آ تو گئی تھی، مگر اب بات کیسے کرے؟ شاید اسے مامی سے پہلے بات کرنی چاہیے تھی، یوں براہِ راست ماموں سے بات کرنا مناسب نہ تھا لیکن انہیں آج چلے جانا تھا اور پھر ہفتے بعد ان کی واپسی تھی۔ وہ اب اور انتظار نہیں کر سکتی تھی۔

"وہ...... ماموں......! میں دراصل۔" وہ رکی، قدرے ہچکچائی اور پھر انگلی سے انگوٹھی نکال کر سامنے میز کی چمکتی سطح پر رکھ دی۔

"آپ یہ پھپھو کو واپس کر دیں۔"

نظریں گود میں دھرے ہاتھوں پر جمائے وہ آہستہ سے بولی۔ اس میں اس وقت نگاہ اٹھانے کی ہمت نہیں تھی۔ وہ اور افق بعض معاملات میں بہت بہادر اور بعض میں بہت بزدل تھے۔

کچھ دیر تک ماموں کچھ نہ بولے تو اس نے ڈرتے ڈرتے سر اٹھایا۔

وہ مسکراتے ہوئے اسے دیکھ رہے تھے۔

"آپ کو مجھ پر غصہ نہیں آیا کہ میں نے پاپا کی خواہش کیوں پوری نہیں کی؟"

"خواہشات زندگی تک ہوتی ہیں۔ جو چلے جاتے ہیں ان کی خواہشات کے پورا ہونے یا نہ ہونے سے فرق نہیں پڑتا۔ عموماً ہم لوگ دوسروں کی زندگیوں میں ان کو دکھ دیتے ہیں اور ان کی موت کے بعد ان کے لیے تسبیحات پڑھتے ہیں۔ تم نے پری! اپنے پاپا کی زندگی میں کبھی ان کی نافرمانی نہیں کی۔ ان کی ہر بات پر سر جھکایا، ہر حکم کی تعمیل کی۔ تمہارے پاپا تم سے راضی اس دنیا سے گئے ہیں۔ تمہاری شادی جس سے بھی ہو، اب انہیں فرق نہیں پڑے گا۔ انہیں صرف اس بات سے فرق پڑے گا کہ تم خوش ہو یا نہیں؟"

"آپ لوگ بھی اس رشتے سے ناخوش تھے ناں؟" ماموں کی باتوں سے اس کا ازلی اعتماد بحال ہونے لگا۔

"ہم قطعاً خوش نہیں تھے، مگر اس میں جہاں زیب کا قصور نہیں تھا۔ بھانجے بھتیجے سب ہی کو عزیز ہوتے ہیں۔ نشاء کی منگنی بھی تو میں نے تمہارے مامی کے بھتیجے سے کی ہوئی ہے۔ اپنے رشتوں کے باعث انسان جانتے بوجھتے ہوئے بہت کچھ نظرانداز کر دیتا ہے۔"

"پھر بھی آپ نے پاپا کے انتقال کے بعد یہ رشتہ ختم کرنے کا نہیں سوچا؟"

"میں کئی دنوں سے تمہارے منہ سے یہ سب سننے کا منتظر تھا۔ آج میرا انتظار ختم ہو گیا ہے۔" وہ یگانہ شفقت سے مسکرائے۔

"آپ یہ پھوپھو کو...... میرا مطلب ہے کس بنیاد پر......" اس نے فقرہ ادھورا چھوڑ دیا۔

"وہ میرا مسئلہ ہے۔"

"لیکن پھر بھی، وہ بہت شور مچائیں گی۔" وہ واقعتاً پریشان تھی۔

"بیٹا! میری بھی تو کوئی بات ہے ناں؟ اگر اتنا حوصلہ کر کے، مجھ پر اعتماد کر کے یہ سب کہا ہے تو میں کہہ رہا ہوں کہ میں سنبھال لوں گا تو تمہیں اس بارے میں سوچ کر پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔"

اس نے تشکر سے مسکراتے ہوئے سر ہلا دیا۔

"تھینک یو ماموں! میں چلتی ہوں۔" پھر وہ گھڑی دیکھتی اٹھ کھڑی ہوئی، پھر جاتے جاتے پوچھا۔ "آپ پھپھو سے کب بات کریں گے؟"

"دبئی سے واپسی پر۔"

"اچھا" وہ جانے کے لیے مڑی۔

"پری بیٹا!"

وہ دروازے کے قریب تھی جب انہوں نے اسے پکارا۔ وہ دروازے کی ناب پر ہاتھ دھرے مڑی۔

"جی ماموں؟"

"بیٹا! اپنے پاپا کے بارے میں کبھی بدگمان نہ ہونا۔ اپنے بھانجوں سے ہر بیٹی کے باپ کو

بہت امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ اگر تمہیں لگتا ہے کہ راکاپوشی جانے کی اجازت نہ ملنے پر تمہارے ناخوشی محسوس کر کے تمہارے لیے لاکھوں روپیہ خرچ کر دینے والا باپ زندگی کے سب سے اہم معاملے پر سنگ دل ہو گیا تھا تو تم غلط ہو۔ اسے اندازہ تھا کہ تم ناخوش ہو مگر اسے اپنا بھانجا اتنا پیارا تھا کہ اس کے خیال میں سیف سے شادی کرا کے وہ تمہیں زندگی کی تمام خوشیاں دے رہا تھا۔ تمہارے پاپا کی سوچ ہر مشرقی باپ کی طرح یہی تھی کہ وہ اپنی بیٹی کا برا بھلا زیادہ بہتر سمجھ سکتا ہے۔ وہ ایک بہترین باپ تھا، اس نے ہر حال میں تمہارے لیے بہترین ہی سوچا تھا۔"

وہ اداسی سے مسکرا دی۔

"آئی نو ماموں! میں پاپا سے کبھی ناراض نہیں ہو سکتی۔ شاید میں سیف سے شادی کر بھی لیتی مگر......بس دل نہیں مانتا۔" وہ اس سے آگے کچھ اور بھی کہنا چاہ رہی تھی، مگر رک گئی۔ یہ بات اسے ماموں کی واپسی پر کرنی تھی۔

"خدا حافظ ماموں!"

وہ وہاں سے چلی آئی۔ اب اس کا رخ مارکیٹ کی طرف تھا۔

جناح سپر میں ایک ایسی شاپ تھی، جہاں سے اکثر وہ غیر ملکی نوادرات خریدتی رہتی تھی۔

"مجھے ترکی کا جھنڈا چاہیے۔"

اس شاپ میں آ کر اس نے سیلز مین سے کہا۔

افق کو فون پر وہ وہی مفلر پہن کر آنے کی تاکید کرنے لگی تھی مگر تب اسے یاد آیا تھا کہ وہ مفلر بہت اوپر راکاپوشی کی برف میں آنے والی کئی صدیوں کے لیے دفن ہو چکا تھا۔

اب اسے ویسا ہی ایک مفلر افق ارسلان کو گفٹ کرنا تھا۔

"ترکی کا جھنڈا تو نہیں ہے۔" سیلز مین نے چند منٹ بعد بتایا۔

"اچھا۔" اسے مایوسی ہوئی، "لیکن آپ منگوا کر تو دے سکتے ہیں ناں؟ مجھے کل صبح تک چاہیے۔"

"کل تک؟" سیلز مین سوچ میں پڑ گیا۔

"میں دس گنا اوپر قیمت دے دوں گی، مگر مجھے ہر حال میں ترکی کا جھنڈا کل تک چاہیے۔"

اس کا انداز دوٹوک تھا۔

"جی جی......شیور کل صبح آپ اٹھا لیجیے گا۔"

وہاں سے وہ جوتوں کی دکان تک آئی۔ اپنے پرانے جوگرز سے ملتے جلتے سفید اور گلابی رنگوں کے جوگرز خریدے۔ اب اسے ہسپتال جا کر استعفیٰ دینا تھا۔ کل سے وہ ایک نئی زندگی شروع کرنے جا رہی تھی۔ نئی زندگی، جس سے اسے گزرے ہوئے تین ماہ اور پہاڑوں کو منہا کرنا تھا۔

سامان گاڑی میں رکھ کر اس نے اوپر آسمان کو دیکھا۔ اب نیلی چادر میں جگہ جگہ سفیدی بن رہی تھی۔ سیاہ بادلوں کا جھنڈ ابھی اسلام آباد سے کافی دور تھا۔ کاش وہ بادل کل اسی جگہ اور بت مارگلہ کی پہاڑیوں پر اتریں، جب وہ افق سے ملنے جائے۔

ٹھنڈی ہوا اس کے مخالف سمت سے چلی اس کے بال بار بار چہرے پر بکھر رہی تھی۔ اس نے ی میں بیٹھنے سے قبل، چند لمحوں کے لیے آنکھیں موند کر ہوا کی خوشبو سونگھی اور درختوں پر پھدکتی ہوا کی سرگوشیاں اور قدموں تلے بولتے پتھروں کی باتیں سنیں اور پھر آنے والے دن کی لیوں کا تصور کرتے ہوئے وہ آنکھیں کھول کر گاڑی میں بیٹھنے ہی لگی تھی کہ دور کہیں سے اڑ کر دو کوؤں نے اس کے سر کے پچھلے حصے پر اپنی چونچیں ماریں۔ اس کے لبوں سے کراہ نکلی۔ ے ہی پل وہ آسمان پر اڑتے چلے گئے۔

وہ سر کا پچھلا حصہ سہلاتے ہوئے خوف زدہ نگاہوں سے افق پر غائب ہوتے ان کوؤں کا ب کرتی رہی۔

کیا پھر کوئی بری خبر اس کی منتظر تھی یا وہ ضرورت سے زیادہ توہم پرست ہو چکی تھی؟

وہ سر جھٹک کر کار میں بیٹھ تو گئی مگر اب ان دونوں کوؤں کو ذہن سے جھٹکنا اس کے لیے بہت ا تھا۔

☆......☆......☆

"مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ یہ سب اتنی اچانک کیسے ہو گیا؟" خیمے میں رکھی چوتھی کرسی کھینچتے جیک نے بے حد حیرت سے پوچھا۔

باقی تین کرسیوں پر افق، کین اور احمت بیٹھے تھے۔

"میں نے اسے کانٹیکٹ کیا اور کل میں اسے ملنے جا رہا ہوں، دیٹس اٹ۔" وہ بظاہر لاپروائی ،مگر لبوں پر بکھری آسودہ مسکراہٹ چھپا نہیں سکا۔

"تم خوش قسمت ہو۔ ایک مجھے دیکھو منگنی سے دو دن پہلے کال آ گئی کہ کشمیر جانا ہے۔" جیک نے تاسف سے سر جھٹکا۔ اس کی منگنی ملتوی ہو چکی تھی اور اس نے خود ہی کی تھی۔ یہ وہی تھا جو

ان سب کو وہاں لایا تھا۔

"پھر تم ہمارے ساتھ ان ریموٹ ایریاز میں نہ ہی جاؤ تو بہتر ہے۔" احمت نے کچھ دیر سوچنے کے بعد سنجیدگی سے کہا، "دیکھو، وہاں ہمیں ملبے تلے دبے لوگ نکالنے ہیں۔ تمام عمارتیں آدھی کھڑی ہوں گی اور اگر ریسکیو ورک کے دوران کسی آفٹر شاک سے پوری کی پوری عمارت تمہارے اوپر گر گئی تو ہم ڈاکٹر پریشے کو کیا جواب دیں گے؟"

"احمت! بندے کی شکل اچھی نہ ہو تو بات تو اچھی کر لینی چاہیے۔" افق نے خفگی سے اسے دیکھا۔

"میری شکل بہت اچھی ہے۔ آنے کہتی ہے مجھ سے زیادہ خوب صورت بچہ اس نے ترکی میں نہیں دیکھا تھا۔"

"ہر ماں یہی کہتی ہے۔ میری ماں بھی یہی کہتی تھی، اصل اوقات تو یونیورسٹی کی لڑکیوں نے بتائی تھی۔" کیمن ہنس کر بولا۔

"چلو ہم جا رہے ہیں، تم نے چلنا ہے؟" جینیک سامان بیک پیک میں بند کر رہا تھا۔

"آف کورس۔ تمہیں کیا بھول گیا ہے کہ میں اور تم ہمیشہ ہر جگہ اکٹھے جاتے ہیں۔" وہ بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

"ہاں، لیکن تمہیں کل اسلام آباد جانا ہے۔ وہ علاقہ دور ہے، شاید تمہاری صبح تک واپسی نہ ہو سکے۔"

"کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اگر دیر ہو گئی تو...... تو میں کل کے بجائے پرسوں چلا جاؤں گا لیکن میں نے ساتھ ہی جانا ہے۔ یاد ہے ہمارا موٹو تھا کہ افق اور جینیک جنت میں بھی اکٹھے ہی جائیں گے۔" وہ ہنس کر کہتے ہوئے اپنا سامان سمیٹنے لگا۔

بات صرف جینیک کے ساتھ جانے کی نہیں تھی، اس کا دل اندر ہی اندر ان لوگوں کا سوچ کر تڑپ رہا تھا، جو اتنے دن گزرنے کے بعد بھی ملبے تلے دبے تھے۔ آج انہوں نے مظفر آباد سے چند لوگوں کو زندہ نکال لیا تھا، سو اسے امید تھی کہ وہاں کچھ جانیں تو ہوں گی جنہیں وہ ظالم پتھروں سے نکال سکیں گے۔

ان کے گروپ میں کراچی یونیورسٹی کے کچھ سٹوڈنٹس، چند جوان اور وہ چاروں ترک تھے۔ ہیلی کاپٹر نے انہیں دو پہاڑ دور ایک جگہ اتارا تھا، جہاں سے چھ گھنٹے پیدل سفر کر کے وہ اس بستی تک

پہنچے تھے، جہاں 8 اکتوبر کے بعد کوئی نہیں آیا تھا۔

وہ چھوٹا سا گاؤں نما قصبہ تھا، جس تک پہنچنے کے زمینی راستے لینڈ سلائیڈنگ کے باعث مسدود ہو چکے تھے۔ ہر سو عمارتوں کا ملبہ بکھرا تھا۔ کیا گھر اور کیا سکول، سب منہدم ہو چکا تھا۔

وہ ایک بڑی عمارت تھی جو آدھی منہدم ہو چکی تھی اور باقی آدھی سلامت کھڑی تھی۔ 8 اکتوبر کے بعد شاید کوئی شخص اس کے قریب نہیں پھٹکا تھا، وجہ اس کا آدھا کھڑا حصہ تھا جو اتنا کمزور تھا کہ فقط ایک آفٹر شاک ہی اسے زمین بوس کرنے کو کافی تھا۔

"یہ اتنی بڑی عمارت ہے۔ غالباً گورنمنٹ کا کوئی ادارہ ہے۔ یقیناً اندر بہت سے لوگ ہوں گے اور ہو سکتا ہے کچھ زندہ بھی ہوں۔"

افق کے پیچھے جب کوئی بھی اس عمارت میں داخل نہ ہوا تو وہ باہر نکل کر ان تمام لوگوں سے کہنے لگا۔

"اتنے دن بعد تو شاید ہی کوئی زندہ ہو۔" ایک لمبے لڑکے نے مایوسی سے کہا۔

"مگر آج انہوں نے مظفر آباد سے کچھ لوگ نکالے ہیں، اس لیے میں اندر جا رہا ہوں، کسی نے آنا ہے تو آئے اور جو آفٹر شاک کے ڈر سے باہر رکنا چاہتا ہے وہ رک جائے۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔" وہ دوٹوک انداز میں کہہ کر اپنے آلات لیے اندر داخل ہوا۔ فوجیوں اور ترکوں نے اس کی تقلید کی۔

وہاں ہر طرف ملبہ بکھرا تھا۔ شاید کوئی سکول تھا جس کے آدھے سے زیادہ کمرے منہدم ہو چکے تھے، کچھ کی چھتیں بھی آدھی گر چکی تھیں۔

جس کمرے میں وہ داخل ہوا، اس کی چھت آدھی سے زیادہ زمین بوس ہو چکی تھی۔ وہ اور ایک جوان زمین پر بکھرے پتھر اٹھانے لگے۔ تھوڑی دیر بعد اسے بڑے بڑے پتھروں اور سریے کے ٹکڑوں کے درمیان چند کاغذ دکھائی دیے۔ اس نے جھک کر وہ کاغذ اٹھائے اور انہیں آنکھوں کے قریب لایا۔ ان پر اردو میں کچھ لکھا تھا۔

"یہ دیکھو، کیا لکھا ہے؟" افق نے سامنے موجود جوان کی جانب وہ کاغذ بڑھایا، جس نے ٹارچ اس پر کرتے ہوئے پڑھنا شروع کیا۔

"مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ یہاں بہت اندھیرا ہے۔ کلاس کے سارے بچے بہت چیخ رہے ہیں۔ مجھے بھی رونا آ رہا ہے مگر میں روؤں گی نہیں۔ مجھے پتا ہے ابھی کوئی مجھے بچانے آ جائے گا۔ ابھی ابو آ

جائیں گے۔ وہ یہ ڈیسک ہٹا دیں گے، جو میرے اوپر گرا پڑا ہے۔''
کچھ سطور چھوڑ کر لکھا تھا۔
''میری ٹانگ میں بہت درد ہو رہا ہے۔ کچھ نظر بھی نہیں آ رہا۔ یہاں بہت ڈراؤنا سا اندھیرا ہے۔ شاید رات ہو رہی ہے۔ ابو ابھی تک نہیں آئے۔ پلیز اللہ میاں، ابو کو بھیج دیں۔ مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔ سارے بچے رو رہے ہیں۔ کسی کے ابو نہیں آ رہے۔ پلیز کوئی مجھے یہاں سے نکالے۔ مجھے بھوک لگی ہے، مجھے کھانا کھانا ہے۔''
''اب بچے نہیں چیخ رہے۔ میں نے مریم کو آواز دی ہے، مگر وہ بولتی نہیں ہے۔ کشمالہ کہہ رہی ہے مریم مرگئی ہے اور اب وہ کبھی نہیں بولے گی۔ کشمالہ زور زور سے رو رہی ہے۔ مجھے بھی رونا آ رہا ہے۔ لکھا بھی نہیں جا رہا۔ اللہ میاں پلیز ہمیں یہاں اکیلا مت چھوڑیں۔ ہمیں نکال لیں۔ یہاں بہت اندھیرا ہے۔'' پڑھتے پڑھتے اس جوان کا گلا رندھ گیا۔
''احمت...... احمت......!'' افق باقیوں کو آوازیں دینے لگا، احمت اور جینک بھاگتے ہوئے ادھر آئے۔
''آؤ جلدی کرو، یہ ملبہ ہٹاؤ۔ شاید مریم اور اس کی بہن زندہ ہوں۔''
وہ جانے کس امید پر پتھر ہٹانے لگا۔ شاید وہ لڑکی زندہ ہو، شاید وہ نہ مری ہو۔ اس نے یہ کاغذ یقیناً پتھروں کے درمیان سوراخوں سے اوپر پھینکا ہوگا اور وہ پتھروں میں پھنس گیا ہوگا۔
وہ تیزی سے ملبہ صاف کر رہے تھے۔ افق کے کپڑے مٹی اور گرد سے اٹ چکے تھے، سخت سردی کے باوجود پسینے آ رہے تھے۔ لاشوں کی تعفن زدہ بو ہر جگہ پھیلی تھی۔
تھوڑا نیچے ہی ملبہ ہٹانے پر انہیں ایک گوری چٹی، خوب صورت بچی کی لاش ملبے میں پھنسی دکھائی دی۔ اس کے ہاتھ میں ایک پنسل جکڑی تھی۔
افق کا دل خراب ہونے لگا۔ بمشکل خود پر قابو پاتے، وہ جینک اور احمت کے ساتھ اس بچی کی لاش نکالنے لگا۔ اس کی کچلی ہوئی ٹانگ پر ایک بھاری پتھر تھا۔ وہ تینوں جھک کر وزنی پتھر اٹھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ اس پل زمین نے ایک زوردار جھٹکا کھایا۔
اس سے قبل کہ ان میں سے کوئی سیدھا ہوتا، کمرے کی آدھی کھڑی چھت زور سے ان پر آن گری۔

☆......☆......☆

''سر! میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے، مجھے اس پر پچھتاوا نہیں ہوگا۔'' اپنے استعفیٰ پر ڈاکٹر واسطی کے تحفظات سن کر وہ اطمینان سے مسکرا کر بولی۔
''اس کے باوجود اگر آپ کبھی واپس آنا چاہیں تو ہمارے ہسپتال کے دروازے آپ کے لیے کھلے ہیں۔''
''شیور، مگر پتا نہیں اب واپسی کب ہو۔ شاید میں بیرون ملک چلی جاؤں۔ اینی ویز، آپ کا شکریہ سر!''
وہ اپنا استعفیٰ دے کر وہاں سے چلی آئی۔ آج اس کا ہسپتال میں آخری دن تھا اسے کل سے وہاں نہیں آنا تھا۔ ان آخری چند گھنٹوں میں وہ تمام مریضوں کو مکمل توجہ دے رہی تھی۔
رات میں وہ ڈاکٹر کامران کے ہمراہ ایکسیڈنٹ میں زخمی ہونے والے اس شخص کی مرہم پٹی کر رہی تھی جس کو ابھی کچھ دیر پہلے اس نے نرس سے خون چڑھانے کو کہا تھا۔
''بلڈ لگا دیا ہے؟''
پریشے نے قریب آتی نرس کی جانب سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔
''جی، او پازیٹو لگایا ہے۔''
''او نیگٹو نہیں تھا؟'' وہ جاتے جاتے کچھ سوچ کر پلٹی۔
''نہیں، او نیگٹو اور اے بی نیگٹو دونوں بلڈ بینک سے ختم ہو چکے ہیں۔''
وہ ڈاکٹر کامران کی طرف متوجہ ہوئی نرس سر جھکائے وہاں سے چلی گئی۔
''سسٹر یہ انجکشن لے آئیں اور اس نمبر پر فون کر کے اس آدمی کے گھر والوں کو اطلاع دیں۔''
ڈاکٹر کامران نے کاغذ پر کچھ لکھ کر سر اٹھایا۔ نرس جا چکی تھی۔ پریشے وہاں کھڑی تھی، اس نے ان کے ہاتھ سے کاغذ لے لیا۔
''سر! مجھے دے دیں، میں لے آتی ہوں۔'' حالاں کہ اس کے ڈیوٹی آورز ختم ہو چکے تھے، پھر بھی وہ نسخہ ان سے لے کر وہاں سے چلی آئی۔ فارمیسی سے انجکشن لے کر اس نے شاپر میں ڈالے اور پھر استقبالیہ ڈیسک کی طرف آئی۔
''اس نمبر پر کال کرنی ہے۔'' وہاں بیٹھی سسٹر شمائلہ کو وہ کاغذ پر لکھا نمبر دکھا کر سمجھانے لگی۔ اسی اثنا میں کسی نے اس کی پشت پر ہسپتال کا شیشے کا دروازہ دھکیل کر کھولا۔ نرس سے بات کرتے کرتے اس نے ایک سیکنڈ کو پلٹ کر دیکھا۔ کیموفلاج وردی والے فوجی تیزی سے سٹریچرز اندر لا رہے

تھے۔

"چچ...... چچ جانے اب کس کو ملبے سے نکالا ہے۔" وہ تاسف سے ان تینوں اسٹریچرز کو دیکھنے لگی جن پر خون میں لت پت نفوس پر سفید چادر ڈالی گئی تھی۔ سفید چادریں خون سے سرخ ہو رہی تھیں۔

آگے والے اسٹریچر کو ایک فوجی دھکیل رہا تھا، جسے اس نے شاید مظفر آباد میں بھی دیکھ رکھا تھا۔

"سنیں صاحب! کیا ہوا ہے؟ کون لوگ ہیں یہ؟" وہ یونہی کھڑے کھڑے پوچھنے لگی۔

"یہ ریسکیو ورک کر رہے تھے، ملبے سے لوگوں کو نکال ہی رہے تھے کہ آفٹر شاک آیا اور ان پر چھت گر گئی۔ ہمارا ایک جوان تو وہیں شہید ہو گیا تھا، ان تینوں کو ادھر لے کر آئے تھے مگر دو نے راستے میں دم توڑ دیا، تیسرا شدید زخمی ہے۔"

زخمی کو سٹریچر وہی فوجی دھکیل رہا تھا۔ اس کے اپنے کپڑوں پر بھی خون لگا تھا اور وہ سخت بوکھلایا ہوا تھا۔

"چچ...... چچ یہ تو بہت برا ہوا۔ خیر اس زخمی کو اس طرف آگے راہداری میں لے جاؤ، وہاں ایمرجنسی ہے، اور یہ دو جو بے چارے مر گئے ہیں انہیں...... سسٹر!" اس نے قریب کھڑی نرسوں کو اشارہ کیا، جو مستعدی سے باقی دونوں سٹریچرز کی جانب لپکیں اور انہیں دوسری جانب لے جانے لگیں۔ زخمی کا اسٹریچر باقی فوجی تیزی سے آگے راہداری میں دھکیلنے لگے۔

وہ واپس استقبالیہ ڈیسک کی جانب پلٹی۔

"اس نمبر پر فون کر کے......" وہ نرس کو سمجھانے لگی، پھر تمام ہدایات مکمل کر کے، دوائیوں والا لفافہ ہاتھ میں پکڑے اس نے اپنے قدم وارڈ کی طرف بڑھا دیئے، جہاں ڈاکٹر کامران نے انجکشن منگوائے تھے۔ دونوں نرسیں میتوں والے سٹریچرز لے کر ابھی اسی طرف جا رہی تھیں۔

نرس کے قریب سے گزرتے ہوئے اس نے ایک نظر مر جانے والے ریسکیو ورکر پر ڈالی جس کا چہرہ سفید چادر سے ڈھکا تھا اور اس کے سینے کے مقام پر چادر کے اندر کوئی ابھری ہوئی شے رکھی تھی۔

اسے بہت سے کام کرنے تھے مگر یک دم جیسے اسے کوئی احساس ہوا تھا اس نے نرس کو روکا اور چادر ہٹائی۔

مرنے والے کا چہرہ اور جسم خون میں لت پت تھا۔ اس کے سینے پر رکھی چیز اس کی پی کیپ تھی۔

پریشے نے کیپ اٹھائی۔ نیلی پی کیپ خون سے سرخ ہو چکی تھی۔

"بے چارہ۔" افسوس سے سر جھٹک کر وہ کیپ کو واپس رکھنے ہی والی تھی کہ ایک دم کسی چیز نے اسے ٹھٹکنے پر مجبور کیا۔

اس نے کیپ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ اس کے پچھلے حصے پر سفید رنگ سے، جو خون کے باعث گلابی ہو چکا تھا، ہاتھ سے لکھا تھا، "Hail to Tayyip Erdogan"

زمین اور آسمان اس کی نگاہوں کے سامنے گھومنے لگے تھے۔

وہ بے اختیار لڑکھڑائی۔ کیپ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر فرش پر جا گری۔

"ہیل ٹو طیب اردگان؟" اس نے بے یقینی سے دہرایا، پھر تیزی سے مرنے والے کا چہرہ اپنی جانب گھمایا۔

چوڑا جبڑا، گھنگھریالے سنہری بال۔

وہ افق نہیں تھا حالاں کہ وہ کیپ افق پہنتا تھا، مگر وہ کیپ افق کی نہیں تھی۔ وہ اس کے دوست جینک یقین کی تھی۔

"جینک، افق کے بغیر کہیں نہیں جاتا۔" احمت کا فقرہ اس کے دماغ میں گونجا۔

مرنے والا یقیناً جینیک تھا اور جینیک واقعی افق کے بغیر کہیں نہیں جاتا تھا۔ اگر جینیک ادھر تھا تو افق کہاں تھا؟ اس نے سر اٹھا کر سامنے دوسری نرس کو دیکھا جو دوسری میت والا اسٹریچر دھکیل رہی تھی۔

وہ تیزی سے اس اسٹریچر کی جانب لپکی اور پھر کانپتے ہاتھوں سے سفید چادر کا کونا پکڑا۔ اس میں چادر ہٹانے کی ہمت نہیں تھی، وہ افق کو خون میں لت پت، لاش بنا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس نے چادر ہٹانی چاہی، مگر اس کی لرزتی انگلیوں نے حرکت نہیں کی۔ ان میں چادر ہٹانے کی ہمت ہی نہیں تھی۔

نرس نے جیسے کچھ سمجھ کر سفید کپڑا مرنے والے کے چہرے سے اتار دیا۔

اس کا سانس رک گیا۔ وہ افق نہیں تھا۔

وہ احمت دوران تھا، معصوم، کیوٹ سا احمت دوران، جو بہت ہنسا کرتا تھا۔

"احمت...... اوہ گاڈ!"

اس نے بے اختیار اس کا خون میں لت پت چہرہ تھپتھپایا۔ وہ بے جان تھا۔ احمت مر چکا تھا۔

اس کی گردن ایک طرف کندھے پر ڈھلک گئی تھی۔

''نہیں......احمت نہیں۔'' وہ چیخ روکنے کو منہ پر ہاتھ رکھے دوقدم پیچھے ہٹی۔

دور کاریڈور کے دوسرے کنارے پر وہ فوجی اور وارڈ بوائے تیسرا سٹریچر دھکیل کر لے جا رہے تھے۔

اسے یہ جاننے کی ضرورت نہیں تھی کہ وہ تیسرا کون تھا۔

وہ بے اختیار ان کی جانب بھاگی۔ دوائی کے لفافے کا ایک سرا اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ لفافہ ترچھا ہوا، چھوٹی چھوٹی شیشیاں ایک ایک کر کے اس کے دوڑتے بدحواس قدموں کے ساتھ چمکتی ٹائلز پر گرنے لگیں۔ شیشیاں ٹوٹنے کی چھناکے دار آواز پر ارد گرد کتنے ہی لوگوں نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تھا، جو دوڑتے ہوئے کاریڈور کے دوسرے سرے تک آئی تھی۔

''رکو......رکو......'' اس کی ہراساں آواز پر جوان رکا۔ وہ لپک کر سٹریچر تک آئی اور زخمی انجینئر کا چہرہ اپنی جانب کیا۔

وہ بند آنکھوں سے رک رک کر سانس لیتا افق ارسلان ہی تھا۔

''افق......میرے اللہ! یہ تو بہت زخمی ہے۔ اسے فوراً ادھر لاؤ۔'' وہ بدحواسی کے عالم میں ان کے ساتھ کانپتے ہاتھوں سے سٹریچر گھسیٹتی، دھکیلتی ایمرجینسی تک لائی۔

''ڈاکٹر واسطی! سر پلیز اسے دیکھیں، جلدی کریں ورنہ یہ مر جائے گا۔'' کسی اور طرف متوجہ ڈاکٹر واسطی کا بازو کھینچ کر وہ انہیں اس تک لائی تھی۔

''سر پلیز! جلدی کریں، اس کا خون بہے جا رہا ہے۔'' اس کا پورا وجود کسی سوکھے پتے کی مانند لرز رہا تھا۔

اسے ابتدائی طبی امداد دینے کے تھوڑی دیر بعد ڈاکٹر واسطی ساتھ کھڑی نرس سے کہنے لگے،

''اس کا بلڈ بہت بہہ گیا ہے، اس کا گروپ چیک کریں اور بلڈ کا بندوبست کریں۔''

''بلڈ گروپ؟'' پریشے نے چونک کر سر اٹھایا۔ ''مجھے پتا ہے۔ اس کا گروپ او نیگٹو ہے۔'' کہہ کر وہ رکی نہیں بلکہ بھاگتی ہوئی باہر آئی۔ تب اسے یاد آیا کہ بلڈ بینک میں او نیگیٹو تو ختم ہو چکا تھا۔ او خدایا! اب وہ خون کہاں سے لائے؟ افق کو خون کی شدید ضرورت تھی مگر وہ کہاں سے لائے؟

اس نے یاد کرنے کی کوشش کی کہ اس کے کس عزیز رشتے دار کا گروپ او نیگیٹو ہے اور تب ایک خیال بجلی کی طرح اس کے ذہن میں کوندا۔

''سیف، ہاں سیف کا گروپ او نیگیٹو ہے۔''

وہ دوڑتے ہوئے استقبالیہ کاؤنٹر تک آئی۔ نرس کسی سے فون پر بات کر رہی تھی۔ اس نے تیزی سے ریسیور جھپٹا، کال ڈسکنکٹ کی اور لرزتی انگلیوں سے سیف کا نمبر ملانے لگی۔ وہ اس بری طرح ہراساں اور پریشان تھی کہ اسے بھول گیا کہ اس کے اوور آل کی پاکٹ میں موبائل بھی رکھا ہے۔ اس سے تو سیف کا نمبر بھی نہیں ڈائل ہو رہا تھا۔

دماغ بری طرح ماؤف تھا۔

بمشکل نمبر ڈائل کیا۔ تیسری گھنٹی پر سیف نے ہیلو کہا۔

''سیف......سیف تم پلیز ادھر پمز آ جاؤ۔ ایمرجنسی ہے۔ بلڈ چاہیے۔''

''کون پری؟ کیا ہوا؟ امی تو ٹھیک ہیں؟'' سیف کا ذہن فوراً اماں کی جانب گیا تھا جو ہائی بی پی کی مریضہ تھیں۔

''ہاں وہ ٹھیک ہیں، مگر ایک زخمی ہے۔ اس کا گروپ او نیگیٹو ہے۔''

''اوہ، تو مریض ہے۔'' وہ ریلیکس ہو گیا۔

''ہاں اور اس کو فوری بلڈ چاہیے۔''

''تو ہسپتال کے بلڈ بینک سے لے لو۔ زلزلے پر اتنے تو لوگوں نے خون دیا ہوگا۔''

''جو تھا وہ لگا دیا گیا ہے۔ اگر ہوتا تو میں تم سے مانگتی؟'' وہ جھنجھلا گئی تھی۔ ''تم......تم بس فوراً ادھر آ جاؤ۔''

''پریشے! میں مصروف ہوں۔ ہم ٹینڈر لینے کے لیے فگرز دے رہے ہیں۔ میں نہیں آ سکتا۔''

''سیف! خدا کے لیے، وہ مر جائے گا۔ اس کو فوری بلڈ چاہیے۔ تم پلیز آ جاؤ۔ پمز تمہارے آفس کے قریب ہی تو ہے۔'' صرف افق کی زندگی کے لیے اس نے ایک دفعہ پھر اس کی منت کی۔

''میں نے کہا ناں نہیں آ سکتا۔ سارے شہر میں خون ختم تو نہیں ہو گیا ہوگا۔ کسی دوسرے ہسپتال سے پتا کرو۔'' وہ بے زار سا بولا۔

''مگر ہمیں فوری چاہیے۔''

''یار! کیا مسئلہ ہے؟ میں میٹنگ میں ہوں۔ اچھا گھنٹے تک آنے کی کوشش کروں گا۔''

''گھنٹے تک؟ اس کے پاس گھنٹہ نہیں ہوگا سیف! وہ مر جائے گا۔ خدا کے لیے سیف! وہ مر جائے گا۔ میں تمہاری منت کرتی ہوں۔ پلیز تم آ جاؤ۔''

"تو میں نے تو نہیں زخمی کیا اسے؟ دیکھو مجھے اس سے ہمدردی ہے۔ وہ جو کوئی بھی ہے اور میں آ بھی جاتا مگر اس وقت میں واقعی سخت مصروف ہوں۔ مجھے دو کروڑ کا منافع مل رہا ہے اس ٹینڈر سے، میں یہ کھونا نہیں چاہتا۔ پلیز، اب مجھے تنگ مت کرو۔ بائے۔"

وہ ریسیور پکڑے ساکت سی کھڑی رہ گئی۔

"نہیں، سیف کو میری بات سمجھ میں نہیں آئی۔ ابھی میں اسے دوبارہ ایکسپلین کروں گی تو وہ فوراً آ جائے گا۔" اس نے پھر سیف کا نمبر ڈائل کیا، اس نے کال کاٹ دی۔ اس نے پھر نمبر ملایا، اب کہ سیف نے موبائل آف کر دیا۔

پریشے کو اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔

دو کروڑ، صرف دو کروڑ کے نفع کے پیچھے سیف کسی کی جان بچانے نہیں آ سکتا تھا؟ وہ اپنے سیروں خون میں سے دو بوتلیں ایک زخمی کو نہیں دے سکتا تھا۔

دو بوتلیں۔

دو کروڑ۔

افق ارسلان دو کروڑ پاکستانی روپے سے بھی ارزاں تھا؟

سیف کے پاس چند لمحے بھی اس شخص کی زندگی بچانے کو نہیں تھے، جو پریشے کی پوری زندگی تھا؟ وہ آپریشن تھیٹر میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں لیتا شخص اتنا بے وقعت تھا؟

"یا خدا! اس نے کسی کا کیا بگاڑا تھا جو وہ یوں زخمی ہو گیا؟ وہ اتنا اچھا انسان اندر مر رہا ہے اور تمہارے بنائے گئے دوسرے انسان اپنے نوٹ گننے میں لگے ہیں؟ کچھ کرو میرے اللہ، افق کو بچا لو۔" دل ہی دل میں دعا کرتی وہ استقبالیہ ڈیسک سے ہٹی اور واپس افق کے پاس آئی۔

وہ بیڈ پر چت لیٹا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں۔ چہرہ خون آلود خراشوں سے بھرا ہوا تھا۔ اسے آکسیجن ماسک لگا دیا گیا تھا۔ چند ڈاکٹرز اس کے زخمی جسم پر جھکے تھے۔

"بلڈ ملا؟" ڈاکٹر واسطی نے اسے آتا دیکھ کر پوچھا۔

"نہیں سر!" اس نے مایوسی سے نفی میں گردن ہلائی۔

اس کے زخم بہت شدید ہیں۔ اسے بلڈ مل گیا تب بھی یہ شاید ہی بچے۔" وہ دوبارہ اس پر جھک گئے۔

"سر! آپ میرا سارا خون لے لیں، مگر...... مگر اسے بچا لیں۔" وہ رو دینے کے قریب تھی۔

"آپ کا گروپ کیا ہے؟"

"او پازیٹو۔"

"مگر سسٹر کہہ رہی تھی مریض کا او نیگیٹیو ہے۔ آپ کا بلڈ اسے نہیں لگ سکتا۔ ڈاکٹر پریشے! آپ ڈیوٹی آورز ختم ہو گئے ہیں، آپ جا کر گھر پہ آرام کریں۔"

اس نے ٹھیک سے ان کی بات سنی بھی نہیں اور باہر نکل آئی۔ کاریڈور میں زخمی کینن جینیک کھڑا

"تمہارا بلڈ گروپ کیا ہے؟" ایک دم رک کر اس نے کینن سے پوچھا۔

"بی پازیٹیو۔"

پریشے کی آخری امید بھی دم توڑ گئی۔ وہ سبک رفتاری سے وہاں سے آگے چلی آئی۔ اسے ...رے ہسپتالوں سے بلڈ منگوانا تھا، گو کہ یہ مشکل ہی تھا کہ بلڈ مل جاتا، مگر افق کے لیے اسے ہر ...شش کرنا تھی۔

بیچ کاریڈور میں اسے کسی نے روک لیا۔

"ڈاکٹر پریشے!" وہ سترہ اٹھارہ برس کا جانی پہچانی شکل کا لڑکا تھا۔

"آپ کو او نیگیٹیو چاہیے؟" آپ ابھی فون پر کسی سے کہہ رہی تھیں۔ میرا گروپ او نیگیٹیو ہے۔"

کسی نے اس کے مردہ وجود میں نئی روح پھونک دی تھی۔

"میرے ساتھ آؤ۔" وہ لڑکے کا بازو پکڑ کر کھینچتی ہوئی اسے آپریشن تھیٹر تک لائی۔

"سر! بلڈ مل گیا ہے۔ اس کا او نیگیٹیو ہے۔"

آناً فاناً لڑکے کو ساتھ والے بیڈ پر لٹایا گیا۔ اس کی آستین اوپر کی، نالیاں جوڑیں۔

وہ ایک ایک قطرہ خون افق کی جلد میں پیوست سوئی کے ذریعے اس کے جسم میں داخل ہوتے ...رہی تھی۔ وہ پلکیں نہیں جھپک پا رہی تھی۔ اسے لگا اگر وہ پلکیں جھپک گئی تو خون کی وہ بوتل ...ب ہو جائے گی، منظر بدل جائے گا اور اسے بدل جانے والے منظر سے خوف آ رہا تھا۔

"پریشے! ریلیکس کریں۔ گھر جا کر سو جائیں۔ آپ پچھلے کئی گھنٹے سے ڈیوٹی کر رہی ہیں۔ ...خواہ اس فارنر کے لیے پریشان نہ ہوں۔" اس کی ہیجانی کیفیت اور اضطراب دیکھ کر ڈاکٹر ...لی نے گرین ماسک کے پیچھے سے کہا۔ وہ انہیں کیسے بتاتی کہ وہ اپنی زندگی کو یوں تنہا چھوڑ کر ...جا سکتی تھی۔ ایک وقت تھا، جب اس شخص کی صرف ٹانگ زخمی تھی اور وہ اس کے لیے

چار راتیں ٹھیک سے لیٹ کر نہیں سو سکی تھی، اب بھلا کیسے جا سکتی تھی؟

خون بوند بوند افق کے جسم میں داخل ہو رہا تھا۔ ای سی جی مشین پر اس کے دل کی دھڑکن آڑی ترچھی لکیروں سے ظاہر تھی، مگر پریشے کا دل اندر ہی اندر ڈوب کر ابھر رہا تھا۔

اس سے مزید نہیں دیکھا گیا، وہ باہر چلی آئی۔

باہر کاریڈور میں وہ فوجی جوان اب نہیں تھے۔ جانے وہ کہاں چلے گئے تھے۔ اس کا دوپٹہ فرش پر گرا پڑا تھا، اس نے وہ اٹھا کر کندھے پر ڈالا۔

پھر کتنی ہی دیر وہ چمکتی ٹائلز والے کاریڈور میں ادھر ادھر ٹہلتی رہی۔ اس کا رواں رواں کانپ رہا تھا۔ اگر افق کو کچھ ہو گیا تو وہ کیا کرے گی؟ وہ کہاں جائے گی؟

''میرے اللہ......! اسے بچا لو۔'' دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو الفاظ لبوں پر ہی دم توڑ گئے۔ آنسو ٹپ ٹپ اس کی آنکھوں سے گرنے لگے۔

اتنی اچانک یہ کیا ہو گیا تھا؟ وہ تو بہت خوش کن خیالوں میں گھری گھر جا رہی تھی، اسے تو ابھی کل سہ پہر کی تیاری کرنی تھی، اسے تو کل افق سے مارگلہ کی پہاڑیوں پر ملنا تھا، یوں ہسپتال میں تو نہیں۔ اس نے منع کیا تھا اسے کہ وہ اس سے ملنے پمز نہ آئے، پھر وہ اس طرح پمز کیوں آ گیا تھا؟

اسے پتا بھی نہیں چلا کہ کب وہ وہیں فرش پر بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

زندگی ہمیشہ اس کے ساتھ ایسے کیوں کرتی تھی؟ اسے خوشیاں کیوں راس نہیں آتی تھیں؟ پچھلے تین برسوں میں افق ارسلان نام کی جو واحد خوشی اسے ملی تھی، وہ خوشی جو کل اس کی ہونے جا رہی تھی، وہ اتنی جلد کیوں اللہ اس سے چھین رہا تھا؟ اتنا قریب آ کر وہ شخص کیوں پھر سے دور جا رہا تھا؟

وہ بہت دیر فرش پر بیٹھی بلک بلک کر روتی رہی تھی۔

''میں ضرور آؤں گا۔ تمہیں یاد ہے، راکاپوشی کی برف میں تمہارے آنسو گرے تھے، مجھے تمہیں وہ آنسو لوٹانے ہیں۔''

وہ ٹھیک کہتا تھا، وہ اسے آنسو لوٹانے صبح سے پہلے ہی واپس آ گیا تھا۔

''اب رونا نہیں ہے، پری آنکھیں صاف کرو۔''

صبح اس کا کہا گیا فقرہ اس کے ذہن میں گونجا۔ وہ کھڑی ہو گئی اور آنکھیں صاف کرتی اندر آ گئی۔ لڑکا خون دے کر اٹھ چکا تھا۔ اپنی آستین نیچے کرتے ہوئے اس نے پری کو دیکھا تو رک گیا، پھر چند قدم چل کر اس کے قریب آیا۔ وہ اسے پہچان گئی تھی۔

وہ حبیب کا دوست تھا، جسے وہ اس روز بھی ہسپتال میں ملی تھی۔

''روئیں مت، وہ ٹھیک ہو جائے گا۔'' اس کے قریب آ کر بہت آہستگی سے اس نے کہا۔ پری نے چونک کر بھیگا چہرہ صاف کیا۔

''اتنے عرصے بعد وہ آپ کو کھو جانے کے لیے نہیں ملا۔ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ میں نے پہچان لیا ہے۔ یہ افق ارسلان ہے۔'' وہ اتنی مدھم سرگوشی میں کہہ رہا تھا کہ پریشے کے علاوہ کوئی دوسرا اس کمرے میں اس کی بات نہیں سن سکتا تھا۔

''کیا واقعی وہ ٹھیک ہو جائے گا؟''

''جی اور اب میں آپ کو آپی بول سکتا ہوں؟'' وہ ہلکا سا مسکرایا۔

وہ نم آنکھوں سے ایک پل کو مسکرائی۔ اس کا سر خود بخود اثبات میں ہل گیا۔ بعض دفعہ بعض لوگوں کو ہم کتنا غلط سمجھتے ہیں۔

وہ اس کے قریب سے ہو کر نکل گیا۔ پریشے نے پلٹ کر اسے دیکھا۔ ''سنو۔''

وہ جاتے جاتے مڑا، ''جی؟''

''تمہارا نام کیا ہے؟'' وہ پھر بھول گئی تھی۔

وہ ہولے سے مسکرایا، ''مصعب......مصعب عمر۔'' یہ کہہ کر وہ رکا نہیں۔

وہ افق کے قریب چلی آئی۔ آس پاس کتنے لوگ موجود تھے، وہ کسی کو بھی نہیں دیکھ رہی تھی۔ اس کی نگاہیں افق کے چہرے اور بند آنکھوں پر جمی تھیں۔

وہ اس کے سرہانے کھڑی ہو گئی اور اس کا بایاں ہاتھ جو زخموں سے کسی حد تک محفوظ رہا تھا، اپنے ہاتھ میں تھام لیا۔ اس کی کلائی میں وہی گھڑی تھی۔ چوکور سیاہ ڈائل کے درمیان چمکتا ہیروں کا اہرام۔ ڈائل کا شیشہ البتہ چکنا چور ہو چکا تھا۔

اس نے بھیگی آنکھوں سے افق کا چہرہ دیکھا۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ وہ آنکھیں کھولتا کیوں نہیں تھا؟ وہ کچھ کہتا کیوں نہیں تھا؟

''افق!'' وہ دھیرے سے بڑبڑائی، ''افق! اٹھو......سونا نہیں ہے۔ سو گئے تو پھر نہیں جا گو گے۔ میں نے منع کیا تھا ناں کہ سونا نہیں ہے، پھر کیوں سو رہے ہو؟ اٹھ جاؤ افق......صرف ایک دفعہ اپنی پری کے لیے۔ دیکھو، پری تمہارے قریب ہے۔ وہ تمہیں پکار رہی ہے۔ پری کا نجات دہندہ کہاں ہے؟ وہ سو کیوں رہا ہے؟ اٹھو افق......! پلیز آنکھیں کھولو۔

تمہیں وائٹ پیلس کی وہ اونچی سیڑھیاں یاد ہیں؟ اور وہ موروں کا پنجرہ جس میں مور ناچا کرتا تھا اور کونے میں مورنی دبکی بیٹھی ہوتی تھی اور نیچے جھرنے پر وہ اداس گیت گاتی چڑیا، جھرنے کا پانی اور پتھروں پر ثبت ہمارے قدموں کے نشان، وہ سب تمہیں پکار رہے ہیں۔

تم نے کہا تھا ہم پھر کبھی وائٹ پیلس گئے تو نیلی ٹائلوں والے اس فوارے کے پیچھے چھپایا گیا وہ ادھ کھایا بگوگوشہ تلاش کریں گے۔ افق! اس سبز بگوگوشے کو توتوں اور پرندوں نے نہیں کھایا۔ وہ سب تمہارے دوبارہ آنے کا انتظار کر رہے ہیں...... اٹھو افق! پری کے لیے ماہو ڈھنڈ کے نیلے پانیوں اور چھومولنگما کی چوٹی پر سنہری رتھ سے اترتی سورج کی پریوں کے لیے اٹھو...... شاید تمہیں وہ سب بھول گیا ہو، مگر وہ پریاں نہیں بھولیں۔ وہ آج بھی تمہیں یاد کرتی ہیں۔ ہمیں ایک بار پھر ان کے پاس جانا ہے۔ ہمیں ایک دفعہ پھر ان پریوں کا رقص دیکھنا ہے۔ مجھے ایک دفعہ پھر وائٹ پیلس کی تیسری منزل کی بالکونی میں کھڑے ہو کر افق ارسلان کا گیت سننا ہے۔ وہ گیت جس میں جامنی پہاڑوں پر جمی برف اور اناطولیہ کی گلیوں کا ذکر تھا۔ وہ گیت جس میں بچھڑنے اور وعدہ نبھانے کا ذکر تھا۔ مجھے وہ گیت پھر سناؤ افق!...... پلیز اٹھو!...... میں اب تم سے کوئی وعدہ، کوئی عہد نہیں لوں گی...... اب میں تمہیں یہاں سے نہیں جانے دوں گی۔ تمہیں اپنے اس عشق کا واسطہ جس کا اظہار تم نے کبھی نہیں کیا۔ اٹھ جاؤ۔"

اس کی پلکوں سے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر چہرے پر پھسلنے لگے تھے۔ وہ آکسیجن ماسک سے سانس لے رہا تھا۔ اس کے تنفس کی آواز تک سنائی نہیں دے رہی تھی۔ آنکھیں ہنوز بند تھیں۔ سامنے رکھی ای سی جی مشین پر لکیریں اشو کے پانی کی طرح مچلتی، اچھلتی، ڈوبتی اور پھر ابھرتی دکھائی دے رہی تھیں۔

وہ ان لکیروں کو دیکھتی رہی۔ وہ اب اسے پہاڑوں کی طرح لگ رہی تھیں۔ ان ظالم پہاڑوں کی طرح جو افق کی ماں کے بیٹے واپس نہیں لوٹاتے تھے۔ قراقرم اور ہمالیہ کے پہاڑ...... کچھ چھوٹے تھے اور کچھ بڑے تھے، کچھ وحشی اور کچھ قاتل، کوئی خونی اور کوئی ملکہ۔ وہ سب ایک جیسے تھے۔ ظالم اور خوب صورت۔ بہت ظالم اور بہت خوب صورت۔

"کیا بگاڑا تھا اس نے تمہارا؟ تم بہت ظالم ہو۔ تم سب بہت ظالم ہو، انسانی خون کا خراج لیتے ہو۔ بہادر خون کا خراج۔"

اس کے اردگرد برف گر رہی تھی اور وہ دور تک پھیلے پہاڑی سلسلے پر نظریں جمائے بیٹھی تھی۔

ئی اس کے سامنے لیٹا تھا اور وہ اسے کہہ رہی تھی، "افق! سونا نہیں ہے۔ خدا کے لیے سونا نہیں ہے ۔بھی نہیں جاگو گے۔ اٹھو! بس ایک دفعہ اپنی پری کو دیکھ لو۔ وہ آتے ہی ہوں گے...... بس وہ بھی آجائیں گے۔ ہمیں ایک اور سفید رات نہیں گزارنی پڑے گی۔"

ماضی، حال سب آپس میں گڈمڈ ہو رہا تھا۔ قراقرم کے پہاڑ، اونچے نیچے سفید لکیروں کے پہاڑ اس پر ہنس رہے تھے۔ اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ ہر گزرتے پل وہ چھوٹے ہوتے جا رہے تھے۔ زمین میں دفن ہو رہے تھے اور آخر میں وہ یوں ہو گئے جیسے شاہراہ قراقرم برابر...... سب برابر تھا۔

"افق اٹھو...... خدا کے لیے اٹھو...... یہ اٹھتا کیوں نہیں ہے؟ یہ بولتا کیوں نہیں ہے؟ اسے اٹھاؤ۔ خدارا! کوئی اسے اٹھائے۔ میں نے راتوں کو جاگ کر خدا سے اس کی خیریت مانگی ہے اور...... اور یہ بولتا نہیں ہے؟ آنکھیں نہیں کھولتا۔ کیوں نہیں کھولتا؟" وہ اس کو شانوں سے پکڑ کر جھنجھوڑنے لگی، اسے اٹھانے، جگانے کی کوشش کرنے لگی۔ کسی نے پیچھے سے اس کا بازو پکڑ کر روکنا چاہا۔

"ایسے مت کرو پریشے!"

"اسے اٹھائیں ڈاکٹر واسطی! یہ اٹھ کیوں نہیں رہا؟ اسے کہیں، سونا نہیں ہے۔ وہ آتے ہی ہوں گے۔ میں نے ہیلی کاپٹر دیکھا ہے۔ مجھے آواز آرہی ہے۔ سٹورم (طوفان) ختم ہو چکا ہے۔ آج آسمان صاف ہے۔ یہ اٹھ کیوں نہیں رہا؟ اسے اٹھائیں، ورنہ میرا دل پھٹ جائے گا۔" وہ رونے لگی تھی، ساتھ ساتھ اسے جھنجھوڑ بھی رہی تھی۔

"مت کرو پریشے! اسے مت ہلاؤ۔ وہ مر جائے گا۔" کوئی اسے کہہ رہا تھا۔

"وہ نہیں مرے گا۔ وہ نہیں مر سکتا۔ میں نے اپنے حصے کا گرم پانی اسے دیا تھا۔ میں نے اسے دیکھنے کے لیے کئی دن برف میں پیدل سفر کیا تھا۔ سرد راتیں کاٹی تھیں، مگر اسے گرم میں سلایا تھا۔ بارہ گھنٹے برفانی طوفان میں اس مرتے ہوئے آدمی کو اپنی کمر پر اٹھا کر نیچے لائی تھی۔ پھر بھی آپ کہتے ہیں یہ مر جائے گا؟ اللہ اتنا ظالم نہیں ہے۔ وہ اسے کیوں مارے گا؟ اس نے کیا بگاڑا تھا کسی کا؟ وہ نہیں مر سکتا۔ افق نہیں مر سکتا۔ اسے اٹھاؤ، خدارا! کوئی اسے اٹھائے اور کہے کہ میری بات کا جواب دے...... وہ نہیں مر سکتا...... میں نے خون لا کر دیے دیا تھا اسے...... پھر...... پھر کیوں مرے گا وہ؟"

وہ زمین پر گھٹنوں کے بل گر کر، اس کا ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں تھامے پھوٹ پھوٹ کر

رو دی تھی۔

وہ ایک دفعہ پہلے ہسپتال کے کمرے میں جاگی تھی تو اکیلی تھی۔

آج پھر زندگی اسی موڑ پر آ گئی تھی۔ وہ پھر سے ہسپتال کے کمرے میں تھی، وہ پھر سے اکیلی ہونے جا رہی تھی۔ وہ اس کو چھوڑ کر جا رہا تھا، بستر پر لیٹا شخص مر رہا تھا اور وہ اس کے لیے کچھ نہیں کر سکتی تھی۔

روتے روتے اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ بہت سے لوگ افق پر جھکے ہوئے تھے۔ کوئی اسے کمرے سے جانے کو کہہ رہا تھا مگر وہ اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔

''افق......! تمہیں کچھ نہیں ہوگا...... پلیز آنکھیں کھولو...... مجھے چھوڑ کر مت جانا۔ میں مر جاؤں گی۔''

وہ پھر سے اس کے سرہانے کھڑی ہو گئی۔ وہ ابھی تک آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔

''ڈاکٹر واسطی...... سر! یہ بچ جائے گا ناں؟ اسے کچھ نہیں ہوگا ناں؟'' آنسوؤں سے اس کا پورا چہرہ بھیگ چکا تھا، وہ بکھری بکھری سی، روتے ہوئے ڈاکٹر واسطی سے پوچھ رہی تھی۔

''شاید'' کسی ڈاکٹر نے کہا۔ وہ پُر یقین نہیں تھے۔ وہ پرامید بھی نہیں تھے۔

''افق!'' وہ اس کے چہرے پر جھکی، ''افق! آنکھیں کھولو پلیز افق!'' وہ اسے پکار رہی تھی، مگر وہ آنکھیں نہیں کھول رہا تھا۔ ای سی جی مشین پر ابھی سیدھی لکیر نہیں آئی تھی۔

''افق......! تمہیں تمہارے عشق کا واسطہ ہے، آنکھیں کھول دو......'' وہ آہستہ سے، شاید دل میں ہی کہہ رہی تھی، مگر اسے لگا اب افق نے سن لیا ہے۔

بہت آہستہ سے اس نے ایک لمحے کو آنکھیں کھولیں۔ وہ نیم غنودگی کے عالم میں تھا۔ اس کی ادھ کھلی آنکھوں میں کوئی جذبہ، کوئی تاثر، کچھ نہ تھا۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

''یہ پھر سے کیوں بے ہوش ہو گیا ہے؟'' اس نے بے اختیار اس کا چہرہ تھپتھپایا، مگر اس میں کوئی جنبش نہ ہوئی۔ ''یہ...... یہ آنکھیں کیوں نہیں کھول رہا؟''

''ریلیکس پریشے...... اب وہ خطرے سے باہر ہے۔''

پتا نہیں کس نے کہا تھا وہ تو بس اس کی بند آنکھوں کو خوف زدہ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

''اسے اٹھائیں...... اسے کہیں، یہ آنکھیں کھولے۔''

''پریشے! اب وہ ٹھیک ہے۔ وہ سو رہا ہے۔'' ڈاکٹر واسطی نے اسے شانوں سے پکڑ کر افق

کے قریب سے ہٹانا چاہا۔

''وہ سو رہا ہے؟ اس نے بے یقینی سے دہرایا۔ ''وہ...... وہ بچ جائے گا ناں؟''

''ہاں، وہ بچ جائے گا۔ تم باہر جا کر بیٹھو۔''

مگر وہ پھر بھی اس کے سرہانے کھڑی رہی۔ اس نے ابھی تک افق کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ وہ اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتی تھی۔ بس وہ خوف زدہ نگاہوں سے ای سی جی مشین پر ابھرتے، ڈوبتے پہاڑوں کو دیکھتی رہی۔ وہ اب ٹھیک سے چل رہے تھے۔ اب انہیں سیدھی لکیر نہیں بننا تھا۔

ایک سکون سا اس کے رگ و پے میں اترنے لگا۔

اس کا افق زندہ تھا، وہ اسے چھوڑ کر کہیں نہیں گیا تھا، وہ اس کے قریب ہی تھا۔ وہ اس کا ہاتھ چھوڑ کر نڈھال سی وہیں فرش پر گھٹنوں کے بل گر گئی۔ وہ کتنی دیر افق کے سرہانے روتی رہی تھی؟ اسے وقت گزرنے کا پتا بھی نہیں چلا تھا۔

اور تب اس نے ڈاکٹرز کو دیکھا، وہ افق کا بایاں پاؤں کاٹ رہے تھے۔

''یہ...... کیا......؟'' وہ سانس نہیں لے سکی۔

اس کا بایاں پاؤں بری طرح کچلا گیا تھا اور وہ سب اسے بہت آرام سے کاٹ رہے تھے۔ وہ ان کے ہاتھ روکنا چاہتی تھی، ان کی منت کرنا چاہتی تھی کہ خدارا، وہ افق کا پاؤں نہ کاٹیں، اگر اس کا پاؤں کٹ گیا تو وہ گھوڑا کیسے دوڑائے گا؟ پہاڑوں پر کیسے چڑھے گا؟ کوہ پیماؤں کو اپنے انہی قدموں پر ہی تو ناز ہوتا ہے اور وہ سفاک ڈاکٹرز، افق ارسلان سے اس کے قدم چھین رہے تھے۔

''نہیں، خدا کے لیے ایسا نہ کرو، وہ اپنا ادھورا وجود دیکھ کر مر جائے گا۔'' وہ انہیں روکنا چاہتی تھی مگر روک نہیں سکی۔

باہر صبح طلوع ہو رہی تھی، چڑیوں نے مدھر نغمے گانا شروع کر دیئے تھے۔ وہ طویل سیاہ خوف ناک رات اب ختم ہو چکی تھی۔ ایک لمبی مسافت اپنے اختتام کو پہنچ گئی تھی۔

ڈاکٹرز کافی دیر ہوئی وہاں سے جا چکے تھے۔ افق اب ٹھیک تھا۔ اس کو آکسیجن ابھی تک لگی ہوئی تھی، لیکن اب خطرے والی کوئی بات نہیں تھی۔

وہ اٹھ کر اس کے بستر پر بیٹھ گئی۔

وہ پرسکون سا سو رہا تھا، اس بات سے بے خبر کہ اس کا پاؤں کٹ چکا تھا۔

پریشے نے تھکی تھکی مسکراہٹ کے ساتھ اس کا چہرہ دیکھا اور پھر بے اختیار اس کے ماتھے، اس

کے بالوں کو چھوا۔ وہ اس کی موجودگی کا یقین کرنا چاہتی تھی اور اب اسے یقین آچکا تھا۔

"میں اب تمہیں کبھی ہمالیہ اور قراقرم کے پہاڑوں میں نہیں جانے دوں گی۔ میں دنیا کے بہترین ہسپتالوں میں تمہارا علاج کراؤں گی، ایک دن تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گے۔ پھر ہم ترکی چلے جائیں گے اور ایک نئی زندگی شروع کریں گے۔ ہمیں اب زندگی بھر ان ظالم پہاڑوں کی شکل نہیں دیکھنی۔ ان پہاڑوں نے احمت کو، ارسہ کو اور جینیک کو ہم سے چھین لیا ہے، اب ہم ان میں کبھی واپس نہیں آئیں گے۔ مجھے ہمالیہ کی عظیم چوٹیوں کی قسم ہے، میں تمہیں پھر کبھی ادھر واپس نہیں آنے دوں گی۔"

اس نے افق کی ایک طرف رکھی جیکٹ کی جیب سے وہ نیلا اور سبز دو رنگا پتھر نکالا، جس کے درمیان میں لکیر پڑی تھی۔ وہ اس پتھر کو دیکھ کر اداسی سے مسکرا دی۔ اسے بہت کچھ یاد آگیا تھا۔

وہ جانتی تھی وہ اب کبھی گھوڑا نہیں دوڑا سکے گا، وہ اب کبھی پہاڑوں کا سفر نہیں کر سکے گا لیکن پھر بھی وہ خوش تھی، وہ پرسکون تھی۔

اس کی زندگی کا سیاہ باب ختم ہو چکا تھا۔ اب اسے ایک نئی زندگی کی شروعات کرنی تھیں۔

اس نے نرمی سے افق کے ماتھے پر آئے بھورے بال ہٹائے۔

قراقرم کی پری کو بالآخر اس کا کوہ پیما مل ہی گیا تھا۔

☆......☆......☆

جمعہ، 30 جون 2006ء

خوب صورتی سے آراستہ کمرہ مہمانوں سے بھرا تھا۔ یہ ہال نما کمرہ ایوانِ صدر میں اسی نوعیت کی تقاریب کے انعقاد کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس وقت بھی وہاں آٹھ اکتوبر کے زلزلے میں نمایاں خدمات انجام دینے والوں کے لیے تقسیم اعزازات کی ایک صدارتی تقریب منعقد تھی۔

تمام کرسیاں نیم دائروی شکل میں بچھائی گئی تھیں۔ سامنے ایک پلیٹ فارم سا بنا تھا، جس پر صدر صاحب کھڑے تھے۔ ایک طرف ڈائس رکھا تھا، جس کے پیچھے موجود کمپیئر باری باری مائیک پر اعزازات وصول کرنے والوں کے نام پکار رہا تھا۔

نیم دائرے میں موجود کرسیوں کے دو سٹینڈ تھے۔ دائیں طرف والا سٹینڈ مقامی سول و فوجی افسران اور لوگوں سے بھرا تھا جب کہ بائیں طرف تمام غیر ملکی بیٹھے تھے۔ ان میں اقوام متحدہ، امریکا، یورپ، چین اور اسلامی ممالک سے تعلق رکھنے والے وہ تمام رضا کار شامل تھے، جنہوں نے

شہر کے زلزلہ زدگان کے لیے دن رات کام کیا تھا۔

بائیں طرف کی کرسیوں کی دوسری قطار میں بیٹھے تمام افراد سوائے ایک کے خوب صورت نقوش والے ترک تھے، جو آج بطورِ خاص حکومتِ پاکستان کی دعوت پر اسلام آباد آئے تھے۔

ان میں عروہ یلیم بھی تھی۔ گلابی رخسار اور شہد رنگ بالوں والی بہت پیاری سی سات سالہ بچی، جو اپنے والدین اور چھوٹی بہن کے درمیان پرجوش و آسودہ سی بیٹھی تھی۔ اس کے اور اس کی چھوٹی بہن کے ہاتھوں میں ایک ایک جھنڈی تھی، جس کے ایک طرف پاکستان کا سبز اور دوسری جانب ترکی کا سرخ پرچم بنا تھا۔ سر پر اسکارف اوڑھے عروہ کی ماں کے ہاتھ میں تین سو ڈالر کا وہ چیک تھا، جو ابھی کچھ دیر پہلے صدر پاکستان نے اسٹیج پر عروہ کو بلا کر "جیوے پاکستان" سننے کے بعد اسے ذاتی طور پر تحفے میں دیا تھا۔

دوسری قطار میں بیٹھے افراد میں اور ہن یقین اور ان کی اہلیہ بھی تھیں۔ مسز یقین کی گود میں دھرے خوب صورت کیس میں جینیک یقین کے لیے حکومتِ پاکستان کی طرف سے "ستارۂ ایثار" موجود تھا۔ وہ بار بار آنکھوں میں امڈ کر آتے آنسو پونچھتی تھیں۔

مسز یقین کے بائیں جانب سیاہ بالوں کا فرنچ ناٹ بنائے سنہری رنگت اور دراز قد کی حامل سلمیٰ دوران تھی، جو مسلسل ضبط سے لب کاٹتی، پلک جھپکائے بغیر سامنے صدر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی، جسے بار بار وہ اپنے اندر اتار لیتی تھی۔

سلمیٰ کے پہلو میں سیاہ ڈنر جیکٹ، سفید شرٹ اور سیاہ پینٹ میں ملبوس بے تاثر نگاہوں سے سامنے دیکھتا افق ارسلان بیٹھا تھا، اس کے ساتھ پریشے تھی جو اس قطار میں واحد غیر ترک تھی۔

آفٹر شاک کے اس حادثے میں افق کا بایاں پاؤں بری طرح کچلا گیا تھا، جو پھر مجبوراً ڈاکٹروں کو کاٹنا پڑا تھا۔ وہ دو مہینے اسلام آباد میں ہسپتال میں داخل رہا تھا۔ پھر پریشے اسے علاج کے لیے امریکا لے گئی تھی۔ مسئلہ صرف مصنوعی پاؤں لگانے کا نہیں تھا، مسئلہ افق کی ذہنی حالت کا تھا جو احمت اور جینیک کو کھو دینے کے بعد بہت بگڑ گئی تھی۔ جب وہ ہسپتال میں جاگا اور اسے احمت اور جینیک کی موت کا علم ہوا تو پہلی بار پریشے نے اس اونچے لمبے مرد کو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر روتے دیکھا تھا۔

اس کی ذہنی حالت کی بحالی کے لیے پریشے کو بہت محنت کرنا پڑی تھی۔ وہ دن رات اس کے ساتھ رہ کر، اسے زندگی کی طرف واپس لائی تھی۔ پھر انہوں نے افق کو جدید طرز کا پروستھیٹک پیر لگا

دیا تھا۔ شروع میں اسے چلنے میں دقت ہوتی تھی مگر ان گزرے چھے ماہ میں وہ اس کا بہت عادی ہو چکا تھا۔ معمولی سی لنگڑاہٹ اس کی ٹانگ میں ابھی تک موجود تھی، مگر وہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ کم ہوتی جا رہی تھی۔ آج نہیں تو آج سے ایک سال بعد ہی سہی، اسے یقین تھا کہ وہ ویسے ہی چلنے لگے گا، جیسے پہلے چلتا تھا۔ ہاں وہ جانتی تھی کہ وہ دونوں اب کبھی قراقرم میں نہیں جائیں گے۔

پانچ ماہ پہلے جب وہ اس کے ساتھ شادی کر کے اسے اپنے ہمراہ ترکی لے گیا تھا تب دونوں نے ایک وعدہ کیا تھا اور یہ وعدہ لینے والا افق خود تھا۔

''پری! ہم آج ایک نئی زندگی شروع کرنے جا رہے ہیں۔ آج کے بعد ہم کبھی قراقرم میں واپس نہیں جائیں گے۔ مجھے اب ان پہاڑوں کو کبھی نہیں دیکھنا، جنہوں نے مجھ سے میرے بہترین دوست چھین لیے۔''

اور پھر اس نے افق ارسلان کے ترکی میں ایک نئی زندگی کی بنیاد رکھی تھی۔ اب وہ محض ایک جیولوجیکل انجینئر تھا اور دنیا کے بہت سے نارمل لوگوں کی طرح نائن ٹو فائیو جاب کرتا تھا، پہاڑوں سے وہ دونوں اس حد تک خائف تھے کہ وہ تو ماؤنٹ ارارت دیکھنے بھی نہیں گئے تھے۔ یہ شاید پہلی دفعہ تھا، جب افق نے سیاحت اور کوہ پیمائی ترک کر کے مسلسل پانچ مہینے لگاتار آفس جا کر زندگی کو انقرہ کی گلیوں تک محدود کر دیا تھا۔ وہ دونوں کوہ پیما نہیں، بلکہ ڈاکٹر اور انجینئر بن کر اس محدود زندگی میں بھی خوش تھے۔ انہیں اب کسی اور شے کی تمنا نہیں تھی۔ افق کی شدتوں بھری محبت اس کے لیے کافی تھی۔

ہاں بس پچھلے پانچ ماہ میں ایک بے کلی سی، ایک نارسائی سی اس کے وجود سے چھلکتی تھی۔ کہیں کوئی تشنگی رہ گئی تھی، وہ بہت غور بھی کرتی تو بظاہر سب کچھ ٹھیک تھا۔ سیف اور پھپھو لوگوں نے شروع میں بہت شور مچایا، مگر پریشے نے سیف کے خون نہ دینے کی بات کو ایشو بنا کر منگنی توڑ دی تھی۔ ان لوگوں نے باتیں بھی بہت بنائیں، مگر اسے پروا نہ تھی۔ وہ پاپا کے تمام اثاثوں کا نگران ماموں کو بنا کر ترکی چلی آئی تھی۔ اب تو سب کچھ ٹھیک تھا۔ نشاء کی بھی شادی ہو چکی تھی، حسیب اور اس کا وہ دوست مزید تعلیم کے لیے لندن جا چکے تھے۔ ہاں سب کچھ ٹھیک ہی تو تھا، پھر بھی اسے لگتا کہ کہیں کچھ نامکمل، کچھ ادھورا سا ہے۔

اپنی سوچوں کو ذہن سے جھٹک کر اس نے ساتھ بیٹھے افق کے بائیں جوتے پر نگاہ ڈالی۔ اصل حقیقت سے لاعلم کوئی شخص اس کا جوتا دیکھنے پر سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ اندر موجود پاؤں مصنوعی ہے۔ پریشے نے جوتے سے نگاہیں ہٹا کر اس کے خاموش چہرے کو دیکھا۔

وہ ابھی تک سامنے دیکھ رہا تھا۔ وہ اس کی شہد رنگ آنکھوں میں جھلملاتی پرانے دنوں کی یادیں پڑھ سکتی تھی، وہ سنہرے پرانے دن، جب وہ تینوں انقرہ کی گلیوں میں بارش میں بھیگا کرتے تھے۔ جب تینوں کلاس ٹیسٹ میں نقل کرتے پکڑے جاتے اور ٹیچر احمت کی معصوم شکل اور بھول پن کے باعث اسے چھوڑ دیا کرتی تھی اور افق اور جینیک کو سزا ملتی۔ بعد میں وہ اس سے خوب لڑتے اور وہ دن جب افق اور جینیک نے اپنا بھانڈا پھوڑنے پر احمت کو یخ پانی سے بھرے تالاب میں پھینک دیا تھا۔ وہ ٹھنڈے پانی میں ہاتھ پاؤں مارتا، چیخ رہا تھا، انہیں گالیاں دے رہا تھا اور وہ دونوں کھڑے ہنس رہے تھے اور پھر ہنستے ہنستے افق نے جینیک کو بھی اندر دھکا دے دیا تھا۔ تب وہ دونوں پول کے اندر تھے اور وہ باہر ہنستے ہوئے اکیلا کھڑا تھا۔

آج پھر وہ اکیلا تھا۔

احمت نہیں تھا۔

جینیک نہیں تھا۔

زندگی کے ہر سفر میں وہ اور جینیک اکٹھے جاتے تھے۔ پہلی دفعہ جینیک اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

روسٹرم پر کھڑا کمپیئر احمت دوران کی بیوہ کو بلا رہا تھا۔

سلمٰی بہت آہستگی سے اٹھی اور چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی دو فٹ اونچے پلیٹ فارم پر کھڑے صدر تک آئی اور احمت کا ''ستارۂ ایثار بعد از شہادت'' وصول کیا، پھر آنکھیں رگڑتی بمشکل خود پر ضبط کرتی واپس آئی۔

پھر افق حسین ارسلان کا نام پکارا گیا۔

وہ اپنی نشست سے اٹھا اور آہستہ سے چلتا ہوا اوپر سٹیج تک آیا۔ سیاہ سوٹ میں ملبوس وہ بہت اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے صدر سے ہاتھ ملایا۔ صدر نے چند تعریف کلمات کہتے ہوئے اس کے پاؤں کی طرف اشارہ کیا۔ افق نے سر جھکا کر اپنے بائیں پاؤں کو دیکھا، ہال میں موجود تمام مہمانوں کی نگاہیں اس کے قدموں میں جھک گئیں۔

افق نے بایاں پاؤں ہلکا سا اوپر کیا، پھر واپس زمین پر رکھتے ہوئے شانے اچکا دیئے، جیسے کہہ رہا ہو ''میں کیا کر سکتا ہوں؟'' اس کے چہرے پر بے حد اداس مسکراہٹ رقصاں تھی۔

پورا ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ صدر افق کے کوٹ پر ستارۂ ایثار لگا رہے تھے اور تمام سامعین

وحاضرین اپنی نشستوں سے کھڑے ہوکر ایک بہادر ترک کے لیے تالیاں بجارہے تھے۔ ان تالیاں بجانے والوں میں پریشے جہاں زیب بھی تھی، جو آنکھوں میں نمی لیے بہت فخر سے افق کو دیکھ رہی تھی۔

''ہم مظفر آباد جارہے ہیں۔'' سہ پہر میں جب مری میں اس بل کھاتی سڑک پر آگے پیچھے چلتے ہوئے اپنے ریسٹ ہاؤس کی جانب جارہے تھے، جہاں وہ سرکاری مہمان کے طور پر مقیم تھے، عروہ نے اپنی زبان میں سلمٰی کو بتایا اور آگے بھاگ گئی۔

ریسٹ ہاؤس پہاڑ کی چوٹی پر تھا، اس تک جاتی سڑک دیکھتے ہی دیکھتے بلند ہوجاتی۔ یہاں تک کہ ریسٹ ہاؤس کی خوب صورت عمارت تک پہنچ جاتی۔ پریشے کو سلمٰی کے ساتھ اس پتھریلی سڑک پر چلتے ہوئے بے اختیار مری کی وہ سڑک یاد آئی جو اس سے بے حد مشابہت رکھتی تھی۔

''میں آرہی ہوں۔'' سلمٰی نے بھاگتی عروہ کو بلند آواز میں کہا۔ عروہ اب دوڑتے ہوئے افق سے بھی آگے نکل چکی تھی، جو ان دونوں سے کافی اوپر ڈھلان پر سر جھکائے جیبوں میں ہاتھ ڈالے چڑھ رہا تھا۔

''تم مظفر آباد جارہی ہو؟'' دونوں خاموشی سے چھوٹے چھوٹے قدموں سے اوپر چڑھ رہی تھیں، جب پریشے نے اداسی سے پوچھا۔ یہ بارش سے چند منٹ پہلے کا موسم تھا، جو اسے ہمیشہ اداس کردیا کرتا تھا۔

سلمٰی نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''مسٹر اینڈ مسز اورہن یقین اور عروہ کی فیملی مع ایک ترک مترجم اور ترک سفیر کے، مظفر آباد جارہے ہیں۔ تمہارے سرکاری ٹی وی کا عملہ بھی ہوگا۔ وہ ستارۂ ایثار حاصل کرنے والے ترکوں پر ڈاکومنٹری بنارہے ہیں جو آج شاید تمہارے سرکاری ٹی وی سے دکھائی جائے گی۔''

وہ دونوں سڑک کے کنارے سفید پتھروں کی باڑ کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ افق ان سے کافی آگے، سڑک کے بلند ترین مقام پر کھڑا ہوگیا تھا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ سر اٹھا کر اوپر سیاہ بادلوں سے ڈھکے آسمان کو دیکھ رہا تھا۔

''لگتا ہے بارش ہونے والی ہے۔'' الفاظ اس کے لبوں میں ہی تھے کہ بادلوں نے برسنا شروع کردیا۔

سلمٰی نے ہاتھ میں پکڑی گلابی چھتری کھول دی۔ پریشے رم جھم سے بچنے کو چھتری تلے سمٹ آئی۔

''تم آؤ گی مظفر آباد؟'' دونوں تیز ہوتی بوندا باندی میں اوپر چڑھ رہی تھیں۔

''اونہوں۔''

''کیوں؟'' سلمٰی یونہی بیچ سڑک میں رک کر اسے دیکھنے لگی۔ چھتری اس نے پکڑ رکھی تھی، پریشے بارش کے باعث اس کے اور قریب کھسک آئی۔

''میں پہاڑوں میں واپس نہیں جانا چاہتی۔''

''اور...... افق؟'' سلمٰی نے کہتے ہوئے گردن گھما کر سڑک کی بلندی پر دیکھا، جہاں وہ اسی طرح کھڑا بارش میں بھیگ رہا تھا۔

''وہ بھی واپس نہیں جانا چاہتا۔''

سلمٰی نے سمجھنے والے انداز میں سر ہلا دیا۔ ''تم ٹھیک کہتی ہو۔ ہم سب اپنی زندگیوں کی بہت بڑے نقصانات سے گزر چکے ہیں۔'' پھر وہ اضطراری انداز میں لب کچلنے لگی۔

''جانتی ہو پری! یہ سب مظفر آباد کیوں جارہے ہیں؟ یہ سب نیلم سٹیڈیم میں آرمی کے کیمپ کا وہ آخری خیمہ دیکھنا چاہتے ہیں، جہاں احمت اور جیئیک نے اپنی آخری رات گزاری تھی مگر میں...... میں مظفر آباد کی فضاؤں اور نیلم کے پانی سے پوچھنا چاہتی ہوں کہ ہم سے بچھڑنے سے قبل وہ کیسا لگ رہا تھا؟ میں اس بچی کی قبر دیکھنا چاہتی ہوں جس کی لاش نکالتے ہوئے احمت خود لاش بن گیا۔ میں اس خیمے کی مٹی پر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر رونا چاہتی ہوں، مجھے اس سرخ مٹی اور نیلم کے پانی میں اپنے آنسو گرانے ہیں۔'' چھتری ابھی تک ان کے سروں پر تنی تھی، مگر سلمٰی کا چہرہ بھیگ چکا تھا۔

''افق، جیئیک، کینن سمیت احمت کو جاننے والا ہر شخص یہ کہا کرتا تھا کہ وہ صرف شکل سے معصوم لگتا ہے اور اندر سے بہت خبیث ہے، مگر میں تمہیں بتاؤں پریشے میں نے اس کے ساتھ آٹھ سال گزارے ہیں، وہ...... وہ شخص اندر سے بھی بچوں کی طرح معصوم تھا۔'' وہ چہرہ ہاتھوں میں چھپا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ چھتری اس کے ہاتھ سے پھسلنے لگی، پریشے نے فوراً چھتری پکڑ لی۔

''میں چلتی ہوں۔'' کچھ دیر بعد اس نے بھیگا چہرہ صاف کیا۔ ''مجھے ایک آخری بار ہمالیہ کے آسمان تلے رونا ہے، ان تمام دوستوں کے لیے جو چوٹیوں سے لوٹ کر نہیں آئے۔ احمت دوران کے لیے...... ارسہ بخاری کے لیے...... جیئیک یقین کے لیے۔''

''آج آخری دفعہ رولو، پھر ہم ان ظالم پہاڑوں میں کبھی نہیں آئیں گے۔ آج شام ہم اپنا

ماضی یہاں دفن کر کے جائیں گے۔"

سلمیٰ کے لبوں پر زخمی مسکراہٹ بکھر گئی۔ "میں کوشش کروں گی۔" پھر وہ گردن گھما کر دور کھڑے افق کو دیکھنے لگی، جس کا سیاہ کوٹ مکمل طور پر بھیگ چکا تھا۔

"افق!" سلمیٰ نے پکارا۔ بارش تیز ہوگئی تھی۔ ہوائیں زور سے چل رہی تھیں۔ آواز اوپر تک نہیں گئی۔

"افق!" سلمیٰ نے پھر آواز دی۔

افق نے گردن ترچھی کر کے نیچے ان دونوں کو دیکھا، پھر جیبوں میں ہاتھ ڈالے ڈھلان سے اترنے لگا۔

"تم بارش میں کیوں بھیگ رہے تھے؟ چلو چھتری کے نیچے آؤ۔" وہ مکمل طور پر بھیگ چکا تھا، بھورے بال ماتھے پر چپکے تھے۔ سلمیٰ کی بات پر وہ ہولے سے مسکرا کر چھتری تلے آیا اور وہ پریشے کے ہاتھ سے لے لی۔

"میں چلتی ہوں۔" سلمیٰ چھتری کے نیچے سے نکل کر برستی بارش میں اوپر سڑک پر چڑھنے لگی۔

وہ دونوں چھتری تلے کھڑے خاموشی سے موسلادھار بارش میں اسے اوپر جاتے دیکھتے رہے۔ جب وہ نگاہوں سے اوجھل ہوگئی تو افق نے چہرہ اس کی طرف کیا۔

"اب تم بیس سال بعد اپنے سفرنامے میں یہ لکھ سکتے ہو کہ جب تم اسلامی دنیا کے سب سے طاقتور ملک گئے تو اس کے "پادشاہ" نے تمہاری خوب آؤ بھگت کی۔ وغیرہ وغیرہ۔"

وہ دھیرے سے مسکرایا اور گردن گھما کر دور دور تک پھیلی مارگلہ کی پہاڑیوں کو دیکھنے لگا۔ پریشے نے اس کی نگاہوں کے تعاقب میں ان پہاڑی سلسلوں کو دیکھا۔ ان تمام پہاڑوں سے دور، بہت دور، ہمالیہ، ہندوکش اور قراقرم کے پہاڑ شروع ہوتے تھے۔ وہ انہیں وہاں سے نظر نہ آنے کے باوجود دیکھ سکتی تھی۔ وہ ان میں پھیلی دلکش وادیوں کو بھی دیکھ سکتی تھی، جہاں وائٹ پیلس کی سیڑھیوں کے ساتھ نصب پنجرے میں مقید وہ موروں کا جوڑا اس ترک گیت کو یاد کرتا تھا، جو کبھی ایک شہد رنگ آنکھوں والا سیاح انہیں سنایا کرتا تھا۔ ماہوڈھنڈ کے کنارے اگا سبزہ زار آج بھی اس گھوڑے کو یاد کرتا تھا، جس سے کبھی قراقرم کی ایک پری اتری تھی۔

وہاں دور دور تک پھیلے پہاڑ تھے۔ پراسرار سیاہ پہاڑ، جو اپنے ظالم چہروں پر سفید چادر کی نقاب مارے اپنے اندر ڈھیروں راز دفن کیے بہت تمکنت سے کئی صدیوں سے زمین پر سر اٹھائے کھڑے

تھے۔ ان تمام پہاڑوں کے بیچ ایک ایسا پہاڑ بھی تھا، جس کی برف آج تک نہیں پگھلی تھی۔ وہ آج بھی بہت غرور سے، بہت تمسخر سے دنیا والوں کو دیکھ رہا تھا۔

لوگ اس پہاڑ کو کئی ناموں سے پکارتے تھے۔

راکاپوشی......

The shining wall

دُمانی۔

The mother of mist

پربتوں کی دیوی۔

قراقرم کا تاج محل

اس پہاڑ کا NW رِج آج تک ناقابلِ تسخیر تھا۔ اسے 2005ء کے بعد پھر کسی نے سر کرنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

اس نے گردن پھیر کر افق کو دیکھا۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھا۔

"افق حسین ارسلان، ستارۂ ایثار، آپ کیا سوچ رہے ہیں؟"

اس کے اندازِ تخاطب پر وہ دھیرے سے ہنس دیا۔

"مجھے کافی عرصے سے اپنی زندگی میں ایک ادھورا پن محسوس ہوتا تھا۔ آج مجھے اس ادھورے پن کا راز مل گیا ہے پری!" وہ دونوں ابھی تک تیز بارش میں چھتری تلے کھڑے تھے۔

"ابھی تم سلمیٰ کو کہہ رہی تھیں کہ ہم لوگ اب کبھی پہاڑوں میں نہیں جائیں گے۔" وہ کہتے کہتے رک گیا اور پریشے کو علم تھا کہ آگے وہ کیا کہنے والا تھا، وہ وہی کہنے والا تھا جس کا ادراک اس پر بھی بالکل ابھی ہوا تھا۔

"یاد ہے، میں نے تمہیں راکاپوشی پر، ایورسٹ کی چوٹی پر اترتی سنہری پریوں کا قصہ سنایا تھا اور شاید تم نے یقین نہیں کیا تھا، مگر میں تمہیں بتاؤں پری! ساگرماتا کی چوٹی پر واقعی سونے کی بنی پریاں اترتی ہیں۔ میں نے انہیں دیکھا ہے اور میں وہ تمہیں دیکھانا چاہتا ہوں۔ میں ایک دفعہ پھر ایورسٹ جانا چاہتا ہوں۔ میں نہیں جانتا میں اس دفعہ بچ کر آؤں گا یا نہیں مگر مجھے ایک دفعہ پھر چھومولنگما کی چوٹی پر کھڑے ہو کر نیپال اور تبت کو دیکھنا ہے۔ میں پھر سے پہاڑوں میں جانا چاہتا ہوں۔"

سرد ہوا کا تیز جھونکا چھتری اڑا کر لے گیا، مگر وہ چھتری کے پیچھے نہیں گئی۔ وہ اسی طرح بارش

میں بھیگتی بہت غور سے افق کو دیکھ رہی تھی۔

''مگر ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ہم کبھی قراقرم نہیں جائیں گے اور اچھے بچوں کی طرح گھر میں رہیں گے۔ہم نے وعدہ کیا تھا کہ ہم کوہ پیمائی چھوڑ دیں گے۔''

پریشے کی بات پر وہ مسکرا دیا۔شہد رنگ آنکھیں چھوٹی ہوگئیں۔اس نے ماتھے پر آئے گیلے بھورے بال پیچھے کیے اور اُسے دونوں شانوں سے تھام کر خود سے قریب کیا۔ پھر اسی طرح مسکراتے ہوئے بہت آہستہ آواز میں پچھلے کئی گھنٹوں سے سوچی جانے والی وہ بات اس سے کہی، جو بارش کے قطروں نے اور سیاہ بادلوں نے بھی سن لی تھی۔

''کیا کوہ پیمائی بھی کوئی چھوڑنے والی چیز ہے؟''

☆......☆......☆

ختم

پاکستانی پوائنٹ ڈاٹ کام